تاریخ اسلام

دور جاہلیت سے
وفات مرسل اعظم تک

مہدی پیشوائی

مجمع جہانی اہل البیت

یہ کتاب برقی شکل میں نشرہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

تاریخ اسلام

دور جاہلیت سے وفات مرسل اعظم ﷺ تک

مہدی پیشوائی

مترجم: کلب عابد خان سلطانپوری

مجمع جہانی اہل البیت

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرورکائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردئی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھاکر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت ﷺ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکرگزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اہل تشیع کے جلیل القدر عالم دین آقائے پیشوائی کی گرانقدر کتاب "تاریخ اسلام " فاضل جلیل عالیجناب مولانا کلب عابد خان سلطانپوری ہندی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکرگزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اس منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

عرض مترجم

عرصۂ دارازسے یہ خواہش تھی کہ ایک ایسی تاریخی کتاب کا ترجمہ کروں جو کسی حدتک کامل، معتبر، مستند اور مدلل ہو۔ جس میں واقعات کے تمام جزئیات کے حوالے درج ہوں۔ اور واقعات کا تجزیہ اور ان کی تحلیل نیز شبہات و اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کافی جستجو اور تحقیق کے بعد، مؤلف محترم جناب مہدی پیشوائی صاحب کی کتاب "تاریخ اسلام" میری نظروں سے گزری، کتاب کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوا کہ مجھے ایسی ہی کتاب کی تلاش تھی چنانچہ ابھی اسی فکر میں تھا کہ مجمع جہانی اہل البیت ؑ کی جانب سے اس کتاب کے ترجمہ کا کام میرے سپرد کیا گیا تو میں نے بخوشی قبول کرلیا مضامین و مقالات وغیرہ لکھنے کا شوق پہلے ہی سے تھا اور حقیر کے متعدد مضامین ادارۂ تنظیم المکاتب کے ماہانہ رسالہ میں شائع ہوچکے ہیں لیکن ترجمہ کے میدان میں یہ میری پہلی کاوش ہے۔ ترجمہ کیسا ہے یہ فیصلہ قارئین کے حوالہ ہے البتہ اتنا بہرحال طے ہے کہ ایک زبان کے جملہ مطالب کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ وہی حضرات لگاسکتے ہیں جنھوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ میری کوشش یہی تھی کہ کتاب کے جملہ مطالب ہمارے اردو زبان معاشرہ تک پہنچ جائیں اگرچہ بشریت کے ناطے ہر قسم کے کمال کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

امید ہے کہ میری یہ کوشش بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل کرے گی نیز حقیر اور اس کے تمام بزرگوں کے لئے ذخیرۂ آخرت قرار پائے گی۔

والسلام

احقر العباد: کلب عابد خان

مقدمۂ مولف

تمام تعریفیں اس ذات پروردگار کے لئے ہیں جس نے ہمیں اس کتاب کی نگارش کی توفیق عطا کی اور درود و سلام ہو عظیم الشان رسول، حضرت محمد مصطفی ﷺ اور اس کے برحق معصوم جانشینوں اور اصحاب پاک پر۔

قارئین کرام کی خدمت میں جو کتاب پیش کی جا رہی ہے یہ دس سال سے زیادہ عرصہ تک ملک کی اعلیٰ علمی درس گاہوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں نوٹس کی صورت میں تدریس کی جاچکی ہے۔ یہ کتاب، دقیق مطالعہ اور کلاس میں کئے گئے طرح طرح کے تاریخی سوالات کے جوابات میں، تاریخ اسلام سے برسوں کی واقفیت اور انسیت کے بعد تدوین و تالیف ہوئی ہے۔

اس کتاب کی تدوین و تالیف میں کچھ نکات کا لحاظ کیا گیا ہے جس کی طرف قارئین کرام، مخصوصاً طالب علموں اور اساتذہ کرام کی توجہ مبذول کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ کتاب کے پہلے حصہ کی فصلوں میں ظہور اسلام سے قبل، جزیرۃ العرب کے حالات کو بطور مفصل بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ اس دور کے حالات سے مکمل واقفیت کے بغیر اسلامی تاریخ کے بے شمار واقعات کا صحیح ادراک کرنا اور ان کا تحلیل و تجزیہ کرنا ناممکن ہے۔

اسلامی تاریخ میں بہت سے واقعات کا تعلق زمانۂ جاہلیت سے ہے لہٰذا ظہور اسلام کے بعد جزیرۃ العرب کے حالات کو سمجھنے کے لئے ظہور اسلام سے پہلے کے حالات سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی بنا پر ان واقعات کے صحیح ادراک اور ان کے ایک دوسرے سے مربوط ہونے اور ظہور اسلام کے بعد اس علاقہ میں آنے والی بنیادی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے اس باب کے مباحث کو کچھ تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اس کے برخلاف بعد کے ابواب میں ہماری سعی و کوشش رہی ہے کہ حتی الامکان اختصار سے کام لیا جائے۔

۲۔ زیادہ تر حوالے حاشیہ پر، اس لئے ذکر کردیئے گئے ہیں تاکہ اگر قاری محترم واقعات کی تفصیلات کو معلوم کرنا چاہے تو اس سے کم از کم بعض حوالہ جات کی طرف رسائی حاصل کرسکے اس کے علاوہ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ واقعات کی شہرت یا اس کا تواتر ثابت ہو جائے۔

۳۔ عام طور سے تاریخی واقعات کی تفصیلات اور اس کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں اس کے حوالے ذکر کئے جاتے ہیں جب کہ اصل میں وہ حوالے ان تمام تفصیلات اور جزئیات کے نہیں ہوتے ۔ ان حوالوں کو دیکھ کر قاری خیال کرتا ہے کہ اس کے زیر مطالعہ بحث کی تفصیلات تمام کتابوں میں موجود ہیں۔ جبکہ یہ طریقہ زیادہ دقیق اور درست نہیں ہے خاص طور سے اگر بعض تفصیلات بہت زیادہ اہم یا محل اختلاف ہوں۔

اس کتاب میں عام روش کے برخلاف ہر واقعہ کی تمام تفصیلات اور پہلوؤں کو بالکل الگ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جنگوں کی تفصیلات جیسے وقوع جنگ کا سبب، اس کی تاریخ، دونوں طرف کے سپاہیوں کی تعداد، جنگ کا طریقہ، طرفین کو پہنچنے والے نقصانات، مال غنیمت کی تقسیم کا طریقہ اور جنگ کے آثار و نتائج وغیرہ، جدا طریقہ سے ذکر ہوئے ہیں ان جزئیات کا مطالعہ کرنے سے قاری متوجہ ہو جاتا ہے کہ واقعات کا کون سا حصہ کس کتاب میں بیان ہوا ہے اور ضرورت کے وقت آسانی سے اس کتاب کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔ مولف کے عقیدہ کے مطابق اس روش کے اپنانے میں (کئی اہم اور لطیف فائدے ہیں) بہت زیادہ دقت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں مؤلف کو زیادہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔

٤۔ قرآنی شواہد اور حدیثی تائیدات پوری کتاب میں ذکر ہوئی ہیں البتہ ضرورت کے تحت (قرآن کریم کی آیات، روایات اور تاریخی متون کے خاص حصوں کو عربی متن کے طور پر حاشیہ پر تحریر کردیا گیا ہے اور اس کا ترجمہ اصل کتاب میں نقل کردیا گیا ہے تاکہ کتاب کے متن میں یکسانیت اور روانی باقی رہے اور جو حضرات عربی داں نہیں ہیں ان کے لئے ملال آور نہ ہو۔

۵۔ ضروری مقامات پر بحث کی مناسبت سے تجزیہ اور تحلیل کر کے شبہات کا واضح جواب دیا گیا ہے جبکہ بعض مقامات پر تفصیلی تجزیہ سے پرہیز کرتے ہوئے بہت سے موضوعات (جیسے جنگ فجار میں آنحضرت ﷺ کی شرکت اور آپ کے سینہ کا شگافتہ کرنا اور عبد المطلب کے نذر کی بحث) کو اس لئے نظر انداز کیا گیا ہے کہ کتاب کی تدریس صرف ۳۴ درسوں کی صورت میں ہونا طے پائی ہے لہٰذا اس کے لئے اس سے زیادہ ضخیم ہونا مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض مطالب تخصصی اور مہارتی پہلو رکھتے ہیں اور ان کے ذکر کا اپنا محل ہے۔ لہٰذا اصل موضوع کی طرف مختصر سے اشارہ کے بعد اس طرح کی بحثوں کے حوالے حاشیہ پر بیان کردیئے گئے ہیں تاکہ اس موضوع میں دلچسپی لینے والے حضرات ان کی طرف رجوع کر سکیں۔

۶۔ دوسرے درجے کے مطالب، اقوال کے اختلاف کی جگہیں، غیر ضروری گوشے اور تکمیلی و اضافی تفصیلات وغیرہ عام طور سے حاشیہ پر بیان کی گئیں ہیں۔ بہر حال کتاب کو دقیق، مستحکم اور مفید بنانے کے لئے، مطالب کے نقل میں دقت، ترجموں کی صحت، تجزیہ و تحلیل کی درستگی اور پھر ان کی نتیجہ گیری میں ہر ممکن کوشش اور زحمتیں اٹھائی گئیں ہیں۔ لیکن پھر بھی کتاب، نقص او راصلاح و تکمیل سے بے نیاز نہیں ہے۔ لہٰذا اساتذہ کرام اور طلاب محترم اور صاحبان نظر کی تنقید اور مشورے کتاب کی اصلاح اور تکمیل کی راہ میں مفید ثابت ہوں گے۔

خلوص اور وفاداری کا تقاضہ ہے کہ اپنے دیرینہ دوست، نامور خطیب، مایہ ناز قلم کار حجۃ الاسلام و المسلمین الحاج غلام رضا گل سرخی کاشانی مرحوم کا بھی تذکرہ کروں جن کے تعاون اور مدد سے اس کتاب کی تدوین کا ابتدائی کام انجام پایا ہے۔ لہٰذا اپنے اس مرحوم دوست کے لئے خداوند عالم کی بارگاہ میں رحمت اور بلندی درجات کا خواہاں ہوں۔ اور اسی طرح سے حجج اسلام الحاج شیخ علی اکبر ناصح اور فرج اللہ فرج الٰہی کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے کتاب کی تصحیح، ٹائپ اور مقدماتی مباحث کی تدوین اور تالیف میں ہمارا ہر طرح سے تعاون کیا۔

آخر میں درسی کتابوں کی تدوین اور تاریخ اسلام کے شعبہ کے سرپرست نیز اراک کی آزاد اسلامی یونیورسٹی کا بھی شکر گزار ہوں۔

والسلام

قم۔ مہدی پیشوائی

محرم الحرام ۱۴۲۴ ہجری قمری

پہلا حصہ

مقدماتی بحثیں

پہلی فصل : جزیرۃ العرب کی جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی صورتحال

دوسری فصل: عربوں کے صفات اور نفسیات

تیسری فصل: جزیرہ نمائے عرب اور اس کے اطراف کے ادیان و مذاہب

پہلی فصل

جزیرۃ العرب کی جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی صورتحال

جزیرہ نمائے عرب جس کو "جزیرۃ العرب" بھی کہتے ہیں یہ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے جو مغربی ایشیا کے جنوب میں واقع ہے۔

یہ جزیرہ مغربی شمال سے مشرقی جنوب تک "غیر متوازی چوکور" شکل میں ہے.[۱] اور اس کی مساحت تقریباً بتیس (۳۲) لاکھ مربع کلو میٹر ہے.[۲] اس جزیرہ نما کے تقریباً ٤٥ حصے میں اس وقت سعودی عرب واقع ہے.[۳] اور اس کا بقیہ حصہ دنیا کی موجودہ سیاسی تقسیم بندی کے اعتبار سے چھ ملکوں یعنی یمن، عمان، متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین اور کویت میں بٹا ہوا ہے۔

اس جزیرہ نما کی سرحد، جنوب کی سمت سے خلیج عدن، تنگۂ باب المندب، بحر ہند اور بحر عمان میں محدود ہے اور مغرب کی سمت میں یہ بحر احمر اور مشرق کی طرف خلیج عمان، خلیج فارس اور عراق تک پھیلا ہوا ہے اور شمال کی جانب سے ایک وسیع صحرا جو کہ درّۂ فرات سے سرزمین شام تک ہے اس جزیرہ کو گھیرے

---

(۱) حسین قراچانلو، حرمین شریفین (تہران: انتشارات امیر کبیر، ط ۱، ۱۳٦۲)، ص ۹.

(۲) یورپ کی ایک تہائی مساحت، فرانس کی چھ گنا مشرقی اور مغربی جرمنی کی نو برابر، دس برابر اٹلی ملک کی، ۸۰ گنا سویزرلینڈ اور ایران کی مساحت کے دوگنی مساحت ہے۔

(۳) مؤسسۂ گیتا شناسی، گیتا شناسی کشورھا (تہران: انتشارات گیتا شناسی، ط ٤، ۱۳٦٥)، ص ۲۰۵.

ہوئے ہے۔ اور چونکہ اس علاقہ کی، دریا اور پہاڑ وغیرہ جیسی کوئی قدرتی سرحد نہیں ہے لہٰذا جغرافیہ دان قدیم زمانے سے ہی سعودی عرب کی شمالی سرحدوں کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔[۱]

اگرچہ جزیرہ نمائے عرب خلیج فارس، بحر عمان، بحر احمر اور بحر مڈی ٹرانہ سے گھرا ہوا ہے لیکن صرف جنوبی حصہ کے علاوہ اس پانی سے کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہ علاقہ دنیا کے بہت زیادہ خشک اور گرم علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہاں ایک ایسا بڑا دریا بھی موجود نہیں ہے جس میں بحری جہاز کا راستہ ہو بلکہ اس کے بجائے وہاں ایسی گھاٹیاں موجود ہیں جن میں کبھی کبھار سیلاب آجاتا ہے۔

اس علاقہ میں خشکی کی وجہ، اس جزیرہ میں پھیلے ہوئے ایسے پہاڑ ہیں جو ایک بلند دیوار کے مانند جزیرۂ سینا سے شروع ہوتے ہیں اور مغرب کی سمت میں بحر احمر کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے ہیں اور جنوب کے مغربی گوشہ سے ٹیڑھے ترچھے (غیر مستقیم) انداز میں جنوبی اور مشرقی ساحل سے، خلیج فارس تک ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح سے سعودی عرب تین طرف سے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور یہ پہاڑ سمندروں کی رطوبت کو اس علاقہ میں سرایت کرنے سے روک دیتے ہیں۔[۲]

دوسرے یہ کہ اس کے اطراف کے ملکوں میں پانی کا ذخیرہ اتنا کم ہے کہ افریقا اور ایشیا کی اس وسیع آراضی کی گرمی اور خشکی کو یہاں کی مختصر سی بارش متعادل موسم میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ عرب میں ہمیشہ چلنے والی موسمی ہوائیں (جن کو سموم کہتے ہیں) بحر ہند کے جنوبی علاقہ سے اٹھتے ہوئے ابرباراں کو جزیرۃ العرب میں برسنے سے روک دیتی ہیں۔[۳]

---

(۱) فیلیپ خلیل حتی، تاریخ عرب، ترجمہ: ابو القاسم پاینده (تہران: انتشارات آگاہ، طبع دوم، ۱۳٦٦ ش)، ص ۲۱

(۲) علی اکبر فیاض، تاریخ اسلام، (تہران: انتشارات تہران یونیورسٹی، ط ۱۳٦۷۳)، ص ۲؛ آلبرماله وژول ایزاک، تاریخ قرون وسطی تا جنگ صد ساله، ترجمہ: میرزا عبد الحسین ہژیر (تہران: دنیای کتاب، ۱۳٦۲)، ص ۹۵.

(۳) فلیپ حتی، گزشتہ حوالہ، ص ۲٤

جزیرة العرب کی تقسیم

عرب اور عجم کے جغرافیہ نویسوں نے جزیرۃ العرب کو کبھی موسم (آب و ہوا) کے لحاظ سے اور کبھی قوم یا نسل کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔[۱] اور بعض معاصر دانشوروں نے اس کو مندرجہ ذیل تین بنیادی علاقوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ مرکزی حصہ جس کا نام "صحرائے عرب" ہے۔

۲۔ شمالی حصہ جس کا نام "حجاز" ہے۔

۳۔ جنوبی حصہ جو "یمن" کے نام سے مشہور ہے۔[۲]

---

(۱) مقدسی، چوتھی صدی کا مسلمان دانشور کہتا ہے کہ ملک عرب چار بڑے علاقوں، حجاز، یمن، عمان اور ہجر پر مشتمل ہے۔ (احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ترجمہ علی نقی منزوی (تہران: گروہ مؤلفین و مترجمین، ایران، ط ۱، ۱۳۶۱)، ص ۱۰۲، لیکن دوسروں نے کہا ہے کہ وہ پانچ حصے یعنی تہامہ، حجاز، نجد، یمن اور عروض پر مشتمل ہے. (الفداء ،تقویم البلدان، ترجمہ: عبد المحمد آیتی (تہران: انتشارات بنیاد فرہنگ ایران، ۱۳۴۹)، ص ۱۰۹، یاقوت حموی، معجم البلدان، بہ تصحیح محمد امین الخانجی الکتبی (قاہرہ: مطبعة السعادة، ط ۱، ۱۳۲٤ھ.ق)، ص ۱۰۱، اور ۲۱۹؛ شکری آلوسی، بغدادی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، (قاہرہ: دار الکتب الحدیثہ، ط ۲،)، ج ۱، ص ۱۸۷؛ جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام (بیروت: دار العلم، للملایین، ط ۱، ۱۹۶۸)، ج ۱، ص ۱۶۷۔

ان کے علاوہ دوسری تقسیمات بھی ذکر ہوئی ہیں جس کا ہمارے زمانے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ رجوع کریں: گوستاولوبون، تمدن اسلام و عرب، ترجمہ: سید ہاشم حسینی (تہران: کتاب فروشی اسلامیہ)، ص ۳۱

(۲) یحیی نوری، اسلام و عقائد و آراء بشری، (جاہلیت و اسلام)، تہران: مطبوعاتی فراہانی ۱۳٤٦)، ص۲۳٤۔ ۲۳۱)

جزیرۃ العرب کی تقسیم، اس کے شمالی اور جنوبی (قدرتی) حالات کی بنا پر

موجودہ دور میں ایک دوسری بھی تقسیم رائج ہوئی ہے جو اس کتاب کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ یہ تقسیم، زندگی کے ان حالات کی بنیاد پر ہے جو اس علاقہ کے انسانوں، حیوانوں اور مقامات پر اثر انداز تھے اور یہ شرائط وہاں کے باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی خصوصیات اور تبدیلیوں میں جلوہ گر ہوئے جو ظہور اسلام تک باقی رہے کیونکہ جزیرۃ العرب دو مخالف جغرافیائی حالات کا گہوارہ رہا ہے اور وہاں کے اجتماعی حالات کا دارومدار پانی کے وجود پر ہے اور پانی کی موجودگی یا عدم موجودگی ہی وہاں کے اجتماعی حالات پر اثر انداز ہوتی ہے جس کی بنا پر اس کا جنوبی علاقہ یعنی "یمن"، اس کے شمالی اور مرکزی علاقہ سے الگ ہو جاتا ہے۔

جنوبی جزیرۃ العرب (یمن) کے حالات

اگر ہم اس سرزمین کے نقشہ پر نگاہ ڈالیں تو جزیرۃ العرب کے مغربی جنوب کے آخر میں ایک علاقہ مثلث کی شکل میں نظر آتا ہے جس کے مشرقی ضلع میں بحر عرب کا ساحل اور مغربی ضلع میں بحر احمر کا ساحل ہے اور ظہران (جوکہ مغرب میں واقع ہے) سے وادی حضر موت (جوکہ مشرق میں واقع ہے) تک کھینچے جانے والے خط کو مثلث کا تیسرا ضلع قرار دیا جاسکتا ہے ان حدود میں جو علاقہ ہے اس کو قدیم زمانے سے "یمن" کہا جاتا ہے اس علاقہ میں پانی کی فراوانی اور مسلسل بارش کی وجہ سے کاشتکاری اچھی اور آبادی زیادہ رہی ہے۔ اس بنا پر یہ علاقہ شمالی یا مرکزی جزیرۃ العرب سے قابل قیاس نہیں ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک بڑی آبادی کے لئے دائمی جائے سکونت کی ضرورت پڑتی ہے اور اسی وجہ سے قصبے اور شہر بنتے ہیں اور لوگ بڑی تعداد میں وہاں بستے ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں جس کے نتیجے میں کوئی نظام لازم ہوتا ہے لہٰذا اس کے لئے قانون بنایا جاتا ہے (اگرچہ وہ ابتدائی اور آسان ہی کیوں نہ ہو) اور یہ بات واضح ہے کہ قوانین کے ساتھ حکومت کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ ان دونوں میں تلازم پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں حضرت مسیح کی ولادت سے صدیوں سال قبل حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور ان کے ذریعہ تہذیب و ثقافت کو رواج ملا ہے.[1]۔ جو حکومتیں اس علاقہ میں قائم ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

۱) حکومت معین: یہ حکومت ۱۴۰۰ سے ۸۵۰ سال قبل عیسوی تک برقرار رہی اور حکومت سبا کے تسلط پر ختم ہوگئی۔

۲)حکومت حضر موت: جو ۱۰۲۰ عیسوی سے قبل شروع ہوئی اور ۶۵ عیسوی کے بعد تک باقی رہی اور حکومت سبا کے مسلط ہونے کے ساتھ ختم ہوگئی۔

۳)حکومت سبا: جو ۸۵۰ عیسوی سے لیکر ۱۱۵ عیسوی سال قبل مسیح تک برسر اقتدار رہی اور حمیری سبا وریدان کے برسر اقتدار آتے ہی بکھر گئی۔

٤)حکومت قتیان: جو ۸۶۵ سے لے کر ۵٤۰ سال قبل مسیح تک برسر اقتدار رہی اور حکومت سبا کے آتے ہی نابود ہوگئی۔

۵) حکومت سبا و ریدان: حضر موت اور اطراف یمن جن کے بادشاہوں کے سلسلہ کو "تبع" کہا گیا ہے اور ان کی حکومت سال عیسوی سے ۱۱۵ سال پہلے شروع ہوئی اور عیسوی کے بعد ۵۲۳ء تک برقرار رہی اور اس کی راجدھانی "ظفار" تھی۔ [2]

---

(۱) سید جعفر شہیدی، تاریخ تحلیلی اسلام (تہران: مرکز اشاعت یونیورسٹی، ط٦، ۱۳٦۵)، ص ۳.

(۲) احمد حسین شرف الدین، الیمن عبر التاریخ (قاہرہ: مطبعۃ السنۃ المحمدیہ، ط ۲، ۱۳۸٤ھ.ق)، ص ۵۳.

جنوبی عرب کی درخشاں تہذیب

یمن کی پر رونق تہذیب مورخین کی نگاہ میں قابل تحسین واقع ہوئی ہے جیسا کہ ہَرُودَت (قبل مسیح پانچویں صدی میٹیونان کا ایک بزرگ مورخ) دور سبا میں اس سرزمین کی تہذیب اور عالی شان محلوں اور ہیرے اور جواہرات سے مرصع دروازوں کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ ان میں سونے چاندی کے ظروف اور قیمتی دھاتوں سے بنی ہوئی پلنگیں موجود تھیں۔[۱] کچھ مورخین نے صنعاء کے عالی شان محل (غمدان) کا ذکر کیا ہے جو بیس منزلہ تھا جس میں سو عدد کمرے تھے اور کمروں کی دیواریں بیس ہاتھ لمبی اور ساری چھتیں آئینہ کاری اور شیشے سے مزین تھیں۔[۲]

سترابون (روم کا مشہور سیاح) نے بھی سن عیسوی سے ایک صدی قبل اس سرزمین کا دورہ کیا تو اس علاقہ کے تمدن کے بارے میں ھرودت کی طرح اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کیا۔ مأرب ایک عجیب و غریب شہر ہے جس کی عمارتوں کی چھتیں عاج سے بنائی گئی ہیں اور ان کو ہیرے اورجواہرات سے مرصع تختیوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اور وہاں ایسے خوبصورت ظروف دیکھنے کو ملے جن کو دیکھ کر انسان حیرت زدہ ہو جائے۔[۳]

اسلامی مورخین اور جغرافیہ دان جیسے مسعودی (وفات ۳٤٦ھ) اور ابن رُستہ (تیسری صدی ہجری کے دانشوروں سے ہیں) نے بھی اس علاقہ کے لوگوں کی ظہور اسلام سے قبل، پُر رونق اور خوشحال زندگی، عمارتوں اور آبادیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔[٤]

---

(۱) گوستاولوبون، تمدن اسلام و عرب، ترجمہ: سیدہاشم حسینی (تہران: کتاب فروشی اسلامیہ)، ص ۹۲.

(۲) سید محمود شکری آلوسی بغدادی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب (قاہرہ: دار الکتب الحدیثہ، ط ۲)، ج ۱، ص ۲۰٤.

(۳) جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، ترجمہ: علی جواہر کلام (تہران: امیر کبیر، ۱۳۳۳)، ج ۱، ص ۱۳.

(٤) مسعودی، مروج الذهب و معادن الجوهر، تحقیق: محمد محیی الدین عبد الحمید (دار الرجاء للطبع و انشر)، ج ۲، ص ۸۹؛ ابن رستہ، الاعلاق النفیسہ، ترجمہ و تعلیق: حسین قراچانلو (تہران: امیر کبیر، ط ۱، ۱۳٦۵)، ص ۱۳۲.

انیسویں اور بیسویں صدی میں آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطالعے اور بحثوں اور مورخین کی تحقیقات سے اس علاقہ کی تاریخ واضح ہوئی اور ایسی نئی دستاویزات اور شواہد ملے جن سے اس سرزمین کے درخشاں اور قدیمی تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ عدن، صنعائ، مأرب اور حضر موت کے آثار قدیمہ اس بات کے گواہ ہیں کہ عرب کے جنوبی علاقہ یمن اور اس کے نواح میں بسنے والوں میں عظیم تمدن پایا جاتا تھا جو فینیقیہ اور بابل کے تمدن کے مقابلہ میں تھا۔ یمن کے قدیمی تمدن کا ایک مظہر مأرب کا سب سے بڑا بند تھا۔[1] یہ بند جو دقیق ریاضی محاسبات اور پیچیدہ نقشہ کے مطابق بنایا گیا تھا اس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نقشہ بنانے والا علم ہندسہ کا کس قدر ماہر تھا کہ اس سے اس علاقہ میں کس قدر کاشتکاری اور خوشحالی پیدا ہوئی۔ [2]

یمن کے لوگ کاشتکاری کے علاوہ، تجارت بھی کرتے تھے اور سبئیان مشرق و مغرب کی تجارت کا وسیلہ تھے کیوں کہ ملک یمن اس زمانہ میں چند متمدن ملکوں کے درمیان واقع تھا۔ ہندوستان کے تاجر اپنے تجارتی مال کو سمندر کے ذریعہ یمن اور حضر موت لایا کرتے تھے اور یمن کے تاجر اس کو حبشہ، مصر، فینیقیہ، فلسطین، مدین کے شہر، ادوم، عمالقہ اور مغربی ممالک لے جایا کرتے تھے۔ اور اہل مکہ بھی اپنے تجارتی مال کو خشکی کے راستے سے دنیا کے مختلف آباد علاقوں میں بھیجتے تھے[3]۔ ایک زمانہ تک مشرق وسطیٰ کی تجارت یمنیوں کے ہاتھ میں تھی[4] بحر احمر کی راہوں میں مشکلات کی بنا پر سبئیوں نے خشکی کے

---

(۱) مأرب بند، یمن کے موجودہ دار الحکومت صنعاء کے مشرقی سمت میں ۱۹۲ کلو میٹر کے فاصلہ واقع پر ہے۔

(۲) اس بند کے نقشے اور اس کی تعمیری خصوصیات سے مزید آگاہی کے لئے رجوع کریں: فرہنگ قصص قرآن (ضمیمۂ قصص قرآن) صدر بلاغی، (تہران: امیر کبیر، ط ۳، ص ۸۲ اور ۸۸؛ احمد حسین شرف الدین، الیمن عبر التاریخ، ص ۱۳۲ ۔ ۱۲۲۔

(۳) جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، ج ۱، ص ۱۱.

(٤) ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن، ترجمہ: احمد آرام و ھمکاران (تہران: سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، ط ۲، ۱۳۶۷)، ج ۱، ص ۳٤۱.

راستے کو اختیار کیا اسی لئے وہ یمن سے شام تک کی مسافت کو جزیرۃ العرب کے مغربی ساحل سے طے کرتے تھے۔ یہ راستہ "مکہ" اور "پترا" سے گزر کر شمال کی جانب مصر، شام اور عراق کی طرف نکلتا ہے۔[۱]

مأرب کے بند کی تباہی

یمنیوں میں برائیوں کا رواج اور اندرونی فتنوں اور فسادات کی بنا پر وہاں کا چمکتا ہوا خورشید تمدن روز بروز غروب ہونے لگا تھا اور بند مأرب جو کہ مرمت کا محتاج تھا وہاں کے حکمراں اور باشندے اس کی مرمت نہیں کر سکے آخر کار ٹوٹنے کی وجہ سے سیلاب نے آس پاس کی آبادی اور کھیتی کو نابود کر دیا اور اس کے اطراف میں پانی کی قلت کی بنا پر کاشتکاری ختم ہوگئی اور لوگ دوسری جگہ کوچ کرنے پر مجبور ہوگئے[۲]۔ قرآن کریم کے دو سوروں میں قوم سبا کا نام آیا ہے۔

ایک ملکۂ سبا کے ذکر اور ان کے نام حضرت سلیمان کے خط کی مناسبت سے اس طرح تذکرہ ہے "زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ (ہدہد) آیا اور کہا: میں ایسی چیز جانتا ہوں جس سے آپ باخبر نہیں ہیں میں سرزمین سبأ سے آپ کے لئے یقینی خبر لایا ہوں میں نے ایک خاتون کو دیکھا جو وہاں حکومت کرتی ہے اور تمام چیزیں اس کے اختیار میں ہیں (خاص طور سے) ایک بڑا تخت رکھتی ہے"۔[۳]

اور دوسری جگہ مأرب نامی بند کے ٹوٹنے سے سیلاب کی آمد اور برائیوں اور فحشاء کے رواج کے

---

(۱) فیلیپ حتی، تاریخ عرب، ترجمہ: ابوالقاسم پاینده (تہران: سازمان انتشارات آگاہ، ط۲، ۱۳۶۶)، ص ۶۵۔ ۶۴؛ رجوع کریں: گوشتاولوبون، تمدن اسلام و عرب، ص ۹۴؛ احمد حسین شرف الدین، الیمن عبر التاریخ، ص ۱۰۵؛ آلوسی، بلوغ الارب، ج ۱، ص ۲۰۳.

(۲) حسن ابراہیم، تاریخ سیاسی اسلام، ترجمہ: ابوالقاسم پاینده (تہران: سازمان انتشارات جاویدان، ط ۵، ۱۳۶۲)، ص ۳۲.

(۳) سورۂ نمل، ۲۷، آیت ۲۳۔ ۲۲.

نتیجے میں قوم کے انحطاط کی مناسبت سے یوں ذکر ہوا ہے۔ "اور قوم سبأ کے لئے ان کے وطن ہی میں ہماری نشانیاں تھیں کہ داہنے بائیں دونوں طرف باغات تھے۔ تم لوگ اپنے پروردگار کا دیا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو تمہارے لئے پاکیزہ شہر اور بخشنے والا پروردگار ہے۔ مگر ان لوگوں نے انحراف کیا تو ہم نے ان پر بڑے زوروں کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دونوں باغات کو ایسے دو باغات میں تبدیل کردیا جن کے پھل بے مزہ تھے اور ان میں جھاؤ کے درخت اور کچھ بیریاں تھیں یہ ہم نے ان کی ناشکری کی سزا دی ہے اور ہم ناشکروں کے علاوہ کس کو سزا دیتے ہیں۔ اور جب ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں کچھ نمایاں بستیاں قرار دیں اور ان کے درمیان سفر کو معین کردیا کہ اب دن و رات جب چاہو سفر کرو محفوظ رہوگے۔ تو انھوں نے اس پر بھی یہ کہا کہ پروردگار ہمارے شہروں اور آبادیوں میں دوری پیدا کردے اور اس طرح اپنے نفس پر ظلم کیا تو ہم نے انھیں کہانی بنا کر چھوڑ دیا اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کردیا کہ یقینا اس میں صبر و شکر کرنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ (۱)

حمزہ اصفہانی نے اس بند کی تباہی کو ظہور اسلام سے چار صدی قبل(۲)، ابوریحان بیرونی نے تقریبا ۵ صدی قبل(۳) اور یاقوت حموی نے حبشیوں کے تسلط کے زمانہ میں ذکر کیا ہے(٤) اور چونکہ حبشیوں کا تسلط چھٹی صدی کے وسط میں ہوا تھا لہذا بعض مورخین کا گمان ہے کہ اس بند

---

(۱) سورۂ سبا، ۳٤، آیت ۱۹۔ ۱۵

(۲) حمزہ اصفہانی، تاریخ پیامبران و شاھان (تاریخ ملوک الارض و الانبیائ)، ترجمہ: جعفر شعار (تہران: امیر کبیر، ط ۲، ۱۳٦۷)، ص ۱۲۰ اور ۱۳۲۔

(۳) آثار الباقیہ، ترجمہ: اکبر دانا سرشت (تہران: امیر کبیر، ط ۱، ۱۳٦۳)، ص ۱۸۱۔

(٤) معجم البلدان، تصحیح محمد امین الخانجی الکتبی (قاہرہ: مطبعۃ السعادۃ، ط ۱، ۱۳۲٤ھ.ق)، ج ۷، ص ۳۵۵.

کی تباہی ۵٤۲ سے ۵۷۰ عیسوی کے درمیان میں ہوئی ہے۔[١] بہرحال شاید اس بند کی تباہی تدریجی طور پر ہوئی ہے اورچند بار مرمت کے بعد آخرکار یہ منہدم ہوگیا۔

قرآن مجید میں قوم تُبَّع[٢] اور ان کے انجام کار کا دو جگہ پر ذکر ہوا ہے۔

١۔ "بھلا یہ لوگ زیادہ بہتر ہیں یا قوم تُبَّع اور ان سے پہلے والے افراد جنھیں ہم نے اس لئے تباہ کردیا کہ یہ سب مجرم تھے"[٣]

٢۔ان سے پہلے قوم نوح، اصحاب رس[٤] اور ثمود نے بھی تکذیب کی تھی۔ اور اسی طرح قوم عادوفرعون، قوم لوط، اصحاب ایکہ[٥] اورقوم تُبَّع نے بھی رسولوں کی تکذیب کی تو ہمارا وعدہ پورا ہوگیا۔[٦]

جزیرة العرب پرجنوبی تہذیب کے زوال کے اثرات

جنوبی ملکوں کا انحطاط اورجزیرة العرب کے جنوب میں تمدن کا زوال اوربند مأرب کی تباہی اس علاقہ کے حالات کی تبدیلی کا باعث بنی کیونکہ وہاں پر زندگی کی سہولتیں مفقود ہوگئیں تھیں اوربند کے

---

(١) فیلیپ خلیل حتی، تاریخ عرب، ص٨٢.

(٢) تُبَّع (جس کی جمع تبابعہ ہے) یمن میں حمیری بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا ۔ یہ لوگ دوسرے درجہ کے بادشاہ ہوا کرتے تھے پہلے درجہ کے بادشاہ، سبا اور ریدان کے بادشاہ تھے جنھوں نے ١١٥ سال قبل مسیح سے ٢٧٥ سال بعد مسیح تک حکومت کی ہے۔ سبا، ریدان، حضر موت اور شَحر، کے دوسرے درجے کے بادشاہوں نے ٢٧٥ سے ۵٣٢ تک بعد مسیح حکومت کی ہے۔ (احمد حسین شرف الدین، الیمن عبر التاریخ، ص ٩٧۔ ٩٠)

(٣) سورۂ دخان، ٤٤، آیت ٣٧.

(٤) وہ قوم جو یمامہ میں زندگی بسر کرتی تھی۔

(۵) قوم شعیب.

(٦) ق.(۵٠) ١٤۔ ١٢.

اطراف کی کھیتیاں پانی کی عدم موجودگی کی بنا پر ختم ہوگئیں تھیں لہٰذا وہاں پر آباد قوموں میں سے کچھ لوگ مجبور ہوکر دوسری جگہ کوچ کرگئے۔ اس انتشار کے نتیجے میں تنوخ خاندان جو کہ یمنی قبیلہ ازد سے تھا، حیرہ (عراق) ہجرت کرگیا اور وہاں "لخمیان" کی حکومت کی بنیاد ڈالی اور "آل جَفنہ" کا خاندان شام چلا گیا اور وہاں مشرقی اردن کے علاقہ میں حکومت کی بنیاد ڈالی اور "سلسلۂ غسانیان" کے نام سے مشہور ہوا۔[۱]

قبیلۂ اوس اور خزرج، یثرب (مدینہ) خزاعہ، مکہ اور اس کے اطراف میں قبیلۂ بجیلہ و خثعم اور دوسرے چند گروہ، سروات کے علاقہ میں جاکر ہمیشہ کے لئے بس گئے[۲] اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی ایک مستقل تاریخ کی بنیاد ڈالی۔

شمالی جزیرۃ العرب {حجاز} کے حالات

حجاز ایسا خشک علاقہ ہے جہاں پر بارش کم ہوتی ہے اور (پہاڑی اور ساحلی علاقوں کے علاوہ) لو چلتی ہے اور اس سے وہاں کے باشندوں کی زندگی متاثر ہے اور چونکہ یہاں کے رہنے والے، یمنیوں کے برخلاف آب و گیاہ کی کمی کی بنا پر صرف پالتو جانوروں کا ایک مختصر گلہ یا اونٹ کے علاوہ دوسری چیزیں نہیں رکھ سکتے تھے لہٰذا یہ لوگ اپنی خوراک اور پوشاک عموماً اونٹ کے ذریعہ فراہم کرتے تھے اور چونکہ دور دراز کے علاقوں میں ہجرت اور صحراؤں میں رفت و آمد صرف اسی طرح کی گلہ داری کے ذریعہ ممکن تھی لہٰذا ایک سیاسی نظام کا قیام اور خانہ بدوشوں کے لئے دائمی سکونت ممکن نہ تھی اس وجہ سے

---

(۱) حمزۂ اصفہانی، تاریخ پیامبران و شاہان، ص ۹۹ اور ۱۱۹؛ نیز رجوع کریں: حسن ابراہیم حسن، تاریخ سیاسی اسلام، ص ٤٤؛ ابوریحان بیرونی، الآثار الباقیہ، ص ۱۸۱ اور ۱۸۳۔

(۲) کارل بروکلمان، تاریخ ملل و دول اسلامی، ترجمہ: ھادی جزایری، (تہران: ادارہ ترجمہ و نشر کتاب، ۱۳٤٦)، ص٥.

یہاں کے لوگ (جنوبی علاقہ کے لوگوں کی بہ نسبت جو کہ شہر نشین اور کاشتکار تھے) غیر متمدن، خانہ بدوش اور صحرائی لوگ تھے۔ مکہ کے علاوہ حجاز کے دوسرے شہر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

انھیں علاقائی دشواریوں اور خراب راستوں کی وجہ سے اہل حجاز کا، اس زمانہ کے متمدن لوگوں سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا اور یہ قدرتی اور جغرافیائی حالات باعث بنے تھے کہ یہ علاقہ سلاطین جہاں کی طمع اور ان کے حملوں سے محفوظ رہا اور اس طرح سے دنیا کے بڑے سلاطین اور فاتحان عالم جیسے رامس دوم چودھویں صدی میں قبل مسیح ، سکندر مقدونی کو قبل مسیح چوتھی صدی میں اور ایلیوس گالوس (اگوست کے زمانہ میں پہلی صدی عیسوی میں روم کا بادشاہ) کو حجاز پر تسلط سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اسی طرح ایرانی شہنشاہوں نے بھی اس علاقہ پر قبضہ نہیں کیا اسی لئے حجاز کے لوگ آسودہ خاطر ہوکر اپنی زندگی گزار رہے تھے[1]۔ ایک مورخ اس بارے میں لکھتا ہے:

جس وقت دمتریوس، یونانی سردار (اسکندر کے بعد) سعودی عرب پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے پترا پہونچا تو اس علاقہ کے بدّووں نے اس سے کہا: اے امیر بزرگ! کیوں ہم سے جنگ کے لئے آئے ہو؟ ہم ایسے ریگستانی علاقہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں کہ جہاں زندگی گزارنے کی کوئی چیز موجود نہیں ہے ہم اس بیابان اور تپتے ہوئے صحرا میں اس بنا پر زندگی بسر کر رہے ہیں کہ کسی کے ماتحت اور غلام بن کر نہ رہیں۔ لہٰذا ہماری جانب سے پیش کردہ ہدیہ قبول فرمائیں اور اپنی جگہ واپس چلے جائیں اور ایسی صورت میں ہم آپ کے باوفا ساتھیوں میں سے ہوں گے لیکن اگر آپ نے ہمارا محاصرہ کرکے، ہمارے صلح کے مشورے کو قبول نہ کیا تو آپ کو ایک زمانہ تک اپنی راحت و سکون کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور آپ ہماری اس عادت اور طرز زندگی کو جو شروع سے چلی آرہی ہے تبدیل نہیں کرسکتے اور اگر ہم میں سے چند افراد کو اسیر کرکے لے بھی گئے تو آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا کیونکہ یہ لوگ اپنی ہمیشہ کی آزاد زندگی کو چھوڑ کر آپ کی غلامی نہیں کرسکتے۔ لہٰذا دمتریوس نے

---

(۱) جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، ترجمہ: علی جواہر کلام، (تہران: امیر کبیر، ۱۳۳۳)، ج ۱، ص ۱۵.

ان کے پیش کردہ ہدیہ کو قبول کرلیا اور ایک ایسی جنگ سے جس میں مشکلات اور پریشانیوں کے علاوہ اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا چشم پوشی کر کے واپس چلا گیا۔[1]

ایک دانشمند کہتا ہے کہ جزیرۃ العرب انسان اور زمین کے درمیان روابط کے منقطع نہ ہونے کا ایک کامل نمونہ ہے۔ اگر مختلف ملکوں میں جیسے ہندوستان، یونان، اٹلی، انگلینڈ اور امریکہ میں موقع پرست قومیں مسلسل ایک دوسرے کو شکست دینے یا اپنے زیر تسلط رکھنے کی بنا پر دوسری جگہ کوچ کرگئی ہیں۔ تاریخ عرب میں کوئی ایسا جنگجو بادشاہ نہیں ملا جس نے ریگستان کے سینہ کو چاک کرکے وہاں پر دائمی سکونت اختیار کی ہو، بلکہ عرب کے لوگ (تاریخی دستاویزات کے مطابق) ہمیشہ اپنی سابقہ حالت پر باقی رہے۔ اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔[2]

صحرا نشین

جزیرۃ العرب کا شمالی علاقہ (حجاز) زیادہ تر صحرائی ہے لہٰذا وہاں کے اکثر قبائل ظہور اسلام سے قبل بادیہ نشین و صحرا گرد تھے۔ بدو عرب قدرتی مناظر سے محروم اور اپنے زندگی کے میدان میں صرف گلہ بانی کے ذریعہ وہ بھی محدود اور قدیم طرز پر، زندگی گزارتے تھے۔ وہ لوگ بھیڑ بکریوں کے اون اور اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جس جگہ آب و گیاہ موجود ہو وہیں جاکر بس جاتے تھے اور پانی اور سبزے کے ختم ہونے پر دوسرے علاقہ کی طرف کوچ کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے یہ لوگ ہریالی اور چراگاہ کی کمی کی وجہ سے صرف چند اونٹ اور مختصر گلہ کے علاوہ دوسرے چوپائے نہیں رکھ سکتے تھے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: "صحرا میں تین چیزوں، بدو عرب، اونٹ

---

(۱) گوسٹاولوبون، تاریخ تمدن اسلام، ج ۱، ص ۸۸.

(۲) فیلیپ حتی، تاریخ عرب، ص ۱٤۔

اور کھجور کے درخت کی حکومت ہوتی ہے"۔ اور اگر اس میں ریگزار کا بھی اضافہ کردیا جائے تو بنیادی طور پر چار چیزوں کا صحرا پر غلبہ ہوتا ہے۔ پانی کی قلت، گرمی کی شدت، راہوں کی صعوبت اور آذوقہ کی کمی، عام طور سے انسانوں کے بڑے دشمن ہیں اور انسانوںکو خوف و خطرہ انھیں سے ہوتا ہےیہی وجہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو کہ عرب اور صحرا نے کبھی بھی غیروں کے تسلط کو اپنے اوپر برداشت نہیں کیا تو ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہیئے. صحرا کی خشکی، اس کا استمرار اوریکسانیت، بدؤوں کے جسم و عقل کی تکوین میں تجلی پاگیا تھا۔ یہ لوگ کاشتکاری یا دوسرے پیشے اور کام کو اپنی شان کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔[1] لہٰذا متمدن حکومتوں اور شہری نظام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور صحرا و ریگستانی علاقوں میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور یہ بات ان کی موروثی خصلت میں شامل تھی۔ [2]

یہ لوگ ایک وسیع صحرا کے سپوت اور آزادمزاج تھے لہٰذا بغیر کسی عمارت کی رکاوٹ کے یہ لوگ صاف و شفاف ہوا سے بہرہ مند ہوتے تھے، سورج کی دائمی تپش اور بارش و سیلاب کے پانی کو روکنے کے لئے کوئی سد نہیں تھا بلکہ تمام چیزیں قدرتی طور پر آزاد اور اپنی اصلی حالت پر تھیں۔

کاشتکاری اور کاروبار نے انھیں محدود اور مصروف نہیں کر رکھا تھا اور نہ ہی شہر کی بھیڑ بھاڑ سے وہ تنگ آگئے تھے اورچونکہ آزاد زندگی کی عادت تھی لہٰذا آزادی کو پسند کرتے تھے اور اپنے کو کسی قانون اور نظام کا پابند نہیں سمجھتے تھے اور جو بھی ان پر فرمانروائی کرنا چاہتا تھا اس سےپوری طاقت کے ساتھ لڑتے تھے۔ صرف دو چیزیں ان کو محدود کئے ہوئے تھیں:

۱۔ ایک بت پرست نظام کی قید و بند اور اس کے مذہبی رسومات ۔

۲۔دوسرے قبیلوں کے آداب و رسومات اور قبیلے سے وابستگی کی بنا پر جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی تھیں۔

---

(۱) فیلیپ حتی، تاریخ عرب، (تہران: آگاہ ط۲، ۱۳۶۶)، ص ۳۵، ۳۳.

(۲) گوسٹاولوبون، تاریخ تمدن اسلام، ج ۱، ص ۶۵۔ ۶۴؛ ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن، (عصر ایمان)، ج ٤، (بخش اول)، ترجمہ: ابوطالب صارمی (تہران: سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، ط۲، ۱۳۶۸)، ص ۲۰۱.

البتہ ان کے یہاں قبیلہ کے رسم و رواج کی پیروی خلوص اور اعتقاد جازم کے ہمراہ تھی۔ (۱)

لارنس بلجیکی (مشرقی محقق) کہتا ہے: عرب، آزادی اور ڈیموکراسی کا نمونہ تھے۔ لیکن ایسی افراطی ڈیموکراسی جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اور جو بھی ان کی طاقت اور آزادی کو محدود کرنا چاہتا تھا (اگرچہ یہ محدودیت ان کے فائدہ میں ہو) وہ اس کے خلاف قیام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ جس سے ان کے ظلم اور جرائم کا پتہ چلتا ہے جس سے تاریخ عرب کا ایک عظیم حصہ پُر ہے۔ (۲)

قبائلی نظام

ظہور اسلام سے قبل حجاز کا علاقہ کسی حکومت کے تابع نہیں تھا اور وہاں کوئی سیاسی نظام نہیں پایا جاتا تھا اسی بنا پر ان کی معاشرتی زندگی ایران اور روم کے لوگوں سے بہت زیادہ فرق کرتی تھی۔ کیونکہ یہ دونوں ملک سعودی عرب کے ہمسایہ تھے اور ان میں مرکزی حکومت پائی جاتی تھی جس کے زیر نظر ملک کے تمام علاقے تھے اور وہاں پر مرکز کے قوانین نافذ تھے۔ لیکن حجاز (مجموعی طور سے شمال اور مرکز جزیرۃ العرب کے علاقہ کو کہتے ہیں) میں ایک مرکزی حکومت شہروں میں بھی موجود نہیں تھی۔ عرب کے سماج کی بنیاد قبیلے پر اور ان کا سیاسی اور اجتماعی نظام، قبائلی نظام کے مطابق تھا۔ اور یہ نظام ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں نمایاں تھا۔ اور اس نظام میں لوگوں کی حیثیت صرف کسی قبیلہ سے منسوب

---

(۱) احمد امین، فجر الاسلام، (قاہرہ: مكتبة النهضة المصرية، ط ۹، ۱۹٦٤)، ص ٤٦.

(۲) وہی حوالہ، ص ۳٤۔ ۳۳، نعمان بن منذر (حیرہ کے بادشاہ) نے کسریٰ (بادشاہ ایران)، کے جواب میں جس نے پوچھا تھا کہ کیو عرب کی قوم ایک حکومت اور نظام کے تحت نہیں رہتی ہے؟ کہا دوسری قومیں چونکہ اپنے کو کمزور محسوس کرتی ہیں اور دشمن کے حملہ سے خوف کھاتی ہیں، لہٰذا اپنے کاموں کو ایک خاندان کے سپرد کردیتی ہیں لیکن عربوں میں ہر ایک چاہتا ہے کہ ہم بادشاہ رہیں اور وہ خراج و ٹیکس دینے سے نفرت کرتے ہیں (آلوسی بلوغ الارب، ج ۱، ص ۱۵۰)

ہونے کی بنا پر متعین ہوتی تھی۔

قبیلہ جاتی زندگی کا تصور نہ تنہا صحرا نشینوں میں بلکہ شہروں میں بھی نمایاں تھا۔ اس علاقہ میں ہر قبیلہ ایک مستقل ملک کے مانند تھا اور اس دور میں قبائل کے درمیان تعلقات ویسے ہی تھے جیسے آج کسی ملک کے تعلقات دوسرے ملکوں سے ہوتے ہیں۔

نسلی رشتہ

اس زمانہ میں عربوں میں "ملیت" اور "قومیت" وحدت دین، زبان یا تاریخ جیسے مختلف موضوعات کی بنیاد پر متصور نہیں تھی بلکہ چند خاندانوں کے مجموعہ کو "قبیلہ" کہتے تھے اور حسب و نسب اور خاندانی رشتے اور ناطے ہی افراد کے درمیان تعلقات کی بنیاد تھے۔ اور انھیں چیزوں کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان تعلقات اور رشتے قائم تھے کیونکہ ہر قبیلہ کے لوگ اپنے کو اسی قبیلہ کے خون سے سمجھتے تھے۔[۱] خانوادے کے اجتماع سے خیمہ اور خیموں کے اجتماع سے قبیلہ وجود پاتا تھا۔ اور متعدد قبیلوں سے مل کر بڑی تنظیمیں تشکیل پاتی تھیں جیسے یہودیوں کی تنظیم ایک ہی نسل اور خاندان کی بنیاد پر تھی۔ یہ لوگ اپنے خیموں کو اتنا قریب نصب کرتے تھے کہ اس سے چند ہزار افراد پر مشتمل قبیلہ ہو جاتا تھا اور پھر ایک ساتھ مویشیوں کے ہمراہ کوچ کرتے تھے۔[۲]

قبیلہ کی سرداری

قبیلہ کے سردار اور نمائندہ کو "شیخ" کہا جاتا تھا[۳] شیخ عام طور پر سن رسیدہ ہوتا تھا اور قبیلہ کی سرداری چند چیزوں کی بنا پر ملتی تھی۔ بڑی شخصیت، تجربہ یا قبیلہ سے دفاع کرنے میں شجاعت کا اظہار

---

(۱) احمد امین، فجر الاسلام، ص ۲۲۵؛ عبد المنعم ماجد، التاریخ السیاسی للدولۃ العربیہ، (قاہرہ: ط ۷، ۱۹۸۲)، ص ٤٨.

(۲) کارل بروکلمان، تاریخ دول و ملل اسلامی، ص ٦۔ ٥.

(۳) رئیس، امیر اور سید بھی کہا جاتا ہے۔ (عبد المنعم، التاریخ السیاسی للدولۃ العربیہ، ص ٤٩)

اور کثرت مال ہے[۱] شیخ کے انتخاب میں امتیازی صفات جیسے سخاوت، شجاعت، صبر، حلم، تواضع اور انداز بیان کا لحاظ بھی کیا جاتا تھا۔[۲]

قبیلہ کا سردار، فیصلے، جنگ اور دوسرے عمومی امور میں، ڈکٹیٹر شپ کا درجہ نہیں رکھتا تھا بلکہ ہر کام کے لئے، اس کمیٹی سے مشورہ لیتا تھا جو بزرگان قوم و قبیلہ کے ذریعہ تشکیل پاتی تھی اور یہی وہ افراد تھے جو شیخ کا انتخاب کرتے تھے اور جب تک اس کے گروہ والے اس سے خوش رہتے تھے وہ اپنے منصب پر باقی رہتا تھا[۳] ورنہ معزول کردیا جاتا تھا. لیکن بہر حال قبیلہ کے دستور کے مطابق، تمام افراد رئیس کی پیروی کرتے تھے اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا اور کبھی ایک سن رسیدہ شخص جس کے اندر اس کی تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں یا وہ شخص جو خاص شخصیت اور لیاقت کا مالک ہوا کرتا تھا اسے اس منصب کے لئے چنا جاتا تھا۔

دین اسلام نے قبیلہ جاتی نظام سے جنگ کی اور اس کو ختم کیا اور حسب و نسب جو اس نظام کی بنیاد تھی اس کو اہمیت نہیں دی اور نئے اسلامی معاشرے کی بنیاد، وحدت عقیدہ اور ایمان پر استوار کی، جو کہ اجتماعی رشتہ جوڑنے میں بہت مؤثر ہے اور اس طرح وحدتِ خون کی جگہ، وحدت ایمان کو بنیاد قرار دیا اور تمام مومنین کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا[٤] اور اس طرح سے عرب سماج کے ڈھانچے کی بنیاد میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

---

(۱) وہی حوالہ.

(۲) آلوسی، بلوغ الارب، تصحیح محمد بہجۃ الأثری، (قاہرہ: دار الکتب الحدیثہ، ط۳)، ج۲، ص ۱۸۷

(۳) فیلیپ حتی، تاریخ عرب، ص ۳۹.

(٤) (انما المومنون اخوۃ) سورۂ حجرات، ٤۹، آیت ۱۰.

قبائلی تعصب

تعصب اس حدتک تھا کہ قبیلہ کی روح قرار دیا گیا تھا اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ شخص بے انتہا اپنے قبیلہ کے افراد سے وابستہ تھا۔ مجموعی طورپر صحرا نشینوں میں قبیلہ جاتی تعصب، وطن پرستی کے تعصب کی مانند تھا.[۱] وہ کام جو ایک متمدن شخص اپنے ملک، مذہب یا قوم کے لئے انجام دیتا ہے بدو عرب اپنے قبیلے کے لئے انجام دیتے تھے اور اس راہ میں ہر کام انجام دینے کے لئے تیار رہتے تھے،یہاں تک کہ اپنی جان نثار کر دیتے تھے۔[۲]

عربوں کے درمیان، قبائلی لوگوں کا برتاؤ اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کے حق میں تعصب کی حدتک ہوتا تھا یعنی یہ لوگ ہر حال میں اپنے اقرباء کی حمایت کرتے تھے چاہے وہ حق پر ہوں یا باطل پر، خطاکار ہوں یا درست کار، ان کی نظروں میں اگر کوئی اپنے بھائی کی حمایت کرنے میں کوتاہی کرے تو اس کی شرافت داغ دار ہوجاتی ہے اس سلسلہ میں وہ کہتے تھے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

ایک عرب شاعر نے اس بارے میں کہا ہے: جس وقت ان کے بھائیوں نے مشکلات میں ان کی مدد چاہی تو وہ بغیر کسی سوال اور دلیل کے ان کی مدد کو دوڑ پڑے۔[۳]

یہی وجہ تھی کہ اگر قبیلہ کے کسی فرد کی اہانت ہوجاتی تو وہ پورے قبیلہ کی اہانت سمجھی جاتی تھی۔ اور قبیلہ کے لوگوںکی ذمہ داری ہوتی تھی کہ اس اہانت اور بے عزتی کے داغ کو مٹانے کے لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کردیں۔[۴]

دین اسلام اس طرح کے اندھے قبائلی تعصب کی مذمت کرتا ہے اور اسے جاہلانہ اور غیر منطقی قرار دیتا

---

(۱) فیلیپ حتی، گزشتہ حوالہ، ص ۳۸.

(۲) ویل ڈورانٹ، گزشتہ حوالہ، (عصر ایمان)، ج ٤، ص ۲۰۰.

(۳) لایسئلون اخاہم حین یندبہم * فی النائبات علی ماقال برہانا(احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ۱۰)

(٤) حسن ابراہیم حسن، تاریخ سیاسی اسلام، ترجمہ: ابوالقاسم پایندہ(تہران: سازمان انتشارات جاویدان، ط٥، ۱۳٦۲)، ج ۱، ص ۳۸۔ ۳۷؛ عبد المنعم ماجد، گزشتہ حوالہ، ص ۵۱۔ ۵۰.

ہے۔" اس وقت کو یاد کرو جب کفار اپنے دلوں میں زمانہ جاہلیت جیسا تعصب رکھتے تھے"۔[۱]

پیغمبر اسلا ﷺ م نے فرمایا ہے: جو شخص تعصب کرے یا اس کے لئے تعصب کیا جائے وہ اسلام سے خارج ہے[۲] آپ نے یہ بھی فرمایا ہے: جو شخص تعصب کی بات کرے یا لوگوں کو تعصب کی طرف دعوت دے یا تعصب کی روح اور فکر رکھتے ہوئے مرجائے وہ ہم میں سے نہیں ہے[۳] نیز آپ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم لوگوں نے عرض کیا: مظلوم کی مدد کرنا تو معلوم ہے، ظالم کی کس طرح سے مدد کریں؟ آپ نے فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روکو۔[٤]

قبائلی انتقام

عرب میں اس وقت کوئی ایسی مرکزی حکومت یا کمیٹی موجود نہیں تھی جو لوگوں کے اختلافات کو ختم کرے اور وہاں پر عدل و انصاف قائم کرسکے۔ جس پر ظلم و ستم ہوتا تھا وہ اپنا انتقام لیتا تھا اور اگر ظالم دوسرے قبیلہ کا ہوا کرتا تھا تو مظلوم کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنا بدلہ اس قبیلہ کے تمام افراد سے لے اور یہ چیز

---

(۱) (اذجعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیة حمیة الجاھلیة) سورۂ فتح،٤٨ آیت ٢٦.

(۲) من تعصب او تعصب له فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه (صدوق)، ثواب الاعمال، و عقاب الاعمال،(تہران: مکتبة الصدوق)، ص ٢٦٣؛ کلینی، الاصول من الکافی (تہران: مکتبة الصدوق، ط ۲، ١٣٨١ھ.ق)، ج ۲، ص ٣٠٨.

(۳) لیس منا من دعا الی عصبیة، و لیس منا من قال (علی عصبیة) و لیس منا من مات علی عصبیة۔ (سنن ابی داؤد (بیروت: دار الفکر)، ج ٤، کتاب الادب، باب فی العصبیة، ص ٣٣٢، حدیث ٥١٢١).

(٤) عن انس قال: قال رسول الله ﷺ انصر أخاک ظالماً أو مظلوماً . قالوا: یا رسول الله ھذا ننصرہ مظلوماً فکیف ننصرہ ظالماً؟ قال: تأخذ فوق یدیه۔ (صحیح بخاری بحاشیة السندی (بیروت: دار المعرفة)، ج ۲، کتاب المظالم، ص ٦٦؛ مسند احمد، ج ۳، ص ۲۰۱).

عربوں میں بہت عام تھی[۱]۔ کیونکہ لوگوں کی خطائیں پورے قبیلہ کی طرف منسوب ہوتی تھیں اور قبیلہ کا ہر فرد رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ذمہ دار تھا کہ وہ اپنے قبیلے کے تمام افراد کی مدد کرے۔ (بغیر اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ وہ حق پر ہے یا ناحق) اور یہ ذمہ داری شروع میں گھر، خاندان اور اقرباء کی جانب سے انجام پاتی تھی۔ اور جب اس میں وہ کامیاب نہیں ہوتے تھے اور خطرہ نہیں ٹلتا تھا تو گروہ اور قبیلہ کے دوسرے افراد اس کی مدد کرتے تھے۔

اگر کوئی قتل ہو جاتا تھا تو قصاص کی ذمہ داری اس کے قریب ترین رشتہ دار پر ہوتی تھی[۲] اور اگر مقتول دوسرے قبیلہ سے ہوتا تھا تو وہاں پر انتقام کی "رسم" جاری ہوتی تھی اور قاتل کے قبیلہ کے ہر فرد کو یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں مقتول کے بدلہ میں اسے اپنی جان سے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ کیونکہ ان کی صحرائی سنت اور رسم یہ تھی کہ "خون صرف خون کے ذریعہ دھلتا ہے" اور خون کا بدلہ صرف خون ہے۔

لوگوں نے ایک اعرابی سے کہا: کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ جس نے تمہیں اذیت پہنچائی ہے اسے معاف کردو اور انتقام نہ لو؟ اس نے جواب دیا کہ میں خوش ہوؤں گا اگر بدلہ لوں اور جہنم میں جاؤوں۔[۳]

قبائلی رقابت اور فخر و مباہات

اس زمانہ میں عرب کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے اور جو چیزیں اس سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں (اگرچہ وہ چیزیں موہوم اور بے

---

(۱) حسن ابراہیم حسن، گزشتہ حوالہ، ص ۳۹.

(۲) بروکلمان، گزشتہ حوالہ، ص ۷۔ ٦.

(۳) نویری، نہایۃ الارب فی فنون الادب (وزارۃ الثقافہ و الارشاد القومی المصریہ)، ج ٦، ص ٦٧.

بنیاد ہوتی تھیں) اس پر ناز کرتے تھے اور اس کی بنا پر دوسرے قبائل پر فخر کرتے تھے۔ میدان جنگ میں شجاعت، بخشش اور وفاداری،[۱] مال و دولت کثرت اولاد اور کسی بڑے قبیلہ سے تعلق ہر ایک اس زمانہ کے عرب کی نگاہ میں بڑی اہمیت کا حامل اور وسیلۂ برتری تھا اور وہ اس چیز کو اپنے افتخار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

قرآن کریم نے ان کی باتوں کی اس طرح سے مذمت کی ہے:

"اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم اموال اور اولاد کے اعتبار سے تم سے بہتر ہیں اور ہم پر عذاب ہونے والا نہیں ہے آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار جس کے رزق میں چاہتا ہے کمی یا زیادتی کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں اور تمہارے اموال اور اولاد میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہیں ہماری بارگاہ میں قریب بنا سکے علاوہ ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے"۔[۲]

ایک دن کسریٰ (بادشاہ ایران) نے نعمان بن منذر (بادشاہ حیرہ) سے پوچھا کہ کیا قبائل عرب میں کوئی ایسا قبیلہ ہے جو دوسروں پر شرف اور برتری رکھتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ہاں! تو اس نے کہا: ان کے شرف کی وجہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ جس کے باپ دادا میں سے تین شخص لگاتار رئیس قبیلہ ہوں اور ان کی نسل سے چوتھا بھی رئیس بنے تو قبیلہ کی ریاست اس کے خاندان کو ملتی ہے۔[۳]

عصر جاہلیت میں عرب قبیلہ کے افراد کی کثرت کو اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھتے تھے اور اس طرح اپنے رقیب قبائل پر فخر و مباہات کرتے اور ان سے افراد کی تعداد کا مقابلہ کرتے تھے[۴] یعنی اپنے افراد کی تعداد بتا کر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

ایک دن دو قبیلوں کے درمیان اس قسم کا تفاخر شروع ہوا، ہر ایک نے اپنے قبیلہ کے افتخارات بیان

---

(۱) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۸۰۔

(۲) سورۂ سبا، ۳٤، آیت ۳۷۔ ۳۵

(۳) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۸۱۔

(٤) منافرہ، نفر سے بنا ہے یعنی ہر ایک اپنی تعداد دوسرے سے زیادہ بتاتا تھا۔ (آلوسی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۸۸.) اس قسم کے تفاخر کے بے شمار واقعات، ظہور اسلام سے قبل تاریخ عرب میں نقل ہوئے ہیں۔

گئے اور طرفین نے دعویٰ کیا کہ ہماری خوبیاں اور قبیلہ کے افراد، دوسرے قبیلہ کے مقابل میں زیادہ ہیں اس موقع پر دونوں کی تعداد کو شمار کیا گیا، زندہ لوگوں کی سرشماری مفید ثابت نہیں ہوئی تو مردوں کے شمارش کی نوبت آئی اور دونوں طرف کے لوگ قبرستان گئے اور اپنے اپنے مردوں کو شمار کیا۔[۱]

قرآن کریم نے ان کے اس جاہلانہ اور غیر عاقلانہ طرز عمل کی اس طرح سے مذمت کی ہے۔

"تمہیں باہمی مقابلۂ کثرت مال اور اولاد نے غافل بنادیا ،یہاں تک کہ تم نے قبروں سے ملاقات کرلی اور اپنے مردوں کی قبرونکو شمار کیا اور اس پر فخر و مباہات کیا. ایسا نہیں ہے کہ گمان کرتے ہو ، دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا"۔ [۲]

نسب کی اہمیت

جاہل عربوں کے درمیان کمال کا ایک اہم معیار، نسب ہوا کرتا تھا جو ان کی نظر میں بہت اہمیت رکھتا تھا یہاں تک کہ بہت ساری خوبیاں "نسب" کی بنا پر ہوا کرتی تھیں۔[۳]

قبائل عرب میں نسلی تفاخر بہت زیادہ پایا جاتا تھا جس کا واضح نمونہ وہ قومی رقابتیں ہیں جو عدنانیوں

---

(۱) سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان، ج۲۰، ص۳۵۳؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۷۹

(۲) سورۂ تکاثر، ۱۰۲، آیت ۳۔ ۱

(۳) مثلاً اس زمانہ کی رسم یہ تھی کہ اگر کسی کا باپ عرب اور ماں عجمی ہوتی تھی تو اس کو طعنہ اور تحقیر کرنے کے لئے "ہجین" کہتے تھے (جو نسب کی پستی اور ناخالصی پر دلالت کرتا ہے) اور اگر کوئی اس کے برعکس ہوتا تھا تو اس کو "مذرع"۔۔کہتے تھے۔ ھجین ارث سے محروم رہتا تھا (ابن عبد ربہ اندلسی، العقد الفرید، (بیروت: دار الکتاب العربی، ۱٤۰۳ھ.ق)، ج٦، ص ۱۲۹؛ ھجین مرد صرف اپنی جیسی عورتوں سے شادی کرنے کا حق رکھتا تھا (محمد بن حبیب المحبر، (بیروت: دار الآفاق الحدیدۃ)، ص ۳۱۰؛ شہرستانی، الملل و النحل، (قم: منشورات الرضی، ط۲) ص ۲٥٤. دور اسلام میں پیغمبر اسلام ﷺ سے ھجین کے خون بہا کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: اسلام کے ماننے والوں کے خون کی قیمت برابر ہے۔(ابن شہر آشوب، مناقب، (قم: المطبعۃ العلمیہ، ج۱، ص ۱۱۳.

(شمالی عرب) اور قحطانیوں (جنوبی عرب) کے درمیان پائی جاتی تھیں۔(۱)اسی بنا پر وہ لوگ اپنے نسب کی شناخت اور حفاظت کو اہمیت دیتے تھے۔

نعمان بن منذر کسریٰ کے جواب میں کہتا ہے: عرب کے علاوہ کوئی بھی امت، اپنے نسب سے واقف نہیں ہے اور اگر ان کے اجداد کے بارے میں پوچھا جائے تو اظہار لاعلمی کرتے ہیں لیکن ہر عرب اپنے آباء و اجداد کو پہچانتا ہے اور غیروں کو اپنے قبیلہ کا جزء نہیں مانتا اور خود دوسرے قبیلہ میں شامل نہیں ہوتا اور اپنے باپ کے علاوہ دوسروں سے منسوب نہیں ہوتا۔(۲)

لہٰذا تعجب کی بات نہیں ہے کہ علم "نسب شناسی" اس وقت ایک محدود علم تھا جس کی بڑی اہمیت تھی اور نسب دانوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔

آلوسی جوکہ عرب شناسی کے مسئلہ میں صاحب نظر ہے کہتا ہے: عرب کے جاہل اپنے نسب کی شناخت اور حفاظت کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ شناخت الفت و محبت کا ایک وسیلہ تھی وہ اور ان کے یہاں اس کی زیادہ ضرورت پڑتی تھی کیونکہ ان کے قبائل متفرق ہوتے تھے اور جنگ کی آگ مستقل ان کے درمیان شعلہ ور تھی اور لوٹ و مار ان کے درمیان رائج تھا۔ اور چونکہ وہ کسی قدرت کے ماتحت نہیں

---

(۱)جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، (بیروت: دار العلم للملائین، ۱۹۶۸م)، ج۱، ص ۴۹۳ کے بعد؛ شوقی ضیف، تاریخ الادب العربی، العصر الجاہلی، ص ۵۵۔

(۲)آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۱۴۹۔ زمانہ اسلام میں عمر بن خطاب نے اسی فکر سے متاثر ہوکر عراق کے نبطیوں سے جنھوں نے اپنا تعارف اپنے رہنے کی جگہ سے کیا تھا، ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا: اپنے نسب کو سیکھو اور عراق کے نبطویں کی طرح نہ بنو اس لئے کہ جب ان سے ان کے خاندان اور نسب کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو جواب میں کہتے ہیں فلاں جگہ اور فلاں محل کا رہنے والا ہوں۔ (ابن خلدون، مقدمہ، تحقیق: خلیل شحادہ و سہیل زکار، نویں فصل، ص ۱۶۲؛ ابن عبد ربہ اندلسی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۱۲)۔

رہنا چاہتے تھے جو ان کی حمایت کرے لہٰذا وہ مجبور ہوکر اپنے نسب کی حفاظت کیا کرتے تھے تاکہ اپنے دشمن پر کامیاب ہوسکیں کیونکہ رشتہ داروں کی آپسی محبت، حمایت اور تعصب ایک دوسرے کے الفت اور تعاون کا باعث بنتی ہے اور رسوائی اور تفرقہ سے رکاوٹ کا باعث قرار پاتی ہے۔(۱)

دین اسلام ہر طرح کی قومی برتری کا مخالف ہے اگرچہ قرآن کریم قریش اور عرب کے درمیان نازل ہوا تھا لیکن اس کے مخاطبین صرف قریش، عرب یا اس کے مانند دوسرے افراد نہیں ہیں بلکہ اس کے مخاطبین عوام الناس ہیں اور اس میں مسلمانوں او رمومنین کے فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن کریم قومی فرق کو فطری جانتا ہے اور اس فرق کا فلسفہ بتاتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچانیں اور قومی اور نسلی فخر و مباہات کی مذمت کرتا ہے اور بزرگی کا معیار "تقویٰ" کو بتاتا ہے۔

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو بیشک تم میں خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے اور اللہ ہر شیٔ کا جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے۔(۲)

پیغمبر اسلا ﷺ م نے نسلی اور خاندانی فخر و مباہات کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ جس کے چند نمونے یہ ہیں:

۱۔ فتح مکہ کے موقع پر جب قریش کا اصلی قلعہ منہدم ہوگیا تو آپ نے فرمایا: اے لوگو! خداوند عالم نے نور اسلام کے ذریعہ، زمانۂ جاہلیت میں رائج فخر و مباہات کو ختم کردیا۔ آگاہ ہوجاؤ کہ تم نسل آدم سے ہو اور آدم خاک سے پیدا ہوئے ہیں۔ خدا کا بہترین بندہ وہ ہے جو متقی ہو کسی کے باپ کا عربی

---

(۱) بلوغ الارب، ج۳، ص ۱۸۲؛ اسی طرح رجوع کریں: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۱، ص ٤٦٧۔ ٤٦٦۔

(۲) سورۂ حجرات، ٤٩، آیت ۱۳۔ حضرت امام صادق سے ایک روایت کے مطابق اور بعض تفسیروں کی بنیاد پر، مذکورہ آیت میں کلمۂ "قبائل" سے مراد عرب کے چھوٹے گروہ ہیں جن میں سے ہر ایک کو "قبیلہ" کہا جاتا ہے اور "شعوب" سے مراد غیر عربی گروہ ہے۔ (طبرسی، مجمع البیان، تفسیر سورۂ حجرات، ذیل آیۂ ۱۳)

ہونا فضیلت نہیں رکھتا، یہ صرف زبانی بات ہے اور جس کا عمل اسے کسی مرتبہ پر نہ پہنچا سکے اس کا نسب و خاندان بھی اسے کسی مرتبہ پر نہیں پہنچا سکتا۔[1]

۲۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک مفصل خطبہ کے دوران جو کہ اہم اور بنیادی مسائل پر مشتمل تھا آپ نے فرمایا: کوئی عربی، عجمی پر فضیلت نہیں رکھتا، صرف تقویٰ کے ذریعہ آدمی بزرگ اور محترم قرار پاتا ہے۔[2]

۳۔ ایک دن آپ نے قریش کے سلسلے میں گفتگو کے دوران، جناب سلمان کی باتوں کی تائید فرمائی اور قریش کے غلط طرز فکراور انکی نژادپرستی کے مقابلہ میں روحانی کمالات پر تکیہ کرتے ہوئے فرمایا: اے گروہ قریش! ہر شخص کا دین ہی اس کا حسب و نسب ہے اور ہر کسی کا اخلاق و کردار ہی اس کی مردانگی ہے اور ہر ایک کی اساس اور بنیاد اس کی عقل و فہم اور دانائی ہے۔[3]

---

(۱) کلینی، الروضۃ من الکافی، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط۲)، ص ۲٤٦؛ مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب اسلامی)، ج ۲۱، ص ۱۳۷، اور۱۳۸، اور الفاظ میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ، سیرہ ابن ہشام، ج٤، ص ٥٤، پر نقل ہوا ہے۔

(۲) حسن بن علی بن شعبہ، تحف العقول (قم: مؤسسۃ النشر الاسلامی، ط۳، ۱۳٦۳)، ص ۳٤.

(۳) کلینی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۸۱۔

قبائلی جنگیں

اگر عرب کے درمیان کوئی قتل رونما ہوتا تھا تو اس کی ذمہ داری قاتل کے قریبی ترین افراد پر عائد ہوتی تھی اور چونکہ قاتل کا قبیلہ اس کی حمایت پر آمادہ اور کمر بستہ نظر آتا تھا ، لہٰذا انتقام کے لئے خون ریز جنگیں ہوتی تھیں. اور یہ جنگیں جو عام طور پر چھوٹی باتوں پر ہوتی تھیں کئی سالوں تک جاری رہتی تھیں جیسا کہ "جنگ بسوس" جو کہ دو قبیلوں بنی بکر اور بنی تغلب کے درمیان (یہ دونوں قبیلے ربیعہ سے تھے)

چھڑی چالیس سال تک جنگ جاری رہی اور اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ پہلے قبیلہ کا اونٹ جو کہ بسوس نامی خاتون کا تھا بنی تغلب کی چراگاہ میں چرنے کے لئے چلا گیا تو اسے ان لوگوں نے مار ڈالا۔(۱)

اسی طرح سے" داحس اور غبراء نامی" دو خون ریز جنگ قیس بن زہیر (قبیلۂ بنی قیس کا سردار) اور حذیفۂ ابن بدر (قبیلۂ بنی فزارہ کا سردار) کے درمیان ایک گھوڑ دوڑ کے سلسلہ میں رونما ہوئی اور مدتوں جاری رہی۔ داحس اور غبراء نامی دو گھوڑے تھے ایک قیس کا اور دوسرا حذیفہ کا تھا۔ قیس نے دعوا کیا کہ اس کا گھوڑا مسابقہ میں جیتا ہے اور حذیفہ نے دعوا کیا کہ اس کا گھوڑا مسابقہ میں بازی لے گیا ، اسی مختصر سی بات پر دونوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بہت زیادہ قتل اور خونریزی رونما ہوئی۔(۲) اور اس طرح کے واقعات "ایام العرب" کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور اس کے بارے میں کتابیں لکھی گئیں۔ البتہ کبھی چند اونٹ خون بہا کے طور پر دے کر مقتول کی دیت ادا کردی جاتی تھی۔ اور ہر قبیلہ کے بزرگ اس قسم کے مسائل کے لئے راہ حل تلاش کرتے اور اس کو قوم کے سامنے پیش کرتے تھے لیکن وہ اس کو قوم پر تھوپتے نہیں تھے۔ اور زیادہ تر قبائل ان تجاویز کو اس وقت قبول کرتے تھے جب طولانی جنگوں سے تھک اور ناامید ہوجاتے تھے تو ان تجاویز کو قبول کرلیتے تھے۔

اگر قاتل کا گروہ، خطاوار کو قصاص کے لئے مقتول کے سپرد کردیتا تو یہ جنگ رونما نہ ہوتی لیکن ان

---

(۱) محمد احمد جادالمولی بک، علی محمد البجاوی و محمد ابو الفضل ابراہیم، ایام العرب فی الجاہلیۃ، (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ص ۱۶۸ ـ ۱۴۲؛ رجوع کریں: ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر، ۱۳۹۹ھ.ق)، ج ۱، ص ۵۳۹ ـ ۵۲۳۔

(۲) عبد الملک بن ہشام، سیرۃ النبی، تحقیق: مصطفی السقائ(اور دوسرے لوگ)، (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج ۱، ص۳۰۷؛ یاقوت حموی، معجم البلدان، قاہرہ: مطبعۃ السعادۃ، ط ۱، ۱۳۲۳ھ.ق)، ج ۱، ص۲۶۸ لفظ (صاد) ـ ابن اثیر اور جاد المولی بک دونوں قیس کا گھوڑا جانتے تھے۔(الکامل فی التاریخ، ج ۱، ص ۵۸۲ـ ۵۶۶؛ ایام العرب، ص ۲۷۷ـ ۲۴۶)۔

کی نظروں میں ایسا کرنا ان کی عزت و وقار کے خلاف تھا اسی بنا پر وہ اپنے لئے بہتر سمجھتے تھے کہ خطاکار کو خود سزا دیں۔ کیونکہ بادیہ نشینوں کی نگاہ میں عزت اور آبرو کی حفاظت سب سے زیادہ اہم تھی اور وہ اپنے تمام اعمال میں اس بات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

ان کے درمیان جو قوانین اور دستورات رائج تھے وہ کم و بیش حجاز کے شہروں یعنی طائف، مکہ اور مدینہ میں بھی نافذ تھے۔ کیونکہ ان شہروں کے باشندے بھی اپنے سماج میں بادیہ نشینوں کی طرح مستقل اور آزاد رہتے تھے اور کسی کی پیروی نہیں کرتے تھے بادیہ نشینوں میں تعصب اور آبرو پرستی، بے حد اور مبالغہ آمیز تھی۔ لیکن مکہ میں کعبے کے احترام اور تجارتی مرکز ہونے کی بنا پر ایک حد تک متوسط تھی۔ (۱)

قرآن کریم اس قسم کے تعصب اور انتقام کی مذمت کرتا ہے اور نصرت اور حمایت کا معیار، حق و عدالت کو قرار دیتا ہے اور تاکید فرماتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ عدالت کو شدت کے ساتھ قائم کریں اگرچہ یہ عدالت والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

"اے ایمان والو! عدل و انصاف کے ساتھ قیام کرو اور اللہ کے لئے گواہی دو چاہے اپنی ذات یا اپنے والدین اور اقرباء کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جس کے لئے گواہی دینا ہے وہ غنی ہو یا فقیر اللہ دونوں کی حمایت کا تم سے زیادہ سزاوار ہے لہٰذا خبردار! خواہشات کا اتباع نہ کرنا تاکہ انصاف نہ کر سکو اور اگر توڑ مروڑ سے کام لیا یا بالکل کنارہ کشی کر لی تو یاد رکھو کہ اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے"۔ (۲)

---

(۱) بروکلمان، گزشتہ حوالہ، ص۸.

(۲) سورۂ نسائ، ٤، آیت ۱۲۵.

غارت گری اور آدم کشی

بدو عرب اپنے قبیلہ کے علاوہ دوسروں سے دوستی اور محبت نہیں کرتے تھے ان کا دائرہ فکر اور فہم صرف اپنے قبیلہ تک محدود ہوتا تھا یہ لوگ اس قدر متعصب اور قبیلہ پرست ہوتے تھے کہ دنیا کی ساری چیزیں صرف اپنے لئے چاہتے تھے اور سب سے زیادہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کا فائدہ چاہتے تھے جیسا کہ ان میں سے کسی نے زمانۂ اسلام میں اپنی جاہلیت کی تہذیب سے متاثر ہو کر اس طرح سے دعا کی، اے خدا! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے علاوہ کسی پر رحم نہ کر۔[۱]

ان میں صحرائی زندگی کی بنا پر جو محرومیت پائی جاتی تھی اس کی بنا پر وہ غارت گری کیا کرتے تھے کیونکہ ان کی سرزمین نعمتوں سے محروم تھی اور وہ اس کمی اور محرومیت کو لوٹ مار کے ذریعہ پورا کرتے تھے۔ رہزنی اور غارت گری کو نہ صرف یہ کہ برا فعل نہیں سمجھتے تھے بلکہ (جیسے آج کے دور میں ایک شہر یا صوبہ پر قبضہ کرلینے کو فخر سمجھتے ہیں) اپنے لئے باعث فخر اور شجاعت سمجھتے تھے۔[۲]

البتہ قبیلوں کے درمیان جو رقابت پائی جاتی تھی وہ بھی جنگ اور غارت کا سبب بنتی تھی اور زیادہ تر اختلافات اور جھگڑے، چراگاہوں پر قبضہ کرلینے کی بنا پر ہوتے تھے۔ اور کبھی قبیلہ کی سرداری کے انتخاب پر بھی رشتہ داروں کے درمیان جنگ و خونریزی ہوتی تھی۔ مثلاً اگر بڑا بھائی سرداری کے منصب پر فائز ہو اور مرجائے تو اس کے دوسرے بھائی اپنی عمر کے مطابق قبیلہ کی سرداری کے خواہاں رہتے تھے اور مرنے والی کی اولاد اپنے باپ کے مقام کی آرزومند ہوتی تھی۔ اسی بنا پر اکثر قبیلوں اور

---

(۲) اللهم ارحمنی و محمداً و لاترحم معنا احداً (صحیح بخاری، شرح و تحقیق: الشیخ قاسم الرفاعی، (بیروت: دار القلم)، ج۸، کتاب الادب، باب ۵٤۹، ح ۸۹۳، ص ۳۲۷، اور تھوڑے سے الفاظ کے اختلاف کے ساتھ: سنن ابی داؤد (بیروت: دار الفکر)، ج٤، کتاب الادب، باب "من لیست لہ غیبۃ"، ص ۲۷۱.)

(۳) گوستاولوبون، گزشتہ حوالہ، ص ٦۳.

رشتہ داروں کے درمیان جو کہ نسب اور محل سکونت کے لحاظ سے بہت قریب تھے، سخت اختلافات اور جھگڑے ہوتے تھے۔ شعراء بھی اپنے اشعار کے ذریعہ فتنہ کی آگ بھڑکایا کرتے تھے۔ وہ اشعار میں اپنے قبیلہ کے افتخارات کو بیان کرتے تھے اور دوسرے قبیلہ کے عیوب کو برملا کرتے تھے اور لوگوں کے ذہنوں میں گزشتہ باتوں کو تازہ کر کے ان کے دلوں میں کینہ اور لڑائی کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر ان کے درمیان لڑائیاں صرف معمولی اور چھوٹی بات پر ہوتی تھیں۔ جس وقت فتنہ کی آگ بھڑکتی تھی تو دونوں قبیلے ایک دوسرے کی جان کے پیاسے ہوجاتے تھے اور ایک دوسرے کو نابود کرنے کی فکر میں لگ جاتے تھے۔[۱]

وحشی گری اور تمدن سے دوری ان کی غارت گری کا ایک دوسرا سبب تھا۔ ابن خلدون کی نگاہ میں اس قوم کے لوگ وحشی تھے اور ان کے درمیان وحشی گری اس قدر پائی جاتی تھی کہ جیسے ان کے سرشت اور عادت میں رچ بس گئی ہو، مثال کے طور پر، کھانے کی دیگ بنانے کے لئے انھیں سنگ کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ اس کی خاطر عمارتوں کو مسمار کردیتے تھے تاکہ کھانے کی دیگ ان پتھروں سے بنائیں یا محلوں اور بڑی عمارتوں کو اس بنا پر ویران کردیتے تھے تاکہ اس کی لکڑی سے خیمہ بنائیں یا اس سے عمارتیں اور ستون خیمہ تیار کریں۔ غارت گری کی عادت ان میں اس قدر پائی جاتی تھی کہ جو بھی چیز وہ دوسروں کے ہاتھوں میں دیکھتے تھے اسے لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان کی روزیاں نیزوں کے بل پر فراہم ہوتی تھیں دوسروں کا مال چوری کرنے سے کبھی باز نہیں آتے تھے بلکہ ان کی نظر اگر کسی کے مال و ثروت یا وسائل زندگی پر پڑتی تھی تو اسے وہ لوٹ لیا کرتے تھے۔[۲]

ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ لوٹ اور غارت ہوا کرتا تھا جس وقت وہ کسی قبیلہ پر حملہ آور ہوتے تھے تو

---

(۱) حسن ابراہیم حسن، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۸.

(۲) مقدمہ ترجمۂ محمد پروین گنابادی، (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ط ٤، ١٣٦٢)، ج ۱، ص ٢٨٦ - ٢٨٥.

ان کے اونٹوں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا کرتے تھے۔

دوسرا قبیلہ بھی کمین گاہ میں بیٹھا اسی تاک میں لگا رہتا تھا اور اسے بھی جب موقع ملتا تھا یہی حرکت کر بیٹھتا تھا۔ اور جب دوسروں سے دشمنی نہیں ہوتی تھی تو آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ جیسا کہ قطامی (بنی امیہ کے پہلے دور کا) شاعر اپنے اشعار میں اس بات کا تذکرہ کرتا ہے:

ہمارا کام پڑوسیوں اور دشمنوں پر ہجوم اور غارت گری تھا اور اگر ہمیں کبھی کوئی نہ ملتا تو اپنے بھائی کا مال لوٹ لیا کرتے تھے۔[1]

اس زمانے میں جو جنگیں اوس اور خزرج نامی دو قبیلوںکے درمیان قصاص اور خونخواہی کی بنا پر شروع ہوئی تھیں وہ یثرب (مدینہ) میں اس قدر شدید اور زیادہ بڑھ گئی تھیں کہ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے علاقے یا جائے امن سے دور جائے ان لڑائیوں نے عرب کی زندگی کو مفلوج اور ان کی حالت کو پست کردیا تھا۔ قرآن مجید ان کی اس رقت بار حالت کو یاد دلاکر، اسلام کے سایہ میں جو ان کے درمیان بھائی چارگی قائم ہوئی اس کے بارے میں اس طرح سے ذکر کرتا ہے۔

"... اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم جہنم کے کنارے پر تھے تو اس نے تمہیں نجات دی اور اللہ اسی طرح اپنی آیتیں بیان کرتا ہے کہ شاید تم ہدایت یافتہ بن جاؤ"۔[2]

---

[1] و احیاناً علی بکر اخینا اذا مالم نجد الا اخانا۔

احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص۹؛ فیلیپ حتی، گزشتہ حوالہ، ص۳۵؛ حماسۃ ابی تمام حبیب اوس الطائی (کلکتہ: مطبع لیسی، ۱۸۹۵ئ)، ص ۳۲.

[2] سورۂ آل عمران، ۳، آیت ۱۰۳

حرام مہینے

صرف حرام مہینوں (ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں جو کہ جناب ابراہیم اور جناب اسماعیل کی دیرینہ سنت کی یاد اور ان کی بچی ہوئی تعلیمات میں سے تھی[(۱)] ان مہینوں کے احترام میں عربوں کے درمیان، آپس میں جنگ بندی (مقدس صلح) کا قانون پایا جاتا تھا۔ اور ان کو موقع ملتا تھا کہ وہ کچھ دن سکون سے رہیں اور تجارت اور کعبہ کی زیارت کر سکیں[(۲)] اور ان مہینوں میں کوئی جنگ ہوجاتی تھی تو اس کو "حرب الفجار" (ناروا اور گناہ آلود جنگ) کہتے تھے۔[(۳)]

عرب کے سماج میں عورت

جاہل عربوں میں جہالت اور خرافات کا ایک واضح نمونہ، عورت کے بارے میں ان کے مخصوص نظریات تھے۔ اس دور کے معاشرے میں عورت انسانیت کے معیار، سماجی حقوق اور آزادی

---

(۱) سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان (بیروت: موسسہ الاعلی للمطبوعات، ط ۲، ۱۳۹۱ھ.ق)، ج۹، ص ۲۷۲.

(۲) وہ لوگ مہینوں کے ناموں کو بدل کر کے حرام مہینوں کو پیچھے کردیتے تھے اور اپنے کو اس کے حد و حدود سے الگ کر کے حرام مہینے میں بھی جنگ و خونریزی کرتے تھے اسی مناسبت سے خداوند عالم نے فرمایا ہے: (محترم مہینوں میں تقدیم و تاخیر، کفر میں ایک قسم کی زیادتی ہے۔ جس کے ذریعہ کفار کو گمراہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سال اسے حلال بنالیتے ہیں اور دوسرے سال اسے حرام کردیتے ہیں تاکہ اتنی تعداد برابر ہو جائے جتنی خدا نے حرام کی ہے۔ اور حرام خدا حلال بھی ہو جائے ...)، (سورۂ توبہ، ۹، آیت ۳۷.)

(۳) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸۴ھ.ق)، ج۲، ص ۱۲؛ شہرستانی، الملل و النحل، (قم: منشورات الرضی، ط ۲)، ج۲، ص ۲۵۵.

سے بالکل محروم تھی۔ اور اس سماج میں گمراہی اور سماج کے وحشی پن کی بنا پر لڑکی اور عورت کا وجود باعث ذلت و رسوائی سمجھا جاتا تھا۔[۱] وہ لڑکیوں کو میراث کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ارث کے حقدار صرف وہ لوگ ہیں جو تلوار چلاتے ہیں اور اپنے قبیلہ کا دفاع کرتے ہیں۔[۲] ایک روایت کی بنا پر عرب میں عورت کی مثال اس مال جیسی تھی جو شوہر کے مرنے کے بعد (لڑکا نہ ہونے کی صورت میں) شوہر کے دوسرے اموال اور ثروت کی طرح سوتیلی اولاد کے پاس منتقل ہوجاتی تھی۔[۳]

واقعات گواہ ہیں کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کا بڑا لڑکا اگر اس عورت کو رکھنے کا خواہش مند ہوتا تھا (یعنی اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا) تو اس کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیتا تھا اور اس طریقہ سے میراث کے طور پر عورت اسے مل جایا کرتی تھی اس کے بعد اگر وہ چاہتا تھا تو اسے بغیر کسی مہر کے، صرف میراث ملنے کی بنا پر اس سے شادی کرلیتا تھا اور اگر اس سے شادی کا خواہش مند نہ ہوتا تو دوسروں سے اس کی شادی کردیتا تھا اور اس عورت کا مہر خود لے لیتا تھا۔ اور اس کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ اسے ہمیشہ کے لئے دوسرے مردوں سے شادی کرنے سے منع کردے، یہاں تک وہ مرجائے اور اس کے مال کا مالک بن جائے۔[٤]

---

(۱) سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان (قم: مطبوعاتی اسماعیلیان، ط۳، ۱۳۹۳ھ.ق)، ج۲، ص۲٦۷۔

(۲) ابوالعباس المبرد، الکامل فی اللغۃ و الادب، مع حواشی: نعیم زرزور (اور) تغارید بیضون (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ط۱، ١٤٠۷ھ.ق)، ج۱، ص ۳۹۳؛ محمد بن حبیب، المحبر (بیروت: دارالافاق الجدیدۃ)، ص ۳۲٤۔

(۳) کلینی، الفروع من الکافی، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط۲، ۱۳٦۲)، ج٦، ص ٤٠٦.

(٤) طباطبائی، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ۲۵۸۔ ۲۵٤؛ سیوطی، الدرالمنثور فی التفسیر بالماثور، (قم: مکتبۃ آیۃ اللہ مرعشی نجفی، ١٤٠٤ھ.ق)، ج۲، تفسیر آیۂ ۲۲ سورۂ نسائ، ص ۱۳۲۔ ۱۳۱؛ شہرستانی، الملل و النحل (قم: منشورات الرضی، ط۲)، ج۲، ص ۲۵٤؛ حسن، حسن، حقوق زن در اسلام و یورپ (ط۷، ۱۳۵۷)، ص۳٤۔ عرب اس شخص کو "ضیزن" کہتے تھے جو باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کو اپنی بیوی بنالیتا تھا۔ (محمد بن حبیب، المحبر، ص ۳۲۵)، ابن قتیبہ دینوری نے اس قسمکی عورتوں کی تعداد کو ذکر کیا ہے، جنھوں نے شوہر کے مرنے کے بعد اپنے لڑکوں سے شادی کرلی تھی (المعارف، تحقیق: ثروۃ عکاشہ، قم: منشورات الرضی، ص ۱۱۲.)

چونکہ باپ کی بیوی سے شادی کرنا اس وقت قانوناً منع نہیں تھا۔ لہٰذا قرآن کریم نے ان کو اس کام سے منع کیا[۱]۔ دور اسلام میں مفسرین کے کہنے کے مطابق ایک شخص جس کا نام "ابو قبس بن اسلت" تھا جب وہ مرگیا تو اس کے لڑکے نے چاہا کہ اپنے باپ کی بیوی کے ساتھ شادی کرے تو خدا کی جانب سے یہ آیت نازل ہوئی ﴿لایَحِلُّ لَکُمْ اَن تَرِثُوْا النِّسَائَ...﴾،[۲] تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم عورت کو ارث میں لو۔

اس سماج میں متعدد شادیاں بغیر کسی رکاوٹ کے رائج تھیں۔[۳]

عورت کی زبوں حالی (ٹریجڈی)

یہ بات مشہور ہے کہ عربوں میں سب سے بری رسم یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے۔ کیونکہ لڑکیاں ایسے سماج میں جو تہذیب اور تمدن سے دور، ظلم و بربریت میں غرق ہو، مردوں کی طرح لڑکر اپنے قبیلہ سے دفاع نہیں کرسکتی تھیں کیونکہ لڑنے کی صورت میں یہ ممکن تھا لڑکیاں دشمن کے ہاتھ لگ جائیں اور ان سے ایسی اولادیں پیدا ہوں جو باعث ننگ اور عار بنیںلہٰذا وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے[٤] اور کچھ لوگ مالی مشکلات کی خاطر، فقر و افلاس کے خوف

---

(۱) "ولاتنکحوا ما نکح آبائکم من النسائ"(سورۂ نسائ، ٤، آیت ۲۲.)

(۲) طباطبائی، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ۲۵۸؛ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن (بیروت: دارالمعرفہ، ط ۲، ۱۳۹۲ھ.ق)، ج٤، ص ۲۰۷؛ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۹ کی تفسیر کے ذیل میں۔

(۳) طباطبائی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲٦۷۔

(٤) شیخ عباس قمی، سفینۃ البحار (تہران: کتابخانۂ سنایی، ج۱)، ص ۱۹۷ (کلمۂ جہل)؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء العربیہ، ۱۹٦۱ئ)، ج۱۳، ص ۱۷٤؛ کلینی ، الاصول من الکافی، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ج۲، باب "البر بالوالدین"، ح۱۸، ص ۱٦۳؛ قرطبی، تفسیر جامع الاحکام (بیروت: دار الفکر)، ج۱۹، ص ۲۳۲۔

سے ایسا کرتے تھے۔[۱]

مجموعی طور پر لڑکیاں اس سماج میں منحوس سمجھی جاتی تھیں قرآن کریم نے ان کی اس غلط فکر کو اس طرح سے نقل کیا ہے:

"اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ خون کے گھونٹ پینے لگتا ہے، قوم سے منھ چھپاتا ہے کہ بہت بری خبر سنائی گئی ہے اب اس کو ذلت سمیت زندہ رکھے یا خاک میں ملادے، یقینا یہ لوگ بہت برا فیصلہ کر رہے ہیں"۔[۲]

عورت کو محروم اور دبانے کی باتیں اس زمانے کے عربی ادب اور آثار میں بہت زیادہ ملتی ہیں جیسا کہ ان کے درمیان یہ بات عام تھی کہ جس کے پاس لڑکی ہوتی تھی اس سے وہ لوگ کہتے تھے کہ "خدا تم کو اس کی ذلت سے محفوظ رکھے اور اس کے اخراجات کو پورا کرے اور قبر کو داماد کا گھر بنادے۔[۳]

ایک عرب شاعر نے اس بارے میں کہا ہے:

جس باپ کے پاس لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ رکھنا چاہے تو اس کے لئے تین داماد ہیں: ۱)ایک وہ گھر جس میں وہ رہتی ہے۔ ۲)دوسرے اس کا شوہر جو اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ۳)اور تیسرے وہ قبر جو اس کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ لیکن ان میں سب سے بہتر قبر ہے۔[٤]

---

(۱) سورۂ انعام، ٦، آیت ۱۵۱؛ سورۂ اسرائ، ۱۷، آیت ۳۱؛ قرطبی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳۲۔

(۲) سورۂ نحل، ۱٦، آیت ۵۹۔ ۵۸۔

(۳) آمنکم اللہ عار ھا و کفاکم مؤنتھا، وصاھرتم القبر!

(٤) لکل اب بنت یرجی بقائھا

ثلاثۃ اصھار اذا ذکرو الصھر

فبیت یغطیھا و بعل یصونھا

و قبر یواریھا و خیرھم القبر!

(عائشہ عبد الرحمن بنت الشاطی، موسوعۃ آل النبی (بیروت: دار الکتاب العربیہ، ۱۳۸۷ھ.ق، ص ٤۳۵.)

کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام ابوحمزہ تھا وہ صرف اس وجہ سے اپنی بیوی سے ناراض ہوگیا اور پڑوسی کے یہاں جاکر رہنے لگا کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کی بیوی اپنی بچی کو لوری دیتے وقت یہ اشعار پڑھتی تھی۔

ابو حمزہ کو کیا ہوگیا ہے کہ جو ہمارے پاس نہیں آتا ہے اور پڑوسی کے گھر میں رہ رہا ہے وہ صرف اس بنا پر ناراض ہے کہ ہم نے لڑکا نہیں جنا! خدا کی قسم یہ کام میرے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے جو بھی وہ ہم کو دیتا ہے ہم اسے لے لیتے ہیں۔ ہم بمنزلۂ زمین ہیں کہ کھیت میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔ [۱]

حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اس کی ماں کی باتیں اس سماج کے نظام کے خلاف ایک احتجاج ہیں اور ان کے درمیان عورت کی پائمالی کا ایک طرح سے اظہار ہے۔

سب سے پہلا قبیلہ جس نے اس غلط رسم کی بنیاد ڈالی، وہ قبیلۂ "بنی تمیم" تھا کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ نے نعمان بن منذر کو ٹیکس دینے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے ان کے درمیان جنگ ہوئی جس میں بہت ساری لڑکیاں اور عورتیں اسیر کرلی گئیں جس وقت بنی تمیم کے نمائندے اسیروں کو چھڑانے کے لئے نعمان کے دربار میں حاضر ہوئے تو اس نے یہ اختیار خود ان عورتوں کو دیدیا کہ چاہیں تو حیرہ میں رہیں اور چاہیں تو بنی تمیم کے پاس چلی جائیں۔ قیس بن عاصم جو کہ قبیلہ کا سردار تھا اس کی لڑکی بھی اسیروں کے درمیان تھی اس نے ایک درباری سے شادی کرلی تھی لہٰذا اس نے دربار میں رکنے کا

---

(۱) ما لابی حمزة لایأتینا

یظل فی البیت الذی یلینا

غضبان الا نلد البنینا

تاللہ ما ذالک فی ایدینا

وانما نأخذ ما أعطینا

و نحن کالارض لزارعینا

ننبت ما قدزرعوہ فینا

(جاحظ، البیان والتبیین، بیروت: داراحیاء التراث العربی، ۱۹۶۸ئ، ج ۱، ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۷؛ عایشہ بنت الشاطی، گزشتہ حوالہ، ص ۴۳۴ ۔ ۴۳۳؛ آلوسی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، ج۳، ص ۵۱.

فیصلہ کرلیا، قیس اس بات سے سخت ناراض ہوا اور اس نے اسی وقت عہد کرلیا کہ اس کے بعد وہ اپنی لڑکیوں کو قتل کر ڈالے گا،[1] اور اس نے یہ کام انجام دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ رسم دوسرے قبیلوں میں بھی رائج ہوگئی، کہا جاتا ہے کہ اس جرم اور جنایت میں قیس، اسد، ہذیل اور بکر بن وائل نامی قبیلے شامل تھے۔[2]

البتہ یہ رسم عام نہیں تھی کچھ قبیلے اور بڑی شخصیتیں اس کام کی مخالف تھیں، ان میں سے جناب عبد المطلب پیغمبر اسلا ﷺ م کے جد تھے جو اس کام کے شدید مخالف تھے،[3] اور کچھ لوگ جیسے زید بن عمرو بن نفیل اور صعصعہ بن ناجیہ، لڑکیوں کو ان کے باپ سے فقر کے خوف سے زندہ درگور کرتے وقت لے لیتے تھے اور ان کو اپنے پاس رکھتے تھے۔[4] اور کبھی لڑکیوں کے عوض میں ان کے باپ کو اونٹ دیدیا کرتے تھے۔[5] لیکن واقعات گواہ ہیں کہ یہ رسم عام طور پر رائج تھی، کیونکہ:

۱۔ صعصعہ بن ناجیہ نے زمانۂ اسلام میں پیغمبر ﷺ سے کہا تھا کہ میں نے دور جاہلیت میں ۲۸۰ لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا ہے[6]

---

(۱) ابو العباس المبرد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۹۲؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۳، ص ۱۷۹۔

(۲) ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۳، ص ۱۷٤۔

(۳) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۲٤؛ تاریخ یعقوبی، (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۱۰

(٤) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤٥، ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، تحقیق: مصطفی السقاء (اور دوسرے لوگ) (تہران: آفسٹ، مکتبۃ الصدر)، ج۱، ص ۲٤۰۔

(٥) محمد ابو الفضل ابراہیم (اور ان کے معاونین)، قصص العرب (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط٤)، ج۲، ص ۳۱؛ ابو العباس المبرد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۹٤؛ فرزدق کے جد، صعصعہ، عصر اسلام کے شاعر تھے اور وہ اپنے جد کے اس فعل پر افتخار کرتے تھے اور کہتے تھے: و منا الذی منع الوائدات فأحیا الوئید فلم یوأد۔ (قرطبی، تفسیر جامع الاحکام، ج۱۹، ص ۲۳۲)۔

(٦) ابو العباس المبرد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۹٤

۲۔قیس بن عاصم نے عہد کرنے کے بعد (جیسا کہ پہلے گزر چکا) اپنی ۱۲ یا ۱۳ لڑکیوں کو قتل کیا۔[۱]

۳۔پیغمبر اسلا ﷺ م نے پہلے پیمان عقبہ میں (بعثت کے بارہویں سال) جو کہ یثربیوں کے ایک گروہ کے ساتھ کیا تھا، معاہدہ کی ایک شرط یہ قرار دی کہ لڑکیوں کو زندہ درگور نہ کریں۔[۲]

٤۔فتح مکہ کے بعد پیغمبر اکر ﷺ م نے خدا کے حکم سے اس شہر کی مسلم عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ شرط رکھی تھی کہ اپنی لڑکیوں کو قتل کرنے سے پرہیز کریں۔[۳]

۵۔قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس رسم کی شدید مذمت فرمائی ہے۔ لہٰذا ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسئلہ اس سماج کی سب سے بڑی مشکل تھی جس کے بارے میں قرآن کریم نے خبردار کیا ہے۔

۱۔ اور خبردار! اپنی اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو کہ ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی رزق دیتے ہیں بیشک ان کا قتل کردینا بہت بڑا گناہ ہے۔[٤]

---

(۱) ابن اثیر، اسد الغابہ (تہران: المکتبۃ الاسلامیہ، ۱۳۳٦)، ج٤، ص ۲۲۰ (شرح حال قیس بن عاصم) منقول ہے کہ قیس عصر اسلام میں مسلمان ہوئے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا: زمانۂ جاہلیت میں، میں نے اپنی آٹھ لڑکیوںکو زندہ درگور کردیا تھا اب اس فعل کا جبران کیسے کروں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کے بدلے ایک غلام آزاد کرو۔ اس نے کہا: میرے پاس بہت اونٹ ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک کے بدلے اونٹ کی قربانی بھی کر سکتے ہو۔ (قرطبی، تفسیر جامع الاحکام، ج۱۹، ص ۲۳۳.)

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۷۵.

(۳) "یا ایھا النبی اذا جائک المؤمنات یبایعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئاً ولایسرقن و لایزنین و لا یقتلن اولادھن و لایأتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن و ارجلھن ولایعصینک فی معروف فبایعھن واستغفر لھن ان اللہ غفور رحیم۔" (سورۂ ممتحنہ،٦۰،آیت ۱۲.)

(٤) سورۂ اسرائ،۱۷، "ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطأ کبیراً، آیت ۳۱.

۲۔ اور اسی طرح ان شریکوں نے بہت سے مشرکین کے لئے اولاد کے قتل کو بھی آراستہ کردیا ہے تاکہ ان کو تباہ و برباد کردیں اور ان پر دین کو مشتبہ کردیں۔[۱]

۳۔ یقینا وہ لوگ خسارہ میں ہیں جنھوں نے حماقت میں بغیر جانے بوجھے اپنی اولاد کو قتل کردیا۔[۲]

٤۔ اپنی اولاد کو غربت کی بنا پر قتل نہ کرنا کہ ہم تمھیں بھی رزق دے رہے ہیں اور انھیں بھی۔[۳]

٥۔ اور جب زندہ درگور لڑکیوںکے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ انھیں کس گناہ میں مارا گیا ہے۔[٤]

---

(۱) سورۂ انعام، ٦، (وَكَذٰلِکَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلاَدِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ) آیت ۱۳۷.

(۲) سورۂ انعام، ٦،(قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا اَوْلاَدَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ)آیت ۱٤۰.

(۳)سورہ انعام،٦،(وَلاَتَقْتُلُوا اَوْلاَدَكُمْ مِنْ اِمْلاَقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُم)آیت ۱٥۱.

(٤) سورۂ تکویر، ۸۱،(واذالمؤودة سئلت بای ذنب قتلت) آیت ۹۔ ۸.

دوسری فصل

عربوں کے صفات اور نفسیات

متضاد صفات

بدو عرب میں وحشیانہ عادت اور لوٹ مار کے باوجود اچھی عادتیں، جیسے عفو و کرم، مہمان نوازی، شجاعت اور دلیری بھی پائی جاتی تھی۔ خاص طور سے وہ اپنے وفائے عہد و پیمان کے شدید پابند تھے یہاں تک کہ اپنے عہد و پیمان کی خاطر اپنی جان کی بازی لگادیتے تھے۔ اور یہ ان کی سب سے نمایاں صفت شمار ہوتی تھی۔ ان کے اندر متضاد صفات کو دیکھ کر لوگ حیرت و استعجاب میں پڑ جاتے تھے۔ اور وہ ایسے دور دراز علاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے جو دنیا میں کم نظیر تھا۔ اگر ان کے حالات زندگی ایسے نہ ہوتے تو اس بات کا سمجھنا بہت مشکل تھا۔ وہی لڑاکو عرب جو لوٹ مار کے پیاسے تھے جس وقت ان کے اندر انتقام کی آگ بھڑکتی تھی تو وہ بدترین جرائم کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اپنے گھر میں بہت بڑے مہمان نواز، مہربان اور مونس تھے۔ اگر ایک کمزور اور بے چارہ، ان سے پناہ مانگتا تھا یا ایک ستمدیدہ (اگرچہ دشمن ہی کیوں نہ ہو) ان کی طرف دست نیاز دراز کرتا تھا یا اس کو اپنی پناہ گاہ سمجھتا تھا تو اس کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے کہ گویا وہ شخص، ان کے خاندان یا قبیلہ کا ایک فرد ہے. اور کبھی تو اس کا دفاع

کرنے میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے تھے۔(۱)

میدان جنگ میں شجاعت و دلیری عفو و درگزر، قبیلہ کے سامنے تسلیم اور ایسے ظالموںسے انتقام لینے میں، جنھوں نے اس کے یا اس کے رشتہ داروں کے حقوق کو پائمال کردیا تھا بے رحمی کے ساتھ پیش آنا عرب کی شرافت اور فضیلت سمجھی جاتی تھی۔(۲)

عربوں کی اچھی صفتوں کی بنیاد

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ عربوں کے درمیان اگرچہ پانی اور چراگاہوںکے بارے میں رقابت اکثر کشمکش کا باعث بنتی تھی اور قبائل کوایک دوسرے کے ساتھ الجھا اور کشت و کشتار پر مجبور کردیتی تھی۔ لیکن دوسری طرف سے ان کے اندر کمزوری اور عاجزی کے احساس نے ہی ان کے مزاج کی سختی اور لجاجت کے مقابلہ میں اس فکر کو ہوا دی تھی کہ سبھی ایک مقدس رسم کے محتاج ہیں۔ اور ایسی سرزمین میں جہاں مہمان سرائیں اور مسافر خانے نہ ہوتے ہوں، مہمانوں کی ضیافت سے بچنا ان کے اخلاق اور عزت کے خلاف تھا۔ عہد جاہلیت کے شعراء ہمارے زمانے کے صحافیوں کا رتبہ رکھتے تھے۔ان کی بہادری اوردلیری کے ساتھ ان کی مہمان نوازی، قوم عرب کی نمایاں فضیلت شمار کی جاتی تھی ۔ اور اس کے بارے میں وہ اشعار کہا کرتے تھے اور پڑھتے تھے۔(۳)

---

(۱) ڈاکٹر گوستاولوبون، تمدن اسلام و عرب، ترجمہ: سید ہاشم حسینی، ص ٦٥۔ ٦٤؛ ویل ڈورانٹ، اس بارے میں لکھتا ہے:"عرب کے بدو، مہربان بھی تھے اور خونخوار بھی، سخی بھی تھے اور کنجوس بھی، خیانت کار بھی تھے اورامین بھی، محتاط بھی تھے اوربہادر بھی، اگرچہ فقیر تھے لیکن دنیا میں کرم و بزرگی سے پیش آتے تھے"تاریخ تمدن، ترجمہ: ابوطالب صارمی (تہران: سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، ط ۲،)، ج ٤، ص ۲۰۱.

(۲) احمد امین، فجر الاسلام، (قاہرہ: مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ط ۹، ١٩٦٤م)، ص ٧٦.

(۳) فلیپ حتی، تاریخ عرب، ترجمہ: ابوالقاسم پاینده، (تہران: آگاہ، ط ۲، ١٣٦٦)، ص ٣٥۔ ٣٣.

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کی بہت ساری اچھی خوبیاں جیسے شجاعت، مہمان نوازی، کرم اورپناہ گزینوں کی حمایت (جیسا کہ بعد میں اسلامی تعلیم اور کلچر میں یہ چیزیں ذکر ہوئی ہیں) روحانی اور انسانی اقدار سے نشأت نہیں پائی ہیں۔ بلکہ معاشرتی اسباب اور جاہلی کلچر جیسے قبیلوں کے درمیان فخر و مباہات کی بنا پر تھیں۔ کیونکہ ایسے ماحول میں جہاں پر نظم و امنیت نہ ہو، شجاعت اور دلیری ان کی زندگی کا لازمہ تھی۔ نام و نمود سے دلچسپی، منصب کی آرزو و تمنا، شعراء کی مذمت کا خوف، ذلت و رسوائی اور بدمزاجی وغیرہ نے عربوں کو جود و سخاوت، وفائے عہد، پناہ گزینوں کی حمایت اور اس طرح کی دوسری اچھائیوں پر اکسایا تھا۔ مہمان نوازی اور دلیری کی عادتیں ایسے ماحول میں کہ جہاں لوگ مال و اولاداور جنگجوؤں کی کثرت تعداد پر فخر کیا کرتے تھے۔ ان کی سربلندی اور عزت کا وسیلہ بن گئی تھی اور یہ بات اس کے لئے واضح ہے جو تاریخ اسلام سے آگاہ ہے۔[۱]

جہالت اور خرافات

حجاز کے عرب جو عموماً صحرا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ تہذیب اور کلچر سے دور فکری جمود میں اس طرح سے گرفتار ہو گئے تھے کہ بہت سی چیزوں کے درمیان موجود نسبت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ چیزوں کی منطقی تحلیل اور تجزیہ نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی علت و معلول کے درمیان موجود رابطے کو پوری طرح سے سمجھ سکتے تھے۔ مثلاً اگر ایک شخص مریض ہوگیا اور تکلیف جھیل رہا ہے تو اسکے اطراف کے لوگ اس کے لئے دوا تجویز کرتے تھے اور وہ اس درد و درمان کے درمیان ایک طرح کا ربط سمجھتا تھا لیکن یہ فہم، دقیق اور تحلیلی نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کے قبیلہ کے لوگ اس دوا کو فلاں درد میں استعمال کرتے ہیں۔ بطور نمونہ وہ آسانی سے یہ بات مان لیتا تھا کہ قبیلہ کے سردار کا خون ہادی نامی

---

(۱) رجوع کریں: جعفر مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، (قم: ۱۴۰۲ھ.ق)، ج۱، ص ۵۴۔ ۵۰.

مسری بیماری (جو عموماً کتے کے کاٹنے سے پیدا ہوتی ہے) کا علاج کرتا ہے اسی طرح وہ یہ تصور کرتا تھا کہ بیماری کی وجہ، روح کی کثافت ہوا کرتی ہے جو بیمار کے اندر داخل ہوجاتی ہے اسی بنا پر یہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ وہ روح، بیمار کے بدن سے نکل جائے، یا اگر کسی کے بارے میں پاگل ہو جانے کا خطرہ ہوتا تھا تو اس کی گردن میں مردار کی ہڈی یا غلاظت مل دیا کرتے تھے تاکہ وہ جنون سے محفوظ رہ سکے۔ دیو کا عقیدہ بھی ان کے یہاں ملتا ہے وہ معتقد تھے کہ بھیانک شکلیں رات کے وقت خالی مکانوں میں دکھائی پڑتی ہیں یا بیابانوں میں لوگوں کے راستے میں حائل ہوجاتی ہیں اور ان کو آزار و اذیت پہنچاتی ہیں۔

جس وقت وہ اپنے مویشیوں کو پانی پلانے کے لئے گھاٹ پر لے جاتے تھے تو اگر وہاں پر وہ پانی نہیں پیتے تھے تو یہ خیال کرتے تھے کہ ان کے سینگ کے درمیان ایک دیو بیٹھا ہے جو انھیں پانی نہیں پینے دیتا ہے لہٰذا وہ دیو کو بھگانے کے لئے ان مویشیوں کے سر اور منھ پر ڈنڈے مارا کرتے تھے۔[۱] اس قسم کی مضحکہ خیز حرکتیں ان کے درمیان بہت زیادہ رائج تھیں۔

وہ اس طرح کی حرکتوں کے بارے میں (جب کہ یہ حرکتیں ان کے قبیلہ کے اندر پائی جاتی ہوں) زرّہ برابر بھی شک و تردید نہیں کرتے تھے کیونکہ انکار اور تردید کی وجہ، دقت نظر، بیماری کی تحقیق کی صلاحیت، اسباب و عوارض اور ان کا علاج وغیرہ ہے جبکہ اس زمانہ میں عرب، جہالت میں زندگی بسر کر رہے تھے اور اس حد تک فہم و فراست ان کے اندر نہیں پائی جاتی تھی۔[۲]

البتہ کبھی جاہلیت کے اشعار یا اس زمانے کے محاورے یا ان کی داستانوں میں روشن فکری کے اشارے اور علت و معلول کے درمیان میں ارتباطات کی باتیں ملتی ہیں ۔ لیکن وہ بھی عمیق تفکر، تشریح اور تجزیہ کے قابل نہیں ہیں۔ اور چیزونکے بارے میں تجزیہ کی صلاحیت کے نہ ہونے کا اصل راز

---

(۱) محمود شاکری آلوسی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، تصحیح: محمد بہجۃ الاثری (قاہرہ: دار الکتب الحدیثۃ ط۳)، ج۲، ص ۳۰۳.

(۲) جاہل عربوں کی خرافات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں: بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، ج۲، ص ۳۶۷- ۳۰۳؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ)، ج۱۹، ص ۴۲۹- ۳۸۲-

ان کے درمیان موجود مختلف طرح کے موہومات اور خرافات تھے جنھیں وہ یقین کرتے تھے۔ اور اس طرح کے باور سے عرب اور اسلام کی تاریخی کتابیں پر ہیں۔ (۱)

علم و فن سے عربوں کی آگاہی

بعض دانشوروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ عربوں کے یہاں مختلف طرح کے علوم جیسے طب، ستارہ شناسی، قیافہ شناسی (۲) وغیرہ پائے جاتے تھے لیکن یہ دعوا مبالغہ آمیز ہے۔ عربوں کی آگاہی ان علوم و فنون سے ایک علم و فن کی حد تک منظم و مرتب شکل میں نہیں تھی بلکہ ایک سطحی اور بکھری ہوئی معلومات کی شکل میں تھی جو ان کو حدس و گمان اور قبیلہ کے بڑے بوڑھے مرد اور عورتوں سے سن سنا کر حاصل ہوئی تھیں۔ لہٰذا اس طرح کی معلومات کو "علم" نہیں کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً ستارہ شناسی کے سلسلے میں عربوں کی آگاہی صرف بعض ستاروں کے وقت طلوع اور غروب تک محدود تھی وہ بھی صرف اس بنا پر تھی کہ اس وسیع و عریض صحرا میں راستوں کی تلاش یا شب و روز کے اوقات کو معلوم کرسکیں۔ طب کے بارے میں ان کی آگاہی، ابن خلدون کے کہنے کے مطابق اس طرح سے تھی:

طب کے بارے میں معلومات عام طور سے بعض لوگوں میں مختصر اور محدود تجربات کی بنیاد پر تھی اور علم طب وراثتی طور پر قبیلہ کے بڑے بوڑھوں کے ذریعہ نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے ان کی اولاد تک پہنچ جاتا تھا۔ اور کبھی کبھار بعض مریض اس علاج کے ذریعہ ٹھیک بھی ہوجایا کرتے تھے۔ لیکن وہ معالجہ نہ طبی قانون کے مطابق ہوا کرتا تھا اور نہ ہی انسان کے مزاج اور فطرت کے مطابق۔ (۲) حارث بن کلدہ کی طبابت بھی اسی طرح کی تھی۔

---

(۱) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۸۲، ۲۶۱۔ ۲۲۳؛ اور ۳۲۷.

(۲) مقدمہ، ترجمہ: محمد پروین گنابادی، (تہران: مرکز انشارات علمی و فرہنگی، ۱۳۶۲، ط ٤)، ج۲) ص ۱۰۳٤۔

امی لوگ

اہل حجاز قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق "امی" یعنی نومولود بچہ کے مانند ہمیشہ جاہل اور ان پڑھ ہوا کرتے تھے۔ اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

بلاذری اس بارے میں لکھتا ہے:

ظہور اسلام کے وقت صرف ۱۷ افراد قریش میں اور یثرب (مدینہ) میں دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج کے درمیان ۱۱، افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔[۱]

جبکہ قریش مکہ میں ایک خاص مقام اور درجہ رکھتے تھے اور تجارت کے پیشہ میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس وجہ سے یہ کیسے باور کیا جاسکتاہے کہ وہ قوم جو اس حد تک جہالت اور نادانی میں ڈوبی ہو اس کے پاس اس قسم کے علوم ہوں جس کا بعض دانشوروں نے دعوی کیا ہے؟!

شعر

عہد جاہلیت کے عربوں میں صرف ایک اہم خوبی پائی جاتی تھی کہ وہ شعر او رخطابت میں مہارت رکھتے تھے ان کے یہاں، شاعر ایک مورخ، ماہر نساب، ھجاگر، عالم اخلاق، صحافی، پیشین گوئی کرنے والا اور جنگ کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔[۲] اس زمانے میں عرب کے بڑے شعراء کی موسمی بازاروں میں جیسے عکاظ، ذی المجاز اور مجنہ[۳] میں تجارتی اور ادبی آثار کی موسمی اور عمومی نمائشیں لگتی تھیں جس میں

---

(۱) فتوح البلدان، (قم: منشورات مکتبۃ الارمیہ، ۱٤٠٤ھ.ق)، ص ٤٥٩- ٤٥٧.

(۲) ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن، ج٤، عصر ایمان (بخش اول)، ترجمہ ابو طالب صارمی (تہران: سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی ط۲)، ص ۲۰۲.

(۳) اس بازار کے بارے میں رجوع کریں: بلوغ الارب، ج۲، ص ۲۷۰- ۲٦٤

شعراء اپنے عمدہ اشعار اور قصیدوں کو پیش کیا کرتے تھے اور اس میں سے جس کے اشعار منتخب ہوتے تھے وہ اور اس کے قبیلہ والے اسے اپنے لئے باعث فخر و عزت سمجھتے تھے اور اس کے اشعار کو اہمیت او راعزاز کے طور پر خانہ کعبہ کی دیوار پر لٹکادیا جاتا تھا "معلقات سبعہ" سات بہترین، فصیح و بلیغ اور عمدہ قصیدے سات عظیم شاعر کے تھے جس کی مثال اور نظیر اس زمانہ میں نہیں ملتی تھی۔ لہٰذا انھیں دیوار کعبہ پر لٹکادیا گیا تھا۔(۱) اور اسی وجہ سے انھیں معلقات سبعہ (سات عدد لٹکے ہوئے قصیدے) بھی کہا جاتا تھا۔

عرب کے اشعار اپنے تمام تر لفظی حسن کے باوجود تہذیب و ثقافت کے نہ ہونے کی بنا پر بلندی فکر سے خالی ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ کے اشعار کے عناوین، زیادہ تر عشق، شراب، عورت، جنگ اور قومی مسائل ہوا کرتے تھے۔ او راس میں لفظی جذابیت او رادبی نزاکتیں پائی جاتی تھیں۔

عرب اور ان کے پڑوسیوں کی تہذیب

علم و ہنر کے لحاظ سے عرب کے حالات کا تجزیہ کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عرب کے جاہل اس زمانہ کے دو متمدن پڑوسی ملک یعنی ایران اور روم کے ساتھ تجارتی روابط اور مبادلہ کی بنا پر وہاں کے تمدن سے بہرہ مند تھے؟ او رکیا یہ روابط اور تعلقات ان کی زندگی میں انقلاب کا باعث بنے تھے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں یہ یاددہانی کرانی چاہیئے کہ حجاز کے لوگ اس علاقے کی قدرتی اور جغرافیائی صورت حال کے لحاظ سے نہ صرف سیاسی اعتبار سے اس زمانے کی حکومتوںکے اثر و رسوخ سے دور تھے بلکہ تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے بھی ان کے دائرہ نفوذ سے خارج رہے ہیں عربوں کے لئے پڑوسی ملکونکی تہذیب اور کلچر سے متاثر ہونے کے صرف تین راستے تھے:

۱۔ تجارت ۲۔ ایران و روم کے زیر نفوذ حکومتیں (حیرہ او رغسان) ۳۔ اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ اثرات کس حد تک تھے۔ اس سلسلہ میں بعض مورخین کے

---

(۱) رجوع کریں: معلقات سبع، ترجمہ: عبد المحمد آیتی، تہران: سازمان انتشارات اشرفی، ط۲، ۱۳۵۷)

تاثرات مبالغہ آرائی سے خالی نہیں ہیں، جیسا کہ بعض نے کہا ہے:

قبائل عرب کے تعلقات ایران اور روم کے ساتھ ہونے کی بنا پر ایک حد تک وہ ان دونوں ملکوںکے کلچر اور تہذیب سے واقف ہوگئے تھے۔ عرب کے لوگ جب بھی تجارت کے لئے ایران اور روم جایا کرتے تھے تو ان دونوں ملکوں میں تہذیب اور کلچر کے نمونہ دیکھتے تھے۔ اور متوجہ ہوتے تھے کہ ایرانیوں اوررومیوں کی زندگی، عربوں کی زندگی سے کتنا فرق کرتی ہے۔ جیسا کہ ان کے آثار کو واضح طور پر زمانۂ جاہلیت کے اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے اس کے علاوہ مسافر اور تاجر حضرات بہت سارے الفاظ اور قصوں کو ایران او روم کی سرزمین سے عربوں کے لئے تحفہ کے طور پر لیجاتے تھے اور اس کے ضمن میں ایرانیوں اور رومیوں کے بعض عقائد اور افکار بھی ان تک پہنچ جاتے تھے۔[1]

لیکن یہ خیال رہے کہ ان دونوں ملکوں میں حجاز کے تاجروںکی آمد و رفت بہت زیادہ ہونے کے باوجود ان کے تمدن اور فکری ارتقاء میں مؤثر نہیںبن ہوسکی کیونکہ ان تمدنوںکی روشنی بہت ہی تنگ راہ گزر سے پہنچتی تھی اور کبھی تودوسروں سے منقول باتوں میں تحریف پائی جاتی تھی ۔ جیسا کہ بعض واقعات جوایرانیوں او رومیوں کے سلسلے میں نقل کئے گئے ہیں ان میں تحریف پائی گئی ہے درحقیقت اس زمانہ کے عرب، علم و دانش کو اپنے پڑوسیوں سے حاصل نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ اس سلسلے میں ان کے لئے رکاوٹیں درپیش تھیں کہ جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ قدرتی رکاوٹ: جیسے پہاڑ، سمندر، صحراء وغیرہ جس کی بنا پرپڑوسیوں سے عربوں کے رابطے دشوار او رمشکل ہوگئے تھے۔

۲۔ عربوں کی اجتماعی زندگی اور عقلی و فکری سطح: اس زمانے کے ایرانیوں اور رومیوں سے

---

(۱) حسن ابراہیمی، تاریخ سیاسی اسلام، ترجمہ: ابوالقاسم پایندہ(تہران: سازمان انتشارات جاویدان، ط ۵، ۱۳۶۲)، ج ۱، ص ۳۴.

بہت فاصلہ رکھتی تھی جبکہ دوسری قوموں کے تمدن کو اپنانا ثقافتی نزدیکی کی صورت میں ممکن تھا۔

۳۔ عربوںکے درمیان جہالت: یہ چیز سبب بنی کہ جو لوگ رومیوں اور ایرانیوں سے رابطہ رکھتے تھے ان کے درمیان بعض حکمت آمیز باتیں یا داستانیں اور محاورات یا تاریخی واقعات اس انداز سے نقل ہوں کہ ناقل آسانی سے اس کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر سکے اور بدو عرب یا دوسرے لوگ اس کو سمجھ سکیں اس وجہ سے ان کے درمیان رابطہ سطحی حد تک تھا اور وہ دقیق اور عمیق آگاہی سے بے خبر تھے۔

لہٰذا یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ پڑوسی ملکوں سے عربوں کے تعلقات صرف ان کی مادی اور ادبی زندگی میں مؤثر واقع ہوئے ہیں۔[۱]

یہودیوں کی موجودگی کے اثرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہودی حضرت موسیٰ کے زمانے سے اور اس کے بعد رومیوں کے مظالم، خاص طور سے یروشلم کی تباہی و بربادی کے بعد حجاز کی طرف ہجرت کر گئے۔[۲] حجاز میں یہودیوں کی آمد سے اس علاقہ کی زندگی کے حالات میں کافی تبدیلی آئی۔ اور توریت اور تلمود کی داستانیں بھی عربوں میں منتقل ہوگئیں۔[۳]

ایسی دستاویزات سامنے آئی ہیں جن سے پتہ چلا ہے کہ عربوں کے مقابلہ میں یہودیوں کی فکری اور مذہبی سطح بلند تھی. ظہور اسلام کے بعد بھی وہ بعض مسلمانوں سے اپنے مذہبی سوالات پوچھتے تھے۔[٤] لیکن چونکہ دین یہود (عیسائیوں کے دین کی طرح) بری طرح سے تحریف کا شکار ہوگیا تھا، لہٰذا عرب، جو افکار یہودیوں سے لیتے تھے وہ بیہودہ اور مسخ شدہ ہوا کرتے تھے یہودیوں کی تعلیم نہ صرف یہ کہ ان کے لئے راہ گشا نہ تھی بلکہ ان کی گمراہی میں اضافہ کا باعث تھی۔

---

(۱) رجوع کریں: فجر الاسلام، ص ۲۹.

(۲) یہودی عام طور سے مدینہ میں خیبر، فدک، اور تیماء میں رہتے تھے اور کچھ طائف میں بھی تھے لیکن کوئی ایسی نشانی نہیں ملتی جس سے پتہ چلے کہ مکہ میں بھی یہودی رہا کرتے تھے۔

(۳) جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، ترجمہ: علی جواہر کلام (تہران: امیر کبیر ۱۳۳۳)، ج ۱، ص ۱٦، تلخیص کے ساتھ)

(٤) صحیح بخاری، دار مطابع الشعب، ج ۹، ص ۱۳٦، کتاب الاعتصام بالکتاب و السنہ.

ایران اور روم کے مقابلہ میں عربوں کی کمزوری اور پستی

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ حجاز کے لوگ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ایک قبیلہ کی شکل میں زندگی بسر کرتے تھے اور زیادہ تر بادیہ نشین ہوا کرتے تھے، ان کے درمیان ایک مرکزی حکومت نہیں تھی جو ان کو منظم کر سکے ۔ وہ ہمیشہ لڑائی جھگڑا اور قبائلی جنگوں میں الجھے رہا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ذلیل اور کمزور تھے اور اس زمانہ میں دوسری قوموںکے نزدیک ہرگز عزت نہیں رکھتے تھے اور جیسا کہ یہ قوم، قبیلہ اور خاندان کے دائرہ میں محصور تھی اور خیموں کی محدود فضا، اور اونٹوں کے چرانے سے تعصب، محرومیت اور بے نظمی کا شکار تھے۔ لہٰذا وہ ہرگز اپنے ملک اور جزیرۃ العرب کے حدود سے باہر نکل کر نہیں سوچتے تھے۔ او رنہ صرف ان کے ذہنوں سے پڑوسی ملکوں پر فتح و کامرانی کا تصور ختم ہوگیا تھا بلکہ اس زمانہ کی قدرتمند طاقتوں، یعنی روم اور ایران کے سامنے بری طرح سے کمزوری اور حقارت کا احساس کرنے لگے تھے جیسا کہ ایک شخص جس کا نام قتادہ تھا جو کہ خود ایک عرب تھا اس زمانے کی عرب قوم کو حقیر و ذلیل، پست و گمراہ اور گرسنہ ترین قوم تصور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "وہ لوگ دوشیروں یعنی بڑی طاقتوں ایران او رروم کے درمیان پھنسے ہوئے تھے اوران سے ڈرتے تھے۔[۱]

اس بات کی شہادت اس طرح سے دی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ میں اپنی دعوت کے زمانے میں ایک دن عرب کے کچھ بزرگوں سے گفتگو کی اوران کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی چند آیات جو فطری اور اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھیں ان کے سامنے پڑھیں تو وہ سب کے سب متأثر ہوگئے، ہر ایک نے اپنے طور سے تعریف کی لیکن ان کے بزرگ مثنی بن حارثہ نے کہا:

ہم دو پانی کے درمیان گھرے ہوئے ہیں ایک طرف سے عرب کا پانی اور ساحل اوردوسری جانب سے ایران اور کسریٰ کی نہروں کا پانی، کسریٰ ہم سے عہد و پیمان باندھ چکا ہے کہ کوئی حادثہ نہیں رونما ہونے دیں گے او رکبھی خطا وار کو پناہ نہیں دیں گے۔ شاید تمہارے آئین کو قبول کرنا، شہنشاہوں کی خوشی کا باعث قرار نہ پائے اگر اس سرزمین پر ہم سے کوئی خطا سرزد ہو تو قابل چشم پوشی ہے لیکن ایسی خطائیں ایران کے علاقہ میں (کسریٰ کی طرف سے) قابل بخشش نہیں ہیں۔[۲]

---

(۱) طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، (بیروت: دار المعرفہ، ط۲، ۱۳۹۲ھ.ق)، ج٤، ص۲٥ (تفسیر آیۂ... وکنتم علی شفاحفرة من النار...) زاہیۃ قدورة، الشعوبیۃ، و اثرہ الاساسی، الاجتماعی فی الحیاۃ الاسلامیۃ فی عصر العباسی الاول. (بیروت: دار الکتاب اللبنانی، ط۱، ۱۹۷۲ئ)، ص۳٤؛ احمد امین، ضحی الاسلام، (قاہرہ: مکتبۃ النہضہ، ط۷)، ج۱، ص۱۸.

(۲) محمد ابوالفضل ابراہیم (اوران کے معاونین)، قصص العرب (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۸۲ھ.ق)، ج۲، ص۳٥۸؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبۃ المعارف، ط۲، ج۳، ص ۱٤٤۔

موہوم افتخار

مورخین، عربوں کے احساس حقارت کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایک سال قبیلہ بنی تمیم، خشک سالی میں گرفتار ہوگیا اور کسریٰ نے ان کو اجازت نہیں دی کہ عراق کے سرسبز و شاداب او رزرخیز علاقہ سے فائدہ اٹھائیں۔ یہاں تک کہ ان کے بزرگوں میں سے ایک شخص جس کا نام حاجب ابن زرارہ تھا اس قبیلہ کی نمائندگی میں کسریٰ کے دربار میں گیا اور اس سے مدد مانگی کسریٰ نے کہا: "تم عرب لوگ خیانت کار ہو، اگر اس بارے میں تم کو اجازت دیدوں تو تم بلوا اور فتنہ برپا کردو گے۔ لوگوں کو میرے خلاف ورغلاؤ گے اور مجھے رنجیدہ اور ملول کروگے۔ حاجب نے کہا: میں ضمانت لیتا ہوں کہ اس قسم کی بات پیش نہیں آئے گی۔ کسریٰ نے پوچھا: کیا ضمانت رکھتے ہو؟" اس نے کہا: اپنی کمان تمہارے پاس گروی رکھ دیتا ہوں۔ کسریٰ نے قبول کرلیا اور حاجب نے اپنی کمان (جو کہ شجاعت و دلیری کا نمونہ اور بہادری کی علامت سمجھی جاتی تھی) کسریٰ کے پاس گروی رکھ دی اور اس طرح سے کسریٰ کی موافقت حاصل کرلی۔ حاجب کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے عطارد نے باپ کی کمان کسریٰ

سے واپس لے لی۔[١]

اس واقعہ کے بعد ایک زمانہ تک قبیلۂ بنی تمیم اس طرح کے اغوا شدہ افراد کو کسریٰ کی جانب سے قبول کرنے کو اپنے لئے بہت بڑا فخر سمجھتے تھے۔[٢] دوسری جانب سے چونکہ قبیلۂ "بنی شیبان، عجلیوں اوریشکریوں" کی مدد سے جنگ "ذی قار" میں خسرو پرویز پر فتح پاگیا تھا۔[٣] لہذا اس کامیابی کو بے انتہا اپنی عزت و سربلندی کا باعث سمجھتا تھا اوراس کے باوجود کہ وہ جیت گئے تھے۔

پھر بھی اس پر ان کو یقین نہیں آتا تھا اور ہر وقت اس کے بارے میں فکر مند اور خوف زدہ رہتے تھے۔ اور ان کے اندر اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس کامیابی اور فتح کو عربوں کی عجم پر کامیابی کہہ سکیں ۔ بلکہ اس کو ایک اتفاقی حادثہ (نہ کہ عربوںکا افتخار) او رجنگ میں درگیر تین قبیلوں کا افتخار سمجھتے تھے۔ اس کامیابی کی بنا پر ان کی خود ستائی اس حد تک بڑھ گئی کہ ابو تمام[٤] شاعر نے قبیلۂ بنی تمیم کے مقابلہ میں

---

(١) آلوسی، بلوغ الارب، ج ١، ص ٣١٣- ٣١١؛ محمد بن عبد ربہ، العقد الفرید (بیروت: دار الکتاب العربی، ١٤٠٣ھ.ق)، ج ٢، ص ٢٠؛ ابن قتیبہ، المعارف، تحقیق: ثروۃ عکاشہ (قم: منشورات الرضی)، ص ٦٠٨۔

(٢) احمد امین، ضحی الاسلام، ج ١، ص ١٩۔

(٣) اس جنگ کی ابتدا اس طرح سے ہوئی کہ خسرو پرویز حرہ کے حاکم نعمان بن منذر کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن نعمان نے اس کی مخالفت کی لہذا کسریٰ کی جانب سے اسے دربار میں بلاکر قید میں ڈال دیا گیا اور قید خانہ میں ہی وہ مرگیا اس وقت خسرو پرویز نے ہانی بن مسعود شیبانی سے کہا کہ نعمان کے مال و دولت کو جو اس کے پاس ہے اسے دیدے۔ اس نے دینے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں کسریٰ نے اپنے سپاہیوں کو بنی شیبان (جو کہ بکر بن وائل کا ایک خاندان تھا) سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا اور اس جنگ میں ایران کی فوج ہار گئی (ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، بیروت: دار اصادر ١٣٩٩ھ.ق، ج ١، ص ٤٨٩- ٤٨٥، رجوع کریں مقدسی، البدء والتاریخ (پیریس: ١٩٠٣م)، ج ٣، ص ٢٦.

(٤) ابو تمام حبیب بن اوس طائی۔

(جو کہ ایک دن حاجب کی کمان کسریٰ کے پاس رکھنے کو افتخار سمجھتے تھے) ابودلف عجلی[1] کی مدح میں اس طرح کے اشعار کہے:
اگر ایک دن تمیم اپنی کمان پر افتخار کرتے تھے اور اس کو اپنی عزت و شرف اور سربلندی کا باعث سمجھتے تھے تو تمہاری تلوروں نے جنگ ذی قار میں ایسے لوگوں کے تخت حکومت کو جو کہ کمان حاجب کو گروی رکھے ہوئے تھے، درہم و برہم کردیا۔[2]

دور جاہلیت

ہم نے جزیرۃ العرب اور وہاں کے لوگوں کی بحث میں ظہور اسلام سے قبل کے دور کو، عصر جاہلیت، اور وہاں کے باشندوں کو، "جاہل عرب" کے نام سے یاد کیا ہے۔یہاں پر یہ بیان کرتا چلوں کہ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ "عصر جاہلیت" کی اصطلاح ظہور اسلام کے بعد(قرآن کے الہام کے ذریعہ) اسلام سے قبل زمانہ کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان استعمال ہوتی تھی۔اور ایک خاص مفہوم رکھتی تھی۔[3] کچھ معاصر مورخین نے اس دور کا تخمینہ ۱۵۰ سال سے ۲۰۰ سال قبل از بعثت پیغمبر اسلام ﷺ لگایا ہے۔[4]

---

(۱) ابودلف قاسم بن عیسی عجلی

(۲) اذا افتخرت یوماً تمیم بقوسها

و زادت علی ما وطدت من مناقب

فانتم بذی قار، امالت سیوفکم

عروش الذین استرهنوا قوس حاجب

احمد امین، ضحی الاسلام، ج ۱، ص ۱۹؛ مسعودی، التنبیه او الاشراف، تصحیح: عبداللہ اسماعیل الصاوی (قم: مؤسسة نشر منابع الثقافیه الاسلامیه)، ص ۲۰۹؛ جلال الدین همایی، شعوبیه (اصفهان: کتابفروشی صائب، ۲۳۶۳)، ص ۱۲ ۔ ۱۱

(۳)جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام (بیروت: دار العلم للملایین، ط ۱، ص ۴۲ ۔ ۴۱ ۔

(٤) عمر فروخ، تاریخ صدر الاسلام و الدولۃ الامویہ (بیروت: دار العلم للملایین، ط ۳، ۱۹۷۶ئ)، ص ۴۰۔

اگرچہ لفظ جاہلیت "جہل" سے نکلا ہے لیکن جہل یہاں پر علم کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ عقل اور منطق کے مقابل میں ہے۔[۱] یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں جزیرۃ العرب کے لوگ (اس تشریح کی بنا پر جو دی گئی ہے) پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اور علم و دانش سے بے بہرہ تھے او راس زمانے کو "عصر جاہلیت" کہا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ جہالت کی بنا پر بلکہ غلط فکر اور عقل و منطق سے دور، بے بنیاد رسم و رواج، برے صفات، جیسے کینہ توزی، خودپسندی، فخر فروشی، اندھے تعصب کی بنا پر اسلام نے سختی کے ساتھ ان سے مقابلہ کیا۔[۲]

شاید کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر جہل کا مفہوم "نا فہمی" کے مانند ہے۔ جس کا لازمہ جہالت نہیں ہے بلکہ کج فکری، کم عقلی اور ہلکے دماغ کے افراد کو بھی جاہل کہہ سکتے ہیں۔[۳]

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر جاہلیت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے، جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱۔ اہل کتاب میں سے کچھ لوگوں کی بے جا، غلط توقعات اور امیدیں یہ تھی کہ پیغمبر اسلام ﷺ ان کی مرضی کے مطابق مشورہ دیں، اسے "حکم جاہلیت" کہا گیا ہے۔[٤]

---

(۱) عمر فروخ کہتا ہے: جاہلیت اس جہل پر دلالت کرتی ہے جو حلم کے مقابلہ میں ہے نہ کہ جو علم کے مقابلہ میں ہے۔ (تاریخ صدر الاسلام، ص ٤٠).

(۲) رجوع کریں: طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ٤، ص ١٥٥ ـ ١٥١، احمد امین، فجر الاسلام، ص ٧٨ ـ ٧٤؛ آلوسی، بلوغ الارب، ج ۱، ص ١٨ ـ ١٥؛ شوقی ضیف، تاریخ الادب العربی، ج ۱، "العصر الجاہلی" (قاہرہ دار المعارف، ط ٧)، ص ٣٩۔ اس مطلب کی تائید کے لئے ہماری کچھ احادیث ہیں جس میں جہل کو عقل کے مقابلہ میںقرار دیا گیا اور اصول کافی جیسی کتاب میں "فصل العقل والجہل"، (ج ۱، ص ١١ کے بعد) میں اس طرح کی احادیث بیان ہوئی ہیں۔

(۳) جواد علی کہتے ہیں: "میری نظر میں جاہلیت، بیوقوفی، کم عقلی، غرور، کند ذہنی، غصہ اور حکم ودستور الٰہی کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے او ریہ وہ صفات ہیں جن کی اسلام نے مذمت کی ہے اس بنا پر یہ ویسے ہی ہے جیسے آج کوئی سفیہ اوراحمق گالی بکے اوراخلاق و تہذیب کا خیال نہ کرے تو ہم اس سے کہیں گے: اے نادان یہاں سے دور ہوجا! اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انسان جاہل ہے" (المفصل فی تاریخ العرب فی الاسلام، ج ۱، ص ٤٠

(٤) "افحکم الجاہلیۃ یبغون..." سورۂ مائدہ، ٥، آیت ٥٠۔

۲۔ خداوند عالم نے بت پرست عربوں کے اندھے تعصب کو "جاہلیت کا تعصب" قرار دیا ہے۔[۱]

۳۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی بیویوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اپنی گزشتہ جاہلیت کی رسم و رواج کے مطابق خود نمائی کے ساتھ گھر سے باہر نہ نکلیں۔[۲]

٤۔ خداوند عالم نے منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے ایک گروہ کو جنگ احد میں لشکر اسلام کے شکست کھا جانے کے بعد جن کے حوصلہ پست ہوگئے تھے اور تشویش و بدبینی کا شکار ہوگئے تھے۔ ان کی مذمت کی ہے کہ خدا کے بارے میں "جاہلیت" جیسا گمان رکھتے ہو۔[۳]

خداوند عالم نے بیان کیا ہے کہ جس وقت جناب موسیٰ نے اپنی قوم کو گائے کے کاٹنے کا حکم دیا تو ان کی قوم والوں نے کہا: "کیا آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں؟ جناب موسیٰ نے فرمایا: خدا کی پناہ مانگتا ہونکہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں"۔[٤]

امیر المومنین حضرت علی بت پرست عربوں کی ذلت و پستی اور تاریک زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کی جہالت کی بنا پر ان کی دماغی پستی کا ذکر فرماتے ہیں۔[۵]

---

(۱) سورۂ فتح،٤٨(ِ ذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِی قُلُوبِهِمْ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّة) آیت ٢٦۔

(۲) سورۂ احزاب، ۳۳(وَقَرْنَ فِی بُيُوتِكُنَّ وَلاَتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْ ُولَی)آیت ۳۳۔

(۳) سورۂ آل عمران، ۳(...وطَائِفَة قَدْ هَمَّتْهُمْ نْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ...)آیت ۱۵٤۔

(٤) سورۂ بقرہ، ۲(قَالُوا تَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ عُوذُ بِاللهِ َنْ َكُونَ مِنْ الْجَاهِلِينَ)آیت ٦٧۔

(۵) واستخفیتم الجاھلیة الجھلائ۔ (صبحی صالح، نہج البلاغہ، خطبہ ۹۵)

تیسری فصل

جزیرہ نمائے عرب اور اسکے اطراف کے ادیان و مذاہب

ظہور اسلام کے وقت عرب کے اکثر پیشوا بت پرست تھے لیکن ملک عرب کے گوشہ و کنار میں مذہبی رہبروں کی پیروی کرنے والے اور مختلف ادیان جیسے عیسائیت، یہودیت، حنفیت، مانوی اور صابئی وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس بنا پر عرب کے لوگ صرف ایک دین کی پیروی نہیں کرتے تھے اس کے علاوہ ہر ایک دین اور آئین، ابہام اور تیرگی سے خالی نہ تھا۔ اسی بنا پر ایک طرح کی سرگردانی اور حیرانگی ، ادیان کے سلسلے میں پائی جاتی تھی۔ ہم یہاں پر ہر ایک دین اور مذہب کے بارے میں مختصر توضیح دے رہے ہیں:

موحدین

موحدین یا دین حنیف[۱] کے معتقد ایسے لوگ تھے جو مشرکین کے برخلاف بت پرستی سے بے زار، خداوند متعال اور قیامت کے عقاب و ثواب کا عقیدہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ عیسائیت کے ماننے والے تھے۔ لیکن بعض مورخین، ان کو بھی دین حنیف پر سمجھتے ہیں ورقہ بن نوفل، عبد اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث، زید بن عمر بن نفیل[۲]، نابغۂ جعدی (قیس بن عبد اللہ) امیہ بن ابی الصلت، قس بن

---

(۱) حنیف (جس کی جمع حنفاء ہے) اس شخص کو کہتے ہیں جو دین ابراہیم کا پیرو ہو (طبرسی، مجمع البیان، شرکۃ المعارف، ج ۱، ص ۲۱٦.)

(۲) محمد بن حبیب، (المحبر (بیروت: دار الافاق الجدیدہ)، ص ۱۷۱.

ساعدہ، ابوقیس صرمہ بن ابی انس، زہیر ابن ابی سلمیٰ، ابوعامر اوسی (عبد عمرو بن صیفی) عداس (عتبہ بن ربیعہ کا غلام) رئاب شنی اور بحیرہ راہب جیسے افراد کو بھی دین حنیف کے معتقدین میں سمجھا جاتا ہے۔[1] ان میں سے بعض، حکماء یا مشہور شعراء تھے۔

البتہ وحدانیت کی طرف رجحان کا سبب ان کی پاک فطرت اور روشن فکر اور اس زمانے کے رائج ادیان کی بے رونقی اور اس سماج میں پائے جانے والے مذہبی خلا میں تلاش کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ اپنی پاک فطرت کے ذریعہ خلاق عالم، مدبر جہاں کے معتقد تھے اور عقل و خرد سے دور ایک پست آئین جیسے بت پرستی کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہودی مذہب بھی صدیاں گزر جانے کے بعد اپنی حقیقت اور معنویت کو کھو بیٹھا تھا۔ اور روشن فکر افراد کے اندر پائی جانے والی بے چینی کو اطمینان اور سکون میں نہیں بدل سکتے تھے اسی بنا پر بعض الوہیت کے متلاشی افراد کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ آئین حق کی تلاش میں وہ اپنے اوپر سفر کی صعوبتوں اور پریشانیوں کو روا جانتے ہوئے مسیحی اور یہودی علماء اور دوسرے آگاہ لوگوں سے بحث اور گفتگو کیا کرتے تھے۔[2] اور پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کی نشانیوں کے سلسلے میں آسمانی کتابوں میں جو اشارے ملتے ہیں ان کے بارے میں تحقیق کرتے تھے اور چونکہ معمولاً کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتے تھے لہٰذا اصل وحدانیت کو قبول کرتے تھے۔ بہر حال وہ اپنی مذہبی عبادتوں اور رسومات کو کس طرح انجام دیتے، یہ ہمارے لئے واضح نہیں ہے۔

---

(۱) مسعودی، مروج الذہب، ترجمہ: ابو القاسم پاینده (تہران: ادارۂ ترجمہ و نشر کتاب، ط۲، ۱۳۵۶)، ج۱، ص ۶۸۔ ۶۰؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی، تحقیق: مصطفی السقاء و معاونین، (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج۱، ص ۲۳۷؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، تحقیق: مصطفی عبد الواحد (قاہرہ: مطبعۃ عیسی البابی الحبی، ۱۳۸۴ھ.ق)، ج۱، ص ۱۶۵۔ ۱۲۲؛ محمد بن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: ڈاکٹر سہیل زکار (بیروت: دار الفکر، ط۲، ۱۴۱۰ھ.ق)، ص ۱۱۶۔ ۱۱۵؛ محمد بن حبیب بغدای، المنمق فی اخبار قریش، تحقیق: خورشید احمد فارق (بیروت: عالم الکتب، ط۱، ۱۴۰۵ھ.ق)، ص ۱۹۔ ۱۳۔

(۲) ابن کثیر، گزشتہ حوالہ، ص ۱۵۶؛ محمد ابو الفضل ابراہیم (اور معاونین)، قصص العرب، (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ط۵)، (قم: آفسیٹ منشورات الرضی، ۱۳٦۴)، ج۱، ص ۷۲۔

اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ دین حنیف کے پیرو کار، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف ہدایت اور عرب سماج کی تبدیلی میں توحید کے مسئلہ میں کوئی رول نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ جیسا کہ مورخین نے صراحت کی ہے کہ وہ لوگ تنہائی اور انفرادی شکل میں زندگی بسر کرتے تھے اور غور و فکر میں لگے رہتے تھے اور کبھی بھی ایک گروہ یا ایک منظم فرقہ کی شکل میں نہیں تھے اور ان کے پاس کوئی ایسا دین و آئین نہیں تھا جس میں ثابت اور معیّن احکام بیان کئے گئے ہوں۔ ان لوگوں نے آپس میں طے کر رکھا تھا کہ لوگوں کے اجتماعی مراکز سے دور رہیں اور بتوں کی پرستش سے بچیں اس قسم کے لوگ اپنی جگہ پر مطمئن تھے اور خیال کرتے تھے کہ ان کی قوم والونکے عقائد باطل ہیں اور اپنے کو تبلیغ و دعوت کی زحمت میں بتلا کرنے کے بجائے صرف اپنے نظریات کا اظہار کرتے تھے۔ اور اپنی قوم والوں سے ان کے تعلقات ٹھیک ٹھاک تھے ان کے درمیان کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں رہتا تھا۔[۱]

عیسائیت

دین عیسائیت کے ماننے والے بھی عرب کے بعض علاقوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ دین، جنوب کی سمت حبشہ سے اور شمال کی سمت سوریہ سے اور نیز جزیرہ نمائے سینا سے عرب میں آیا تھا۔ لیکن اس سرزمین کو کوئی خاص ترقی نہیں ملی۔[۲] جزیرۃ العرب کے شمال میں عیسائیت، (قبیلۂ تغلب) کے درمیان (قبیلۂ ربیعہ کی ایک شاخ) اور (غسان) اور قبیلۂ "قضاعہ" کے بعض لوگوں کے

---

(۱) جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب، قبل الاسلام (بیروت: دار العلم للملایین، ط ۱، ۱۹۶۸ئ)، ج۶، ص ۴۴۹؛ حسینی طباطبایی، خیانت در گزارش تاریخ (تہران: انتشارات چاپخش، ۱۳۶۶ش)، ج ۱، ص ۱۲۰؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۳۷۔

(۲) حسن ابراہیمی حسن، تاریخ سیاسی اسلام، ترجمہ: ابو القاسم پایندہ (تہران: سازمان انتشارات جاویدان، ط ۵، ۲۳۶۲)، ج ۱، ص ۶۴۔

درمیان رائج تھی۔[۱-۲]

قس بن ساعدہ، حنظلہ طائی اور امیہ بن صلت کو بھی عیسائیوں کے بزرگوں میں شمار کیا ہے ان میں سے کچھ لوگوں نے اجتماعی جگہوں پر جانا چھوڑ دیا تھا اور جنگلوں میں جاکر آباد ہوگئے تھے۔[۳]

یمن میں عیسائیت

یمن میں عیسائیت چوتھی صدی عیسوی میں داخل ہوئی "فلیپ حتّی" جو کہ خود ایک عیسائی ہے ، لکھتا ہے: "عیسائیوں کا پہلا گروہ عربستان کے جنوب میں گیا یہ خبر صحیح ہے یہ وہی گروہ تھا جس کو "کنتانیتوس" نے ۳٥٦ئ عیسوئی میں تئوفیلوس اندوس اربوس کی سرپرستی میں بھیجا اور یہ کام اس زمانہ کے سیاسی عوامل اور عربستان کے جنوبی علاقہ میں ایران اور روم کے نفوذ کی خاطر انجام دیا گیا تھا عدن میں ایک اور ملک حمیربان میں دو دوسرے کلیسوں کی بنیاد رکھی ، نجران کے لوگ ٥۰۰ئ میں ایک نئے دین کے گرویدہ ہوگئے تھے۔[٤]

---

(۱) گزشتہ حوالہ، ص ٦٤؛ شہاب الدین الابشہی، المستطرف فی کل فن مستظرف (بیروت:داراحیاء التراث العربی)، ج۲، ص۸۸؛ ابن قتیبہ، المعارف، تحقیق:ثروت عکاشہ (دار الکتب، ۱۹٦۰ئ)، ص ٦۲۱؛ الامیر ابوسعید الحمیری، الحور العین، تحقیق:کمال مصطفی، (تہران: ۱۹۷۲ئ)، ص۱۳٦۔

(۲) عثمان بن حویرث اور ورقہ بن نوفل (بنی اسد سے، قریش کا ایک خاندان) کو ہم نے دین حنیف کے معتقدین میں سے ذکر کیا ہے و نیز امرء القیس کے لڑکوں (قبیلۂ بنی تمیم سے تھے) کو مسیحی بیان کیا ہے (تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۲۲٥)

(۳) احمد امین، فجر الاسلام، (قاہرہ: مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ط۹، ۱۹٦٤ئ)، ص۲۷۔

(٤) تاریخ عرب، ترجمہ: ابوالقاسم پایندہ (تہران: انتشارات آگاہ، ط ۲، ۱۳٦٦)، ص ۷۸؛ کچھ مورخین نے یمن میںعیسائیوں کے نفوذ کا آغاز ایک فیمیون نامی شامی زاہد کے اس علاقہ میں آکر اس کے کام کرنے کے وقت بتاتے ہیں (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳٥- ۳۲؛ یاقوت حموی، معجم البلدان، (بیروت: داراحیاء التراث العربی)، ج٥، ص ۲٦٦؛ لفظ نجران، لیکن یہ افسانوی شکل رکھتا ہے اور جو کچھ حتی سے نقل ہوا ہے اس کے مطابق نہیں ہے۔

ظہور اسلام کے وقت، طی، مذحج، بہرائ، سلیح، تنوخ، غسّان اور لخم قبائل یمن میں عیسائی تھے۔[۱]

عیسائیوں کا سب سے اہم مرکز یمن میں "نجران شہر" تھا نجران ایک آباد او ر پر رونق شہر تھا وہاں کے لوگوں کا مشغلہ زراعت، ریشمی کپڑوں کی بناوٹی، کھال کی تجارت او ر اسلحہ سازی تھا۔ یہ شہر تاجروں کے راستوں میں پڑتا تھا جو حیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔[۲]

عیسائیت اس طرح سے یمن میں رائج ہوئی تھی۔یہاں تک کہ یمن میں ذونواس برسر اقتدار آیا اور اس نے عیسائیوں پر سختیاں کی تاکہ وہ اپنے آئین سے دست بردار ہو جائیں۔ جس وقت عیسائیوں نے مقابلہ کیا تو ان کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں جلا دیا گیا۔[۳]

آخرکار ذونواس، حکومت حبشہ کی مداخلت سے ۵۲۵ئ میں شکست کھا گیا او ر عیسائی دوبارہ برسر اقتدا

حیرہ میں عیسائیت

ایک دوسرا علاقہ جہاں پر عیسائیوں نے نفوذ کیا وہ "شہر حیرہ" تھا جو عربستان کے شرق میں واقع تھا۔ یہ مذہب رومی اسیروں کے ذریعہ اس علاقہ میں آیا تھا۔ حکومت ایران ہرمز اول کے زمانے سے ایسی جگھوں پر مسلط ہوگئی جہاں کے رہنے والے رومی اسیر تھے ان میں سے کچھ اسیر حیرہ میں رہتے تھے۔

---

(۱) تاریخ یعقوبی، (نجف: مکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج۱، ص ۲۲٤

(۲) احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ۲٦

(۳) مفسرین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ سورۂ "بروج" کی ٤ سے ۹ تک آیتیں مسیحیوں کے قتل عام کے بارے میں نازل ہوئی ہیں یا یہ واقعہ ان آیتوں کا ایک مصداق ہے (تفسیر المیزان، ج۲، ص ۲۵۷۔ ۲۵۱؛ جیسا کہ خداوند عالم سورۂ بروج کی ۹۔ ٤، آیتوں میں ارشاد فرماتا ہے۔

(٤) احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ۲۷.

بعض کے عقیدہ کے مطابق سرزمین حیرہ میں عیسائیت کے نفوذ کا سرچشمہ یہی اسیر تھے۔ بہرحال عیسائی مبلغین حیرہ میں رہتے تھے اور اپنے مذہب کی نشر و اشاعت میں مشغول رہتے تھے۔ عربوں کے بازاروں میں وعظ و نصیحت اور تبلیغ کرتے تھے۔ اور قیامت، جنت و جہنم کے مسئلہ سے آگاہ کرتے تھے ان کی محنتوں اور کوششوں کے نتیجہ میں ایک گروہ اس آئین کا گرویدہ ہوگیا اور حد ہے کہ ہند (نعمان پنجم کی بیوی) نے بھی مذہب عیسائیت کو قبول کرلیا اور اس نے ایک معبد بنایا جو "معبد ہند" کے نام سے مشہور رہوا اور طبری کے زمانے تک باقی رہا۔ حنظلہ طائی، قس بن ساعدہ اور امیہ بن صلت (جن کا تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں) حیرہ کے لوگوں میں سے تھے۔[۱]

نعمان بن منذر (بادشاہ حیرہ) نے بھی عدی بن زید کی تشویق پر آئین مسیحیت قبول کرلیا۔[۲]

قرآن مجید میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جن میں عیسائیوں کے افکار و عقائد کو بیان کرکے ان میں سے جو غلط اور ضعیف عقائد اور اعمال ہیں (خاص طور پر حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے بارے میں) جو ان کے خیالات ہیں، ان کو بیان کیا گیا ہے۔[۳] اور یہ چیزیں بہت اہم گواہ ہیں کہ یہ دین جزیرۃ العرب میں نزول قرآن کے وقت موجود تھا۔

اس کے علاوہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مباہلہ (جو کہ تاریخ اسلام میں مشہور ہے) بھی اس بات کا ثبوت ہے۔[٤]

---

(۱) احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ۱۸، ۲۵، ۲٦، ۲۸.

(۲) محمد ابو الفضل ابراہیم (اور اس کے ساتھی) قصص العرب، ج ۱، ص ۷۳؛ احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ۲۷

(۳) سورۂ مائدہ، آیت ۱۸، ۷۲، ۷۳؛ سورۂ نسائ، آیت ۱۷۱؛ سورۂ توبہ، آیت ۳۰؛ لیکن قرآن نے، عیسائیوں کو یہودیوں کے مقابلہ میں جو کہ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے ان کا قریبی دوست بتایا ہے۔ (مائدہ، ۵، آیت ۸۲).

(٤) سید محمد حسین طباطبائی، تفسیر المیزان، (مطبوعاتی اسماعیلیان، ط ۳، ۱۳۹۳ ھ.ق)، ج ۳، ص ۲۲۸ و ۲۳۳).

البتہ جیساکہ اشارہ ہوچکا ہے کہ مذہب عیسائیت بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اس کی اصالت اور معنویت کا نور ماند پڑ گیا ہے اور وہ تحریفات کا شکار ہوگیا ہے۔ لہٰذا اس زمانہ کے لوگوں کے فکری اور عقیدتی خلاء کو پر نہیںکیا جاسکتا اور ان کے مضطرب و پریشان قلب و ضمیر کو سکون نہیں بخشا جاسکتا ۔

دین یہود

دین یہود کا ظہور اسلام سے چند صدی قبل عربستان میں نفوذ ہوا تھا اور بعض یہودی نشین علاقے ظہور میں آچکے تھے جن میں سے سب سے معروف "یثرب" تھا جسے بعد میں "مدینہ" کہا گیا "تیمائ،[۱] "فدک"[۲] اور "خیبر"[۳] بھی یہودی نشین علاقے تھے۔ یثرب کے یہودی تین گروہ میں بٹے ہوئے تھے: ۱۔ طائفۂ بنی نظیر ۲۔ طائفۂ بنی قینقاع ۳۔ طائفۂ بنی قریظہ۔[٤]

---

(۱) یاقوت حموی کے بقول، تیماء ایک چھوٹا سا شہر تھا جو شام اور روادی القریٰ کے بیچ پڑتا تھا (معجم البلدان، ج۲، ص ٦٧)، اور روادی القری مدینہ اور شام کے بیچ مدینہ کا ایک علاقہ تھا۔ وہی حوالہ، ج٥، ص ٣٤٥.) لہٰذا تیماء شام اور مدینہ کے بیچ پڑتا تھا؛ مقدسی چوتھی صدی کا اسلامی دانشور، کہتا ہے کہ "تیمائ" ایک ایسا قدیمی شہر ہے جو ایک وسیع زمین میں کھجوروں کے درختوں سے پُر بے شمار باغات پانی کی فراوانی ابلتے ہوئے چشموں کی بنا پر دلکش اور حسین منظر جو کہ ایک لوہے کی جالی سے تالاب میں گرتا ہے اور پھر باغوں میں جاتا ہے، میٹھے پانی کے کنویں بھی موجود تھے، جنگل میں واقع تھا لیکن اب اس کا اکثر حصہ ویران ہوگیا ہے" (احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ترجمہ: علی نقی منتروی (گروہ مولفین و مترجمین ایران)

(۲) فدک ایک گاؤں ہے جس کا فاصلہ مدینہ سے دو یا تین روز پیدل مسافت کے ذریعہ طے ہوتا ہے (معجم البلدان، ج٤، ص ٢٣٨)

(۳) خیبر ایک ایسا علاقہ ہے جو تقریباً ٩٦ میل (١٩٢ کلو میٹر) مدینہ کے شمال کی جانب (شام کی طرف) پڑتا ہے کہ جہاں سات قلعے کاشتکاری کی زمینیں اور بہت سے کھجور کے باغات تھے (معجم البلدان، ج۲، ص ٤٠٩) اس کا فاصلہ مدینہ سے اس سے بھی کم اور زیادہ بیان کیا گیا ہے (ابو الفداء تقویم، ترجمہ: عبد المحمد آیتی (انتشارات بنیاد فرہنگی ایران)، ص ١٢٣۔

(٤) حسن ابراہیم حسن، گزشتہ حوالہ، ص ٦٤.

مدینہ میں مذکورہ تین قبیلوں کے علاوہ دو قبیلے اوس او رخزرج بھی رہتے تھے جو تیسری صدی عیسوئی کے نزدیک، یمن سے آئے تھے۔ یہ دونوں قبیلے یثرب میں یہودیوں کے مقیم اور مستقر ہو جانے کے بعد وہاں مستقر ہوئے تھے۔ یہ دو قبیلے بت پرست تھے اور یہودیوں کے پہلو میں رہنے کی بنا پر ان میں سے کچھ لوگ، دین یہود کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ طائف میں بھی کچھ یہودی رہتے تھے جو یمن او ریثرب سے نکالے گئے تھے۔[۱]

یہودی عربستان کے جس علاقہ میں رہتے تھے وہاں اپنی مہارت کی بنا پر زراعت میں مشہور تھے یہ لوگ مدینہ میں بھی زراعت کے علاوہ دوسرے ہنر کی وجہ سے جیسے آہنگری، رنگریزی، اوراسلحوں کے بنانے کی بنا پر مشہور ہوگئے تھے۔[۲]

دین یہود کے ماننے والے قبیلۂ حمیر، بنی کنانہ، بنی حارث بن کعب، کندہ[۲] غسّان و جذام میں بھی پائے جاتے تھے۔[۳]

یمن میں یہودی

یہودی جس علاقہ میں رہتے تھے اپنے عقائد و افکار او رتوریت کی تعلیمات کو ترویج دیتے تھے۔ یمن بھی ایک زمانہ تک یہودیوں کے زیر نفوذ رہا ہے اور ذونواس (بادشاہ یمن) نے جو کہ یہودی ہوگیا تھا۔

---

(۱) بلاذری، فتوح البلدان (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۸ھ.ق)، ص ٦٧۔

(۲) احمد امین، فجر الاسلام، ص ٢٤

(۲) ابن قتیبہ، المعارف، تحقیق: ثروت عکاشہ (قم: منشورات الرضی)، ط ۱، ص ۱٤۱٥ھ.ق)، ص ٦٢١؛ الامیر ابو سعید بن نشوار الحمیری، الحور العین، تحقیق: کمال مصطفی (تہران: ۱۹۷۲.)، ص ۱۳٦، کتاب المستطرف، ج ۲، ص ۸۸، پر قبیلۂ حمیر کا نام (نمیر) لکھا ہوا ہے جو غلط چھپا ہے۔

(۳) تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۲٥٧.

عیسائیوں کو کچل کر، دین یہود کے قانونی دین ہونے کا اعلان کردیا تھا۔ بعض مورخین کے عقیدے کے مطابق ذونواس کا یہ اقدام مذہبی جذبہ کے تحت نہیں تھا بلکہ قومی اور وطن پرستی کے جذبہ کی خاطر تھا۔ اس اعتبار سے کہ نجران کے عیسائی ملک حبشہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور حکومت حبشہ، نجران میں عیسائیوں کی حمایت کو مدعا بناکر، یمن کے امور میں مداخلت کرتی تھی اور اس طرح وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگئے۔ ذونواس اور اس کے طرفداروں نے چاہا کہ وہاں پر عیسائیوں کو کچل کر، حبشہ کو اس علاقہ اور مرکز سے محروم کردیں۔ اسی بنا پر اس نے عیسائیوں کا قتل عام شروع کردیا۔

نجران کے عیسائیوں کے قتل عام کے بعد ان میں کا ایک آدمی بچ گیا تھا جو بھاگ کر حبشہ پہنچا اور وہاں کے بادشاہ سے مدد مانگی ۔ جس کی بنا پر دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ گئی اور ذونواس ۵۲۵ئ میں شکست کھا گیا او ر نجران کا علاقہ دوبارہ پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ تک عیسائیوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔(۱)

صابئین

بعض مورخین اس گروہ کے آغاز کو "سلطنت تہمورث" کے زمانہ میں بتاتے ہیں او راس کا بانی "بوذاسف" کو جانتے ہیں۔ ابوریحان بیرونی (۴۴۰ھ۔ ۳۶۰ھ) اس گروہ کے آغاز کی تاریخ بیان کرنے کے بعد کہتا ہے: "ہم ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے کہ وہ خداوند عالم کی وحدانیت کے قائل ہیں اور اس کو ہر طرح کے صفات بد سے منزہ اور بے عیب جانتے ہیں جیسے وہ کہتے ہیں: خدا محدود نہیں ہے، دکھائی نہیںدیتا ، ظلم نہیں کرتا، تدبیر عالم کو فلک اور آسمانی کہکشاؤوں کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ حیات افلاک اور اس کے نطق، شنوائی اور بینائی کے معتقد

---

(۱) احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳، ۲۴ اور ۲۷؛ رجوع کریں: ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۳۷؛ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج ۵، ص ۲۶۶

ہیں، انوار کی تعظیم کرتے ہیں۔ یہ لوگ ستاروں پر عقیدہ رکھنے کی بنا پر، ان کی حرکتوں سے زمین کے مقدرات کو مربوط جانتے تھے اور ان کے مجسموں کو اپنے معبد میں نصب کرتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے سورج کے مجسمہ کو بعلبک میں، چاند کے مجسمہ کو حران میں اور زھرہ کے مجسمہ کو ایک قریہ میں نصب کر رکھا تھا۔[۱]

صابئین کا مرکز "حران" [۲]شہر تھا۔ یہ دین ایک زمانہ میں روم، یونان، بابل اوردنیا کے دوسرے علاقوں تک پھیل گیا تھا۔[۳] قرآن مجید نے ان میں سے تین مقامات کاذکر کیا ہے۔[٤] یہ فرقہ ہمارے زمانے میں ختم ہوتا جارہا ہے ان میں سے کچھ لوگ صرف خوزستان[٥]، اور عراق[٦] میں باقی رہ گئے ہیں۔[٧]

---

(۱) الآثار الباقیہ، ترجمہ: اکبر دانا سرشت، (تہران: ط ۳، ۱۳٦۳)، ص ۲۹۵۔ ۲۹٤.

(۲) حران، دجلہ اور فرات کے درمیان ایک بڑا شہر تھا لیکن آج ویران ہوگیا ہے اورایک کھنڈر دیہات میں تبدیل ہوگیا ہے. صدر اسلام میں یہ شہر آباد تھا اور جید علماء یہاں سے پیدا ہوئے ہیں (معجم البلدان، ج ۲، ص ۲۳٦۔ ۲۳۵؛ تقویم البلدان، ص ۳۰۷۔ ۳۰٦؛ محمد معین: فرہنگ فارسی، (تہران: امیر کبیر)، ج ٥، ص ٤٥٧.

(۳) طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ۱۰، ص ۲۷۹.

(٤) سورۂ بقرہ، ۲، آیت ٦۲؛ سورۂ مائدہ، ٥، ٦۹؛ سورۂ حج، ۲۲، آیت ۱۷.

(٥)دریائے کارون کے ساحلی علاقے، اھواز، خرم شہر، آبادان، شادگان اور دشت میشان ہیں)

(٦) بغداد میں دجلہ او رفرات کے ساحلی علاقے حلہ، ناصریہ، عمارہ، کوت، دیالی، کرکوک ، موصل ، رمادی ، سلیمانیہ ، اور کربلا ہیں۔

(۷) کلمۂ صابئی کے ریشہ اوراصل کے سلسلہ میں اور کیا یہ عربی کلمہ ہے یا عبری؟ اور اس کے معنی کیا ہیں اور نیز صابئیوں کے عقائد اور یہ کسی نبی کے ماننے والے ہیں ، رجوع کریں آلوسی، بلوغ الارب، ج ۲، ص ۲۲۸۔ ۲۲۳؛ یحیی نوری، اسلام و عقائد و آراء بشری، (تہران: موسسہ مطبوعاتی فراہانی، ط ۲، ۱۳٤٦)، ص ٤۳۲۔ ٤۳۱؛ شہرستانی، الملل و نحل، تحقیق: محمد سید گیلانی (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۱، ص ۳۳۰، ج ۲، ص ٥.

مانی دین

دین زردشتی، مزدکی اور مانوی کا منبع او رمرکز ایران رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ادیان ظہور اسلام سے قبل بھی حجاز میں موجود تھے یانہیں؟ اس بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے بعض معاصر مورخین کا کہنا ہے کہ یہ ادیان ظہور اسلام سے قبل حجاز میں موجود تھے لیکن تاریخی دستاویزات اس علاقہ میں صرف دین مانوی کے وجود کی تصدیق کرتی ہیں۔

یعقوبی لکھتا ہے: عربوں کا ایک گروہ دین یہودیت کا گرویدہ ہوگیا تھا اور ایک گروہ دین عیسائیت کو ماننے لگا تھا اور ایک گروہ جو زندیق ہوگیا تھا اس نے دین ثنوی (دوگانہ پرستی) کو اپنا لیا تھا۔[۱]

اگرچہ کلمۂ "زندیق" ملحد اور منکر خدا کے معنی میں استعمال ہوتا تھا لیکن صاحبان نظر کے عقیدے کے مطابق، دراصل ایک ایسا فرقہ تھا جو دین مانوی کی پیروی کرتا تھا اور پھر یہ کلمہ تمام مانویوں کے لئے بولا جانے لگا۔ اس رو سے کافر اور دھری اس میں شامل ہوگئے اسی وجہ سے قدیم حوالوں میں "زندقہ" سے مراد دین مانی ہے[۲] اور دین مانوی عیسائیت اور یہودیت سے مل کر بنا ہے۔[۳]

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۲۲۶.

(۲) احمد امین، فجر الاسلام، ص ۱۰۸؛ داؤد الہامی، ایران و اسلام (قم: مرکز نشر جدید)، ص ۳۹۲۔ بیرونی اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ مزدکیان زند، کی پیروی کرنے کی وجہ سے زنادقہ کہے جاتے ہیں۔ لکھتا ہے: "مانویان کو بھی مجازی طور سے زنادقہ کہتے ہیں۔ اور فرقہ باطنیہ کو بھی اسلام میں ایسے کہتے ہیں: کیونکہ یہ دو گروہ خداوند عالم کو بعض صفات سے متصف کرنے میں اور نیز ظواہر کی تاویل کرنے میں مزدکیہ کے مشابہ ہیں" (الآثار الباقیہ، ترجمہ: اکبر دانا سرشت، ص ۳۱۲).

عبد الحسین زرین کوب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: "لفظ زندیق کہ جس کی اصل زندیک پہلوی ہے، جو آج کل تقریباً مسلم سمجھا جاتاہے، اسلامی عہد میں اس سے قطع نظر کہ یہ مانوی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تمام ایسے افراد جو ایک طرح سے شک و الحاد اور بے اعتقادی میں متہم تھے ان کو بھی زندیق کہا جاتا ہے؛ (نہ شرقی نہ غربی، انسانی، ص ۱۱۰)۔

(۳) شہرستانی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۴۴، ایک مستشرق کہتا ہے: اگر دین مانی کو ایسا زردشتی دین سمجھیں جس میں مسیحیت کی آمیزش ہوئی ہے تو یہ کلام حقیقت سے بہت قریب ہے بہ نسبت اس کے اسے ایسا عیسائی دین سمجھیں جس میں زردشت کی آمیزش ہوئی ہے۔ (احمد امین، فجر الاسلام، ص ۱۰۴)، مانی او راس کے دین کے بارے میں رجوع کریں: عبد الحسین زرین کوب، نہ شرقی نہ غربی، انسانی، ص ۷۶۔ ۷۲۔

مورخین کے ایک گروہ نے وضاحت کی ہے کہ زندقہ کا قریش کے درمیان وجود تھا اور اس کو، انھوں نے اہل حیرہ سے اپنایا تھا۔[۱] اور اس دین کو حیرہ سے لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مراد "دوگانہ پرستی" ہے کیونکہ حیرہ، ایران کا پڑوسی اور اس کے زیر اثر تھا اور ادیان ایرانی جنکی بنیاد دوگانہ پرستی پر قائم تھی، وہاں تک پہنچ گئے تھے۔

ستاروں کی عبادت

زمانۂ جاہلیت میں جزیرۃ العرب میں رہنے والوں کا ایک گروہ، بہت سارے دوسرے علاقہ کے لوگوں کی طرح اجرام آسمانی جیسے سورج، چاند اور بعض ستاروں کی عبادت کرتا تھا۔ اور انہیں بہت ہی

---

(۱) ابن قتیبہ، المعارف (قم: منشورات الرضی، ط ۱، ۱٤۱۵ھ.ق)، ص ٦۲۱؛ الابشہی، المستطرف فی کل فن مستظرف، ج ۲، ص ۸۸؛ ابن رستہ، الملاق النفسیہ، ترجمہ: حسین قرہ چانلو، (تہران: امیر کبیر، ط ۱، ۱۳٦۵)، ص ۲٦٤؛ احمد امین، فجر الاسلام ﷺ ص ۱۰۸؛ محمد بن حبیب بغدادی کے بقول، قریش سے صخر بن حرب (ابوسفیان) عقبہ بن ابی معیط، ابی بن خلف، ابوعزہ (عمر بن عبداللہ جمحی) نضر بن حارث، نبیہ و منبہ (مجاج بن عامر سہمی کے لڑکے) عاص بن وائل سہمی، اور ولید بن مغیرہ مخرومی، اس گروہ میں تھے۔ (المنمق فی اخبار قریش) ص ۲۸۹۔ ۲۸۸؛ المحبر ص ۱٦۱)، لیکن اسلام کے مقابلہ میں ان کا کوئی بھی کلام یا موقف اس مطلب کی تصدیق نہیں کرتا ہے، بلکہ شواہد و قرائن سے ان کی بت پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ عبد الحسین زرین کوب، زندیق و زنادقہ کی بحث میں لکھتے ہیں: "... لفظ زندقہ جیسا کہ ثعلب سے نقل کیا گیا ہے دہریہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ دہریہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حوادث اور امور عالم کوایک صانع مختار کی طرف نسبت دینے کے منکر ہوئے ہیں قریش کے زنادقہ کے نام ابوسفیان، عقبہ بن معیط، نضر بن حارث، عاص بن وائل او رولید بن مغیرہ بھی انھیں میں سے ہیں جو در حقیقت اس طرح کا عقیدہ رکھتے تھے۔ قریش کے بزرگوں اور اہم شخصیتوں کی خبروں اور ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ زندقہ ان کو کہا گیا ہے جو صانع عالم، حشر و حیات، عقبیٰ کے عقیدہ کا انکار کرتے تھے۔ (نہ شرقی نہ غربی، انسانی، ص ۱۰۷)۔

طاقتور اور قوی شے سمجھتا تھا۔ جن کے ذریعہ دنیا اور دنیا والوں کے انجام کا پتہ چلتا تھا مثلاً قبیلۂ خزاعہ او رحمیر، ستارۂ "شعریٰ" کو جو کہ ایک ثابت او ردرخشان ستارہ ہے اس کی پرستش کرتے تھے اور اسی طرح ابو کبشہ جو پیغمبر اسلام ﷺ کے مادری اجداد میں سے تھے، وہ اس ستارہ کی پرستش کرنے والوں میں سے تھے۔[1]

قبیلۂ طیٔ کے کچھ لوگ "ستارۂ ثریا" کی پرستش کیا کرتے تھے۔[2] افلاک اور ستارونکی پرستش کا مسئلہ اتنا رائج ہوگیا تھاکہ عرب کے افسانوں ادبیات اور خرافات میں اس کا ذکر ملتا ہے۔[3] صابئین جو کہ سورج اور چاندکی پرستش کیا کرتے تھے ان کے علاوہ دوسرے تمام بت پرست بھی ان دو آسمانی موجود کو مقدس سمجھتے تھے۔[4]

قرآن مجیدنے آسمانی اجرام کی پرستش کرنے سے منع فرمایا ہے اور اس کی پرستش کی مذمت کی ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ یہ محدود موجودات، خودپروردگار عالم کی مخلوق اوراس کے فرمان اورارادہ کے تابع ہیں اور بارگاہ پروردگار میں سجدہ ریز او رخاضع ہیں۔ اس وجہ سے وہ خداوند عالم کی جانب سے بشر کے لئے دلیل اور راہنما قرار دیئے گئے ہیں کیونکہ یہ ساری چیزیں اس کی قدرت او رعلم کی نشانیاں ہیں۔ "اور اسی نے تمہارے لئے رات اوردن اور آفتاب و ماہتاب سب کو مسخر کردیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم کے تابع ہیں بیشک اس میں بھی صاحبان عقل کے لئے قدرت کی بہت ساری نشانیاں پائی جاتی ہیں"۔[5]

اور اسی خدا کی نشانیوں میں سے رات اوردن اور آفتاب و ماہتاب ہیں لہٰذا آفتاب و ماہتاب کو

---

(۱) طباطبائی، تفسیر المیزان، ج۱۹، ص ۴۹.

(۲) آلوسی، بلوغ الارب، ج۲، ص ۲۴۰.

(۳) رجوع کریں: وہی حوالہ، ص ۲۱۵، ۲۲۰، ۲۳۰، ۲۳۷، ۲۳۹، ۲۴۰، اسلام و عقائد اور آراء بشری، ص ۲۹۷۔ ۲۹۵۔

(٤) طباطبائی، گزشتہ حوالہ، ج۱۷، ص ۳۹۳۔

(۵) سورہ نحل، ١٦، آیت ۱۲.

سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اگر واقعاً اس کے عبادت کرنے والے ہو"[۱] اور وہی ستارہ شعریٰ کا مالک ہے"[۲]

یہ آیات اس بات کی گواہ ہیں کہ بعثت پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں ان اجرام کی پرستش اور عبادت رائج تھی۔

جنات اور فرشتوں کی عبادت

اس بات سے قطع نظر کہ ہم نے سابق میں مختلف ادیان کے ماننے والوں کا تذکرہ کیا ہے، عرب میں ایسے گروہ بھی موجود تھے جو جِن اور فرشتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن زبعری (جو کہ مکہ کا ایک سردار تھا) کہتا ہے ہم لوگ فرشتوںکی عبادت کرتے تھے۔یہودی، عزیر کی اور عیسائی عیسیٰ کی پرستش کرتے تھے، محمد ﷺ سے پوچھیں کیا ہم سب ان معبودوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے؟۔[۳]

بنو ملیح جو قبیلۂ خزاعہ کی ایک شاخ تھی وہ جن کی عبادت کرتے تھے[۴]، کہتے ہیں جن لوگوں نے سب سے پہلے جن کی پرستش کی وہ یمن کے لوگ تھے اس کے بعد قبیلۂ بنی حنیفہ تھا اور پھر آہستہ آہستہ عربوں میں یہ بات رائج ہوگئی۔[۵] بعض مفسرین کے کہنے کے مطابق ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ خداوند عالم نے جنات کے ساتھ شادی کی ہے اور فرشتے اس کی اولاد ہیں۔[۶]

خداوندعالم نے قرآن مجید میں جن اور فرشتوںکی عبادت اور ان کے بارے میں غلط اعتقاد کی مذمت فرمائی ہے۔ اور ان لوگوں نے جنات کو خدا کا شریک بنادیا ہے حالانکہ خدا نے انھیں پیدا کیا

---

(۱) سورۂ فصلت، ٤١، آیت ۳۷.

(۲) سورۂ نجم، ۵۳،آیت ٤٩.

(۳) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج۱، ص ۳۸۵۔

(٤) ہشام بن محمد کلبی، کتاب الاصنام، ترجمہ: سید محمد رضا جلالی نائینی، تہران: ۱۳٤۸، ص ٤۲.

(۵) طباطبائی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤۲.

(٦) طبرسی، مجمع البیان، شرکۃ المعارف الاسلامیہ، ۱۳۷۹ھ.ق، ج۸، ص ٤٦.

ہے۔[۱] اور جس دن خدا سب کو جمع کرے گا اور پھر ملائکہ سے کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے۔ تو وہ عرض کریں گے کہ تو پاک و بے نیاز او رہمارا ولی ہے یہ ہمارے کچھ نہیں ہیں اور یہ جنات کی عبادت کرتے تھے اور ان کی اکثریت انھیں پر ایمان رکھتی تھی۔[۲]

یہ بالکل واضح ہے کہ یہ سوال، استفہامی پہلو رکھتا ہے اور اس سے مجہول کا پتہ نہیں چل سکتا ہے کیونکہ خداوند عالم تمام چیزوں سے واقف ہے بلکہ اس سوال کا مقصد یہ ہے کہ حقائق فرشتوں کی زبان سے بیان ہوں تاکہ ان کی عبادت کرنے والوں کا سر جھکا رہے اور فرشتوں کے جواب سے بھی بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اس بات سے راضی نہیں تھے کہ انسانوں کا ایک گروہ ان کی پرستش کرے۔ لیکن جنّات اس بات سے راضی تھے۔

بہرحال ان دو ناقابل دید موجودات کی پرستش، ثنوی آئین سے مشابہت رکھتی تھی کیونکہ وہ لوگ جنات کو باعث شر و اذیت اور فرشتوںکو سرچشمۂ نور اور رحمت و برکت سمجھتے تھے بعض عرب، رات کے وقت جب کسی درہ میں داخل ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ اس سرزمین کے احمقوں کے شر سے ان کے بزرگ اور رئیس سے پناہ مانگتا ہوں۔[۳] اور عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ بات کہنے سے ان کا بڑا جِن، احمقوں کے شر سے ان کو محفوظ رکھتا ہے ۔ اس بات کی تصدیق قرآن میں کلام خدا کے ذریعہ ہوئی ہے۔ "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنات کے بعض لوگوں کی پناہ ڈھونڈ رہے تھے تو انھوں نے گرفتاری میں اور اضافہ کرلیا"۔[٤]

---

(۱) سورۂ انعام، ٦، آیت ۱۰۰.

(۲) سورۂ سبا، ۳٤، آیت ۱٤ ۔ ٤۰.

(۳) اعوذ بعزیز هذا الوادی من شر سفهاء قومه (آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۳۲.

(٤) و انه کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقاً" سورۂ جن، ۷۲، آیت ٦

شہرمکہ کی ابتدائ

شہر مکہ کی تاریخ حضرت ابراہیم کے زمانے سے ملتی ہے کہ جب آپ حکم خدا سے اپنی زوجہ محترمہ ہاجرہ اور اپنے شیر خوار فرزند جناب اسماعیل کو شام لیکر آئے اور انھیں ایک خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین میں لاکر ٹھہرا دیا۔[1] اور حکم و ارادۂ الٰہی سے آب زمزم ان دونوکے لئے جاری ہوا[2] اس کے بعد جنوب کے قبائل میں سے قبیلۂ جرہم (جو کہ قحطی اور خشک سالی کی بنا پر شمال کی جانب حرکت میں تھا) اس جگہ جاکر بس گیا۔[3] جناب اسماعیل جوان ہوئے اور جرہمی قبیلہ کی لڑکی سے شادی کی.[4] جناب ابراہیم خدا کی جانب سے مامور ہوئے کہ اپنے فرزند اسماعیل کی مدد سے کعبہ کی بنیاد ڈالیں[5] چنانچہ کعبہ کی تعمیر کے ساتھ شہر مکہ کا قیام عمل میں آیا اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ نسل اسماعیل وہاں بڑھنے لگی۔

دین ابراہیم کی باقی ماندہ تعلیمات

جناب عدنان، عرب عدنانی (عرب مکہ) کے جد اعلی اور حضرت محمد ﷺ کے بیسویں جد، جناب اسماعیل کی نسل سے تھے۔ اور حجاز، نجد، تہامہ میں رہنے والے عدنانی جناب اسماعیل[6] کی اولاد، میں سے

---

(۱) سورۂ ابراہیم، ١٤، آیت ٣٧.

(٢) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ١٣٥٥ھ.ق)، ج ١، ص ٥٥ و ١١٦؛ ازرقی، تاریخ مکہ، تحقیق: رشدی الصالح ملحس (قم: منشورات الرضی، ١٣٦٩)، ج ١، ص٥٥: تاریخ یعقوبی (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ١٣٤٨ھ.ق)، ج ١، ص١٨؛ ابن رستہ، الاعلاق النفیسہ، ترجمہ: حسین قرہ چانلو (تہران: امیر کبیر، ١٣٦٥)، ص ٥١۔

(٣) ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ٥٧؛ مسعودی، مروج الذہب (بیروت: دار الاندلس، ط ١، ١٩٦٥.)، ج٢، ص ٢٠.

(٤) تاریخ یعقوبی، ج ١، ص ١٩؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ٥٧.

(٥) سورۂ بقرہ، ٢، آیت ١٢٧.

(٦) ایک تفسیر کی بنیاد پر سورۂ حج کی ٧٩ ویں آیت "ملۃ ابیکم ابراہیم" میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے (طبرسی، مجمع البیان، ج٧، ص ٩٧.)

تھے جو برسوں سے شریعت ابراہیمی کی پیروی کرتے تھے۔ یعقوبی کے کہنے کے مطابق:

قریش اورجناب عدنان کی ساری اولادیںدین ابراہیمی کے بعض احکام کی پابند تھیں وہ لوگ کعبہ کی زیارت کیا کرتے تھے، حج کے اعمال بجالاتے تھے، مہمان نواز تھے، حرام مہینوں کا احترام کیا کرتے تھے برے کاموں سے پرہیز اور ایک دوسرے کے ساتھ قطع تعلق اور ظلم کو برا سمجھتے تھے اور بدکاروں کو سزا دیتے تھے۔[(۱)]

سنت ابراہیمی اوران کی بچی ہوئی تعلیمات جیسے خدا پر اعتقاد، محارم کے ساتھ شادی کی حرمت، حج و عمرہ اور قربانی کے اعمال، غسل جنابت[(۲)] ختنہ، میت کی تکفین وتدفین[(۳)] وغیرہ ظہور اسلام کے زمانہ تک اسی طرح ان کے درمیان رائج تھیں اور جسم کی نظافت اور زائد بالوں کے کاٹنے وغیرہ کے بارے میں موجودہ دس سنتوں کے وہ پابند تھے۔[(٤)] اسی طرح وہ چار مہینوں کا تقدس واحترام جو سنت ابراہیمی[(٥)] میں پایا جاتا تھا اس کا بھی وہ عقیدہ رکھتے تھے اور اگر ان کے درمیان کسی وجہ سے کوئی جنگ یا خون خرابہ، ان مہینوں میں واقع ہو جاتا تھا تو اسے "جنگ فجار" (ناروا اور گناہ آلودجنگ) کہا کرتے تھے۔[(٦)] اسی وجہ سے آئین توحید اس علاقہ کے عربوں کے درمیان بہت زمانہ سے پایا جاتا تھا اور بت پرستی بعد میں وہاں پر آئی ہے جوان کے دین توحیدی سے منحرف ہونے کا باعث بنی۔

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۲۲٤.

(۲) مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ج ۱٥، ص ۱۷۰؛ ہشام کلبی، الاصنام، ص ٦.

(۳) شیخ حرعاملی، وسائل الشیعہ (بیروت: داراحیاء التراث العربی، ط ٤،)، ج ۱، کتاب الطہارۃ، ابواب الجنابہ حدیث ۱٤، ص ٤٦٥؛ طبرسی، احتجاج (نجف: المطبعۃ المرتضویہ، ۱۳٥۰ھ.ق)، ص ۱۸۹.

(٤) شہرستانی، الملل و النحل (قم: منشورات الرضی)، ج ۲، ص ۲٥۷.

(٥) طباطبائی، المیزان (بیروت: موسسۃ الاعلمی للمطبوعات)، ج ۹، ص ۲۷۲.

(٦) شہرستانی، گزشتہ حوالہ، ص ۲٥٥؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۲.

عربوں کے درمیان بت پرستی کا آغاز

مختلف دستاویزات اور شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کے درمیان بت پرستی کے نفوذ کا اصلی سرچشمہ اوران کے درمیان بت پرستی کے آغاز کے دو سبب تھے۔

الف: عمرو بن لُحیّ (قبیلۂ خزاعہ کا سردار)نام کا ایک شخص، جو کہ اپنے زمانہ میں مکہ میں بہت زیادہ با اثر و قدرت مند اور کعبہ کا متولی تھا۔[۱] شام گیا اور وہاں پر عمالقہ[۲] کے ایک گروہ سے اس کی ملاقات ہوئی جو بت پرست تھے۔ جب اس نے ان لوگوں سے بت پرست ہونے کی وجہ دریافت کی تو ان لوگوں نے کہا: یہ ہمارے لئے بارش نازل کرتے ہیں، ہماری مدد کرتے ہیں" اس نے ان لوگوں سے ایک بت مانگا تو ان لوگوں نے اسے "ھبل" بت دیا اور وہ اسے لیکر مکہ آیا اور کعبہ میں نصب کردیا اور لوگوں سے کہا کہ اس کی عبادت کریں۔[۳]

---

(۱) ازرقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص۸۸، ۱۰۰، ۱۰۱؛ محمود آلوسی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب (قاہرہ: دار الکتب الحدیثہ، ط۳)، ج ۲، ص ۲۰۰؛ علی بن برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۱، ص۱۶۔

(۲) عمالقہ، جناب نوح کے لڑکوںکا ایک گروہ تھا ان کے جد عملاق یا عملیق کی مناسبت سے ان کا نام عمالقہ پڑا۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۸ اور ۷۹؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۱۸۸؛ علی ابن برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص۱۷.

(۳) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۰۱؛ شہرستانی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۴۳؛ علی بن برہان الدین الحلبی، گزشتہ حوالہ، ص۱۷؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۲۴؛ شہاب الدین الابشہی، المستطرف (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ج ۲، ص۸۸؛ مسعودی، مروج الذہب (بیروت: دار الاندلس، ط ۱)، ج ۲، ص ۲۹؛ ہشام کلبی، الاصنام، ترجمہ: سید محمد رضا جلالی نایینی، ۱۳۴۸)، ص۷؛ محمد بن حبیب، المنمق فی اخبار قریش، تحقیق: خورشید احمد فارق (بیروت: عالم الکتب، ط ۱، ۱۴۰۵ھ.ق)، ص ۳۲۸۔ بعض منابع میں آیا ہے کہ وہ "ہبل" کو عراق سے لایا تھا۔ (ازرقی، اخبار مکہ، ج ۱، ص ۱۱۷؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۷۹؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۱۸۸۔ لیکن ایک روایت کے مطابق، ھبل بت کا پتھر "مأزمین" (عرفات و مشعر کے درمیان ایک گزرگاہ ہے)، سے لیا گیا تھا، اوریہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ اس جگہ سے گزرتے تھے تو اظہار نفرت کرتے تھے (محمد بن حسن حر عاملی، وسائل الشیعہ، بیروت: دار احیاء التراث الاسلامی، ج ۱۰، کتاب الحج، باب استحباب التکبیر بین المأزمین) ص ۳۶، حدیث ۱.)

اس کے علاوہ دو بت "اساف"[۱] اور "نائلہ" کو بھی اس نے کعبہ کے پہلو میں رکھ دیا اور لوگوں کو ان کی پرستش کے لئے ابھارا اور ورغلایا[۲] اور اس طرح سے عرب میں بت پرستی کی بنیاد پڑی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: عمرو بن لحی پہلا وہ شخص تھا جس نے دین اسماعیل میں تحریف کی اور بت پرستی کی بنیاد ڈالی۔ اور میں نے اسکو آتش جہنم میں دیکھا ہے۔[۳]

ب: جب جناب اسماعیل کی نسل مکہ میں کافی بڑھ گئی تو وہ لوگ مجبور ہو کر ذریعہ معاش کی تلاش میں دوسرے شہروں اور علاقوں کی طرف کوچ کر گئے۔ اور چونکہ انھیں مکہ اور حرم سے بہت لگاؤ اور محبت تھی لہذا کوچ کرتے وقت ان میں سے ہر ایک نشانی اور یادگار کے طور پر حرم کا ایک پتھر اپنے ساتھ لے گیا اور جہاں پر جاکر وہ بسے اس کو ایک گوشہ میں رکھ کر (کعبہ کے گرد طواف کے مانند) اس کے گرد طواف کرتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اپنے اصلی جذبہ اور لگاؤ اور ہدف کو بھولتے گئے اور سارے پتھر ایک بت کی شکل میں تبدیل ہوگئے اور پھر نوبت یہ آگئی کہ جس پتھر کو وہ پسند کرتے تھے اسی کی پرستش کرنے لگتے تھے اور اس طرح وہ اپنے سابقہ آئین کو بھول گئے۔[٤]

البتہ اس علاقہ میں بت پرستی کے نفوذ کے لئے یہ دونوں اسباب نقطۂ آغاز قرار پائے ہیں ورنہ دوسرے عوامل جیسے جہل، حس گرائی (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا خدا ملموس اور محسوس

---

(۱) اساف کو ہمزہ کے زبر اور زیر دنوں طرح سے لکھا گیا ہے۔ (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۸٤۔

(۲) ازرقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۸۸؛ شہرستانی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲٤۳ اور ۳٤۷.

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۷۹؛ علی بن برہان الدین، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷؛ ابن عبد البر، الاستیعاب، (درحاشیہ الاصابہ)، ج ۱، ص ۱۲۰، شرح حال اکثم بن جون خزاعی؛ ابن اثیر، اسد الغابۃ (تہران: المکتبۃ الاسلامیہ)، ج ٤، ص ۳۹۰؛ شیخ محمد تقی التستری، الاوائل، ط ۱، ص ۲۱۷؛ ابی الفدا اسماعیل بن کثیر، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ عیسی البابی الحلبی، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج ۱، ص ٦٥؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱٦۔

(٤) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۲۰؛ المستطرف، ج ۲، ص ۸۸؛ ابی الفداء اسماعیل بن کثیر، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ٦۲؛ البدایہ و النہایہ (بیروت: مکتبۃ المعارف)، ج ۲، ص ۱۸۸؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۷۹؛ طباطبائی، المیزان، ج ۱۰، ص ۲۸٦۔

(مادی)، ہو۔[۱] قبیلہ جاتی اختلافات اور کشمکش، (ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اپنی لئے ایک الگ بت قرار دے) قبائل کے رئیسوں اور بزرگوں کی جاہ طلبی (وہ چاہتے تھے کہ عوام اسی طرح جہالت اور گمراہی میں پڑی رہے تاکہ وہ اچھی طرح سے حکمرانی کرسکیں) اور آخرکار گزشتہ لوگوں کی اندھی تقلید اس کی ترویج میں معاون ثابت ہوئی اور آہستہ آہستہ بت پرستی کی مختلف صورتیں اور عبادت کے مختلف طریقے، نذر و نیاز اور ان سے استمداد کے بے شمار طریقے انجام پانے لگے[۲] اور بتوں کی تعداد میں اس طرح سے اضافہ ہونے لگا کہ ہر گھر میں ایک بت پایا جانے لگا۔[۳] جس سے وہ سفر کے موقع پر برکت حاصل کرتے تھے اور اسے مس کرتے تھے فتح مکہ کے موقع پر ۳۶۰ بت اس شہر میں موجود تھے۔[٤]

کیا بت پرست، خدا کے قائل تھے؟

بت پرست "اللہ" کے منکر نہیں تھے اور جیسا کہ قرآن نے نقل کیا ہے کہ یہ لوگ بھی خدا کو، زمین و آسمان اور اس جہان کا خالق سمجھتے ہیں۔[۵] لیکن یہ دو بڑی خطاؤں کے مرتکب ہوگئے تھے جو ان کی

---

(۱) طباطبائی، المیزان، ج۱۰، ص۲۸۶۔

(۲) سورۂ انعام، آیت ۱۳۸، ۱۳۹؛ سورۂ مائدہ، آیت ۳، ۹۰، ۱۰۳، ہشام کلبی، الاصنام، ص۲۸۔

(۳) کلبی، گزشتہ حوالہ، ص۳۲۔

(٤) شیخ طوسی، الامالی، (قم: دار الثقافہ، ط۱، ۱٤۱٤ھ.ق)، ص۳۳٦؛ آلوسی، بلوغ الارب، ج۲، ص۲۱۱؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۱۲۱؛ السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص۳۰؛ رجوع کریں: المیزان، ج۲٦۔ امام رضا کی ایک روایت کی مطابق۔

(۵) اگر ان سے پوچھئے: کہ کس نے زمین و آسمانوں کو پیدا کیا ہے؟ تو یقینا وہ کہیں گے خدا نے (سورۂ لقمان، آیت ۲۵، سورۂ زمر، آیت ۳۸، زخرف، آیت ۹، اور اگر آپ ان سے سوال کریں گے کہ خود ان کا خالق کون ہے تو کہیں گے کہ اللہ (زخرف، آیت ۸۷، پیغمبر ذرا ان سے پوچھئے کہ تمہیں زمین و آسمان سے کون رزق دیتا ہے اور کون تمہاری سماعت و بصارت کا مالک ہے اور کون مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکالتا ہے اور کون سارے امور کی تدبیر کرتا ہے تو یہ سب یہی کہیں گے کہ اللہ! (یونس آیت ۳۱.)

گمراہی کی اصلی جڑ تھی۔

۱۔ اللہ اور اس کی صفات کے بارے میں غلط شناخت؛ وہ لوگ خدا کے بارے میں مبہم او رگنگ ذہنیت رکھتے تھے ۔ اور اس بات کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ وہ خدا کے لئے بیوی اور بچوں کے قائل تھے۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے یعنی خدا کے لئے انسان اور دوسرے جانداروں کی طرح جسم او رمادہ اور زاد و ولد کے قائل تھے۔ خداوند عالم نے ان کے غلط خیال کی متعدد آیات میں مذمت فرمائی ہے: "اوران لوگوں نے ان ملائکہ کو جو رحمان کے بندے ہیں لڑکی قرار دیدیا ہے کیا یہ ان کی خلقت کے گواہ ہیں تو عنقریب ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور پھر اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔(۱)

"بیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں وہ ملائکہ کے نام لڑکیوں جیسے رکھتے ہیں"۔(۲)

"اور مشرکوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اللہ نے کسی کو اپنا فرزند بنا لیا ہے حالانکہ وہ اس امر سے پاک و پاکیزہ ہے بلکہ وہ سب اس کے محترم بندے ہیں"۔(۳)

اس کے لئے بغیر جانے بوجھے بیٹے اور بیٹیاں بھی تیار کردی ہیں۔ جب کہ وہ بے نیاز اوران کے بیان کردہ اوصاف سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔

وہ زمین و آسمان کا ایجاد کرنے والا ہے۔ اس کے اولاد کس طرح ہو سکتی ہے اس کی تو کوئی بیوی بھی نہیں ہے اور وہ ہر شے کا خالق ہے اور ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔(٤)

"اور ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے اس نے کسی کو اپنی بیوی بنایا ہے نہ بیٹا"۔(٥)

---

(۱) سورۂ زخرف، آیت ۱۹.

(۲) سورۂ نجم، آیت ۲۷.

(۳) سورۂ انبیاء، آیت ۲٦.

(٤) سورۂ انعام، آیت ۱۰۱۔ ۱۰۰.

(٥) سورۂ جن، آیت ۳.

اس کے علاوہ خداوند عالم نے متعدد آیات میں مشرکوں کی مذمت فرمائی ہے کہ چونکہ وہ لڑکیوں کو برا سمجھتے تھے لہٰذا اسے خدا کی جانب منسوب کرتے تھے اور لڑکوں کو اچھا سمجھتے تھے لہٰذا اسے اپنی طرف منسوب کرتے تھے"

کیا خدا کے لئے لڑکیاں اور تمہارے لئے لڑکے ہیں!۔(۱)

"پھر اے پیغمبر! ان کفار سے پوچھئے کہ کیا تمہارے پروردگار کے لئے لڑکیاں ہیں اور تمہارے لئے لڑکے ہیں؟ یا ہم نے ملائکہ کو لڑکیوں کی شکل میں پیدا کیا ہے اور یہ اس کے گواہ ہیں؟"۔(۲)

"کیا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے اور منات جو ان کا تیسرا ہے اسے بھی دیکھا ہے تو کیا تمہارے لئے لڑکے ہیں اور اس کے لئے لڑکیاں ہیں یہ انتہائی ناانصافی کی تقسیم ہے یہ سب وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے طے کر لئے ہیں۔(۳)

"سچ بتاؤ کیا خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں سے اپنے لئے لڑکیوں کو منتخب کیا ہے اور تمہارے لئے لڑکوں کو پسند کیا ہے؟"۔(٤)

"اور انھوں نے خدا اور جنات کے درمیان بھی رشتہ قرار دیدیا حالانکہ جنّات کو معلوم ہے کہ انھیں بھی خدا کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا، خدا ان سب کے بیانات سے بلند و برتر اور پاک و پاکیزہ ہے"۔(٥)

ایک تفسیر کی بنا پر خداوند عالم کی جِنّ سے نسبت اور رشتہ داری اس بنا پر تھی کہ وہ خیال کرتے تھے کہ خدا نے جنات کے ساتھ شادی کر رکھی ہے اور فرشتے (اس شادی کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں) اس کی اولاد ہیں۔(٦)

---

(۱) سورۂ طور، آیت ۳۹.

(۲) سورۂ صافات، آیت ۱۵۰۔ ۱٤۹.

(۳)سورۂ نجم، آیت ۲۳۔ ۱۹؛ لات، عزیٰ اور منات تین بتوں کے نام تھے جن کو گویا وہ فرشتوں کا روپ سمجھتے تھے چونکہ تینوں نام مونث ہیں (رجوع کریں: تفسیر نمونہ، ج۲۲، ص۵۱۸).

(٤) سورۂ زخرف، آیت ١٦.

(٥) سورۂ صافات، آیت ۱۵۹۔ ۱۵۸.

(٦) سیوطی، الدر المنثور، ج۷، ص ۱۳۳؛ ابن کثیر، تفسیر، ج٤، ص ۲۳؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۸، ص ٤٦٠۔

۲۔ یہ بتوں کو چھوٹا خدا اور اپنے اور اللہ کے درمیان واسطہ بتاتے ہیں اور ان کی عبادت کو خدا کی بارگاہ میں قرب اور رضایت کا باعث سمجھتے تھے۔ جبکہ عبادت صرف اللہ سے مخصوص ہے۔

دوسری طرف سے اگرچہ بتوں کو دنیا کا "خالق" نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کے لئے ایک قسم کی ربوبیت اور عالم ہونے کے مرتبہ کے قائل تھے اور ان کو دنیا کے امور کی تدبیر میں اور انسان کے تقدیر میں موثر جانتے تھے اور اپنی مشکلات اور پریشانیوں کے دور ہونے کے لئے ان سے مدد مانگتے تھے۔ جبکہ اسلام کی نظر میں جس طرح دنیا کا خالق "اللہ" ہے اور امور دنیا کی تدبیر (توحید افعالی) بھی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے[۱] اور بت، بے جان اور ناقابل فہم و ارادہ موجودات ہیں۔

قرآن مجید ان کے بے بنیاد خیالات کو نقل کر کے، اس طرح ان کی مذمت کرتا ہے:

"اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ اور یہ لوگ کہتے ہیں: یہ خدا کے یہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم لوگ خدا کو اس بات کی اطلاع دے رہے ہو جس کا علم اسے آسمان و زمین میں کہیں نہیں ہے وہ پاک و پاکیزہ ہے اور ان کے شرک سے بلند و برتر ہے"۔[۲]

"آگاہ ہو جاؤ کہ خالص بندگی صرف اللہ کے لئے ہے اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ سرپرست بنائے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب

---

(۱) ۔ "و قل الحمد للہ الذی لم یتخذ ولداًولم یکن لہ شریک فی الملک و لم یکن لہ ولی من الذل و کبرہ تکبیراً۔" (سورۂ اسرائ، آیت ۱۱۱(، "قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر۔" (آل عمران، آیت ۲۶.)

(۲) سورۂ یونس،(۱۰) آیت ۱۸ (وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لاَيَضُرُّهُمْ وَلاَيَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللهَ بِمَا لاَيَعْلَمُ فِی السَّمَاوَاتِ وَلاَفِی الْاَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَی عَمَّا يُشْرِكُونَ)

کردینگے۔ اللہ ان کے درمیان تمام اختلافی مسائل میں فیصلہ کردے گا کہ اللہ کسی بھی جھوٹے اورناشکری کرنے والے کو ہدایت نہیں دیتا ہے"۔(۱)

"خدائے یکتا کے بجائے انھوں نے دوسرے خداؤں کو اختیار کر لیا تاکہ ان کی عزت کا سبب بنے"(۲)

"اوران لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنالئے ہیں کہ شاید ان کی مدد کی جائے"۔(۳)

اسی بنا پر بت پرست، عبادت اورامور عالم کی تدبیر میں بتوں کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں اور قرآن مجید ان کو "مشرک" قرار دیتا ہے۔

پریشان کن مذہبی صورتحال

بہرحال ظہور اسلام کے وقت، بت پرستی وسیع پیمانے پر اپنی تمام صورتوں اورپہلوؤں کے ساتھ حنیفیت کے چہرے کو مسخ کرچکی تھی۔ اوردینی لحاظ سے مشرکین کی بہت بری حالت ہوچکی تھی ایک طرف سے بت پرست بت پرستی اوراس کے رسومات کے سختی سے پابند تھے اوردین ابراہیم کی بچی ہوئی تعلیمات جیسے حج، عمرہ اور قربانی کو ناقص، تحریف شدہ، خرافات او رشرک آمیز باتوں سے آمیختہ شکل میں انجام دیتے تھے مثلاً کعبہ کی تعظیم کے ساتھ دوسری بھی عبادت گاہیں بنا رکھی تھیں کہ جہاں کعبہ کی طرح طواف کرتے تھے اوران کے لئے ہدیہ بھیجتے تھے او روہاں پر قربانی کرتے تھے۔(٤)کعبہ کے پاس ان کی نمازیں صرف شور و غل او رتالی بجاکر ہوتی تھیں۔(٥) قبیلۂ قریش والے احرام حج اور "لبیک"

---

(۱) سورۂ زمر،(۳۹)(ٌلاَلِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ وْلِيَائَ مَا نَعْبُدُهُمْ لاَّ لِيُقَرِّبُونَا لَی اللهِ زُلْفَی نَّ اللهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِی مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ نَّ اللهَ لاَيَهْدِی مَنْ هُوَ كَاذِب كَفَّار)آیت ۳۔

(۲) سورۂ مریم، (۱۹)(وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا)آیت ۸۱.

(۳) سورۂ یٰس،(۳٦)(وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللهِ آلِهَةً لَعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ)آیت ۷٤.

(٤) ابی الفداء اسماعیل بن کثیر، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ عیسی البابی الحلبی، ۱۳۸٤ھ۔ق)، ج ۱، ص ۷؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج ۱، ص ۸۵.

(٥) سورۂ انفال، آیت ۳۵۔

کہتے وقت خدا کے نام کے ساتھ بتوں کا نام لیتے تھے۔[١]

اور اس طرح سے حج ابراہیمی کو جو کہ توحید کا عالی ترین نمونہ ہے شرک سے آلودہ کرتے تھے۔ دو قبیلے اوس اور خزرج، حج کے اعمال انجام دینے کے بعد، منیٰ میں جاکر سر منڈوانے کے بجائے اپنے شہر (یثرب) کی جانب "بت منات" (جو کہ مکہ کے راستے میں دریا کے کنارے پر واقع ہے)،[٢] کے پاس سر منڈاتے تھے۔[٣] مشرکین (خواہ مرد ہوں یا عورت) کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے۔[٤] ظاہر ہے کہ کعبہ کے پاس لوگوں کے سامنے اس طرح کے اعمال کا کتنا برا منظر رہتا رہا ہوگا۔

قریش اپنے بتوں کو کعبہ کے پاس رکھتے تھے اور اسے مشک وعنبر سے معطر کرتے تھے اور ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے پھر اس کے چاروں طرف جمع ہوکر لبیک کہتے تھے۔[٥] اگرچہ وہ ظاہری طور پر چار مہینوں کی حرمت کا خیال کرتے تھے لیکن اپنے کو اس حکم سے آزاد رکھنے کے لئے ان مہینوں کے نام اور ظاہری لحاظ سے ان کو تبدیل کرکے حرام مہینوں کو بعد میں کردیتے تھے۔[٦]

---

(١) لبیک اللھم لبیک، لاشریک لک لبیک الا شریک ھو لک تملکه و ما ملک۔ (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٨٠؛ ابن کثیر، گزشتہ حوالہ، ص ٦٣؛ شہرستانی، الملل و النحلل، ج ٢، ص ٢٤٧؛ ابن کثیر البدایہ والنہایہ، ج ٢، ص ٨٨.)

(٢) ہشام کلبی، الاصنام، ترجمہ: سید محمد رضا جلالی نایینی، ١٣٤٨، ص ١٣؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ١، ص ٨٨؛ آلوسی ٧ بلوغ الارب، ج ٢، ص ٢٠٢۔

(٣) ہشام کلبی، گزشتہ حوالہ، ص ١٤۔

(٤) ازرقی، اخبار مکہ، ج ١، ص ١٧٨ اور ١٨٢؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٢٤٤؛ صحیح مسلم بشرح النووی، ج ١٨، کتاب التفسیر، ص ١٦٢۔

(٥) طباطبائی، تفسیر المیزان، ج ١٤، ص ٤١٤۔

(٦) سورۂ توبہ، ٩، آیت ٣٧؛ ازرقی، اخبار مکہ، ج ١، ص ١٨٣؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٤٥.

ظہور اسلام کی روشنی میں بنیادی تبدیلی

ظہور اسلام اور روزبروز اس کے فروغ کے ساتھ اہل حجاز کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں گہری او روسیع پیمانہ پر تبدیلی رونما ہوئی۔ اور ایک مکمل انقلاب اور تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ اس کے اثرات جزیرۃ العرب کے چاروں طرف پھیل گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی مسلسل او رپیہم جنگ کے ذریعہ اس بت پرستی کو جوان کی تمام بدبختیوں کی جڑ تھی، اکھاڑ پھینکا اور نظام توحید کو اس کی جگہ پر پیش کیا اور قبائلی اور قومی نظام نیز غلط رسم و رواج کو ختم کردیا اور قومی عصبیت کو مٹا کر اس کی جگہ پر حق وعدل کی تعلیم دی۔ جذبۂ انتقام اور قبائلی قتل و غارت کو صلح و آشتی میں بدل دیا اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنادیا۔ عورت کو قید و بدبختی سے نجات دلائی اور اسے سماج میں بلند مقام عطا کیا۔ اور جاہل عوام سے آگاہ امتی بنا دیا۔

قبائلی نظام کے بدلے، امت اور امامت کا نظام قائم کیا اور عرب کے بکھرے اور پراگندہ قبائل کو "ایک امتی" بنادیا۔ ان کو قبائلی زندگی کے تنگ دائرہ سے نکال کر عالمی نظام کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور اسلام کی روشنی میں قوم عرب کو ایسی عظمت و طاقت بخشی کہ دو عظیم حکومتوں کی بنیادوں کو ہلاکر رکھ دیا اور یہ بات اتنی واضح اور روشن تھی کہ غیر مسلم مصنفوں اور دانشوروں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ بطور نمونہ ان میں سے تین لوگوں کے خیالات یہاں پر پیش کر رہے ہیں:

ڈاکٹر گوستاد لوبون فرانسوی کہتا ہے: "پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک عظیم معجزہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنی وفات سے قبل عرب کے پراگندہ قافلے کو ایک جگہ جمع کردیا اور اس سرگرداں اور پریشان کاروان سے، ایک ملت کی تشکیل دی اور اس طرح سب کو ایک دین کے سامنے تسلیم کے ساتھ ایک پیشوا اور رہبر کا مطیع اور فرمانبردار بنادیا...

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی زحمتوں سے ایسے نتائج حاصل کئے کہ اسلام سے قبل کوئی بھی دین خواہ وہ یہودیت ہو یا عیسائیت کسی نے ایسے نتائج نہیں حاصل کئے ۔ اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کا عربوں کی گردن پر بہت بڑا حق ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ کسی ذات کی قدر و اہمیت کا اندازہ اس کے کردار او رنیک آثار کے ذریعہ لگائیں تو قطعی اور مسلم طور سے حضرت محمد ﷺ سب سے عظیم مرد تاریخ قرار پائیں گے ۔ ہم اس عظیم دین کو جسے آپ لیکر آئے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی، اس کے ماننے والوں کے لئے خدا کی جانب سے عظیم نعمت سمجھتے ہیں۔(۱)

توماس کارلایل انگریز کہتا ہے: خداوند عالم نے عرب کو اسلام کے ذریعہ، تاریکی سے اجالے اور روشنی کی طرف ہدایت فرمائی اور اس کی روشنی میں عرب کی خاموش قوم کو اس مردہ سرزمین پر زندہ کردیا، جبکہ عرب آغاز خلقت سے بے نام و نشان صحراوؤں میں، تہی دست تھے جو دیہاتوں میں زندگی بسر کرتے تھے نہ ان کی آواز سنائی پڑتی ہے اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی حرکت اور جنبش نظر آتی ہے۔ خداوند عالم نے جس وقت ایک پیغمبر کو نور وحی اور رسالت کے ساتھ ان کی ہدایت کے لئے بھیجا تو ان کی گمنامی کو شہرت میں اور ان کی حیرت او ر سرگردانی کو بیداری میں اور ان کی پستی و حقارت کو سربلندی میں اور عاجزی و ناتوانی کو قدرت مندی میں تبدیل کردیا۔ اس کا نور جہاں چمکا اس کی روشنی سے وہاں کی جگہ منور ہو گئی اور اس کی ہدایت کی روشنی دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب تمام سمتوں میں اس طرح پھیل گئی کہ ظہور اسلام کو ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ اسلامی حکومت نے اپنا ایک قدم ہندوستان اور دوسرا قدم اسپین میں رکھ دیا۔(۲)

ویل ڈورانٹ لکھتا ہے: اس وقت کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا کہ ایک صدی بعد، یہ خانہ بدوش حکومت روم کے ماتحت رہنے والے علاقے نصف ایشا، پورے ایران، مصر اور شمال افریقا کا زیادہ تر علاقہ فتح کر کے، اسپین کی طرف بڑھ جائیں گے۔ سچ ہے کہ یہ تاریخی سورج جو عربستان

---

(۱) تمدن اسلام او رغرب، ترجمہ: سیدہاشم رسولی (تہران: کتابفروشی اسلامی)، ص ۱۳۰ ۔ ۱۲۸.

(۲) الابطال، عربی ترجمہ: محمد السباعی کے قلم سے (قاہرہ: ط۳، ۱۳۴۹ھ.ق)، ۹.

سے طلوع ہوا تھا اس کے ذریعہ عرب مڈیٹرانہ کے نصف علاقے پر مسلط ہوگئے اوردین اسلام کو وہاں پر پھیلانا، قرون وسطیٰ کے حیرت انگیز اجتماعی واقعات میں سے ہے۔[1]

شہر مکہ کی توسیع اور مرکزیت

پہلے یہ بیان کرچکے ہیں کہ جزیرۃ العرب کے زیادہ تر لوگ زمانۂ جاہلیت میں بادیہ نشین اور صحرانورد ہوتے تھے۔ کیونکہ شہر نشینی حجاز کے علاقہ میں زیادہ رائج نہیں تھی اس علاقہ میں آبادیوں کے لحاظ سے جسے شہر کہا جاتا تھا درحقیقت وہ چھوٹے شہر ہوا کرتے تھے ۔ جس میں زیادہ آبادی نہیں ہوا کرتی تھی۔ بعض معاصر مورخین اس علاقہ کے شہر نشینوں کی آبادی کو ۱۶ [2] اور بعض دوسرے مورخین پوری آبادی کا ۱۷ فیصد[3] حصہ سمجھتے تھے ۔ اس محاسبہ کا اصول واضح نہیں ہے لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ شہر نشینوں کی آبادی کا تناسب فیصد کے لحاظ سے بہت کم ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے صرف شہر مکہ میں جو حجاز کے جنوبی علاقہ (بحر احمر سے تقریباً ۸۳... کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے) میں ایک اہم شہر تھا، ظہور اسلام سے چند صدی قبل اس میں توسیع ہوئی اور آہستہ آہستہ وہاں بہت سارے لوگ آکر بس گئے ۔

مکہ کی توسیع کے دو اسباب تھے:

الف: تجارتی مرکز:

چونکہ شہر مکہ ایک خشک و بے آب و گیاہ اور سنگلاخ علاقہ میں واقع ہے لہٰذا زراعت یا کارخانے اور فیکٹریوں کے لگانے کے امکانات اور وسائل وہاں مہیا نہیں تھے

---

(۱) ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن، ج ٤، عصر ایمان، (بخش اول)، ترجمہ: ابوطالب صارمی (تہران: سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، ط ۲، ۱۳٦۸، ص ۱۹۷.

(۲) ویل ڈورانٹ، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۰.

(۳) فیلیپ حتی، تاریخ عرب، ترجمہ: ابوالقاسم پایندہ، ۱۳٤٤، ج ۱، ص ۱۲۵.

وہاں کے لوگ قدیم زمانے سے مجبور تھے کہ اپنی زندگی، تجارت کے ذریعہ چلائیں۔ لیکن ان کی تجارت صرف مکہ تک محدود تھی۔[1]

عرب کے علاوہ دوسرے تاجر اپنے مال کو مکہ میں لاکر بیچتے تھے۔ تجارتی مال شہر کے تاجروں کے ذریعہ خریدا جاتا تھا اور پھر شہر میں بیچا جاتا تھا۔[2] یا جزیرة العرب کے اندر فصلی بازار میں لیجا کر وہ بیچتے تھے۔ یہاں تک کہ جناب ہاشم (پیغمبر اسلام ﷺ کے دوسرے جد) نے امیر شام (جوکہ حکومت روم کا پٹھو تھا) کے ساتھ ایک پیمان باندھا، تاکہ مکہ کے تجار آزادی کے ساتھ اس ملک سے آمد و رفت کر سکیں۔[3]

اس کے علاوہ انھوں نے ایسے قبائل سے پیمان باندھا جو شام کے راستے میں واقع تھے تاکہ مکہ کے تجارتی قافلوں سے تعرض نہ کریں اور ان سے عہد کیا کہ ان کی اشیاء تجارتی بغیر کرایہ لئے ہوئے تجار مکہ کے توسط سے محل تجارت تک پہنچائی جائیں گی۔[5] اور آپ کے بھائیوں (عبد الشمس، نوفل اور مطلب) نے بھی اسی طرح کے عہد و پیمان، حاکم حبشہ، شہنشاہ ایران[6] اور شہنشاہ یمن[7] کے ساتھ کئے۔

راستوں کی امنیت کے بعد، جناب ہاشم نے یمن اور شام میں تجارتی خطوط کی بنیاد ڈالی[8] کہ

---

(۱) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: مکتبة الحیدریه، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج ۱، ص ۲۱۵.

(۲) محمد بن حبیب بغدادی، المنمق فی اخبار قریش، تحقیق: خورشید فارق (بیروت: عالم الکتب، ط ۱، ۱٤۰۵ھ.ق)، ص ٤۲

(۳) ابن واضح، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۱٤.

(٤) گزشتہ حوالہ، ص ۲۱۳.

(۵) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۷۸.

(٦) ابن واضح، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۱۵.

(۷) محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار قاموس الحدیث)، ج ۲، ص ۱۸۰؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، (بیروت: دار صادر)، ج ۲، ص ۱٦.

(۸) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۱۸۰؛ ابن ہشام، السیرة النبویه، (قاہرہ: مطبع مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج ۱، ص ۱٤۳.

جس کا حلقۂ اتصال مکہ تھا، جو ان دو تجارتی مرکز کے نصف راستے میں واقع تھے۔[۲] اس طرح سے قریش نے دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کا آغاز کیا۔[۳] اس وقت سے مکہ کے تجار، فصلی بازاروں جیسے "عکاظ، ذوالمجاز اور مجنہ" میں شرکت کرنے کے علاوہ جاڑے کی فصل میں یمن، حبشہ اور گرمی کی فصل میں شام اور غزہ کا سفر کرتے تھے۔

وہ لوگ ان مسافرتوں میں عطریات، بخور، ریشمی لباس، چمڑا اور دوسروں چیزوں کو جو ہندوستان، چین اور دوسرے علاقوں سے یمن میں آیا کرتی تھیں خرید کر خشکی کے راستے سے تمام جزیرۃ العرب ینّخضر موت کے راستہ بحراحمر[٤] کے سامنے سے ہوتے ہوئے مکہ ینّلایا کرتے تھے پھر غزہ، بیت المقدس، دمشق اور بحر مڈیٹرانہ کی بندرگاہ تک پہنچایا کرتے تھے۔ اور شام کے بازاروں سے گیہوں، تیل، زیتون، لکڑی، اور ریشم کی بنی ہوئی چیزوں کو خریدتے تھے۔ اسی طرح سے جدہ کی بندرگاہ کے ذریعہ (جو کہ مکہ سے ۸۰ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے) بحر احمر کو عبور کر کے حبشہ میں داخل ہوتے تھے اور اس طرح علاقائی چیزوں کو دوسری جگہ لیجاتے تھے۔[٥]

اس تجارتی راہ کے کھلنے سے، شہر مکہ، ایک پر منفعت تجارتی مرکز میں تبدیل ہوگیا اور وہاں کے رہنے والوں کی زندگی میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور خدوند عالم نے اس تجارتی سفر کی برقراری کو قریش کے لئے راحت وآرام کا سبب قرار دیا ہے "قریش کے انس والفت کی خاطر، جو انھیں سردی اور

---

(۱) احمد امین، فجر الاسلام، (قاہرہ: مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ط ۹، ١٣٦٤.)، ص ١٤ ـ ١٢؛ ڈاکٹر شوقی ضیف.

(۲) طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ؛ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ص ١٦.

(۳) احمد امین، گزشتہ حوالہ، ص ١٢؛ عبد المنعم ماجد، التاریخ السیاسی للدولۃ العربیہ)، (قاہرہ: مکتبۃ الا نجلوا المصریہ) ص ٧٩.

(٤) حسن ابراہیم حسن، تاریخ سیاسی اسلام، ترجمہ: ابو القاسم پایندہ (تہران: انشارات جاویدان، ط ٤ ١٣٦٠ھ.ق)، ص ٥٦.

گرمی کے سفر سے ہے ابرہہ کو ہلاک کردیا ہے۔ لہٰذا انھیں چاہئے کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے انھیں بھوک میں سیر کیا ہے اور خوف سے محفوظ رکھا"۔[۱]

ب: کعبہ کا وجود:

شہر مکہ کی توسیع اور اس کی اقتصادی رونق کا ایک دوسرا سبب کعبہ کا وجود تھا کیونکہ عرب کے لوگ سال میں دوبار اعمال حج انجام دینے کے لئے اس شہر میں آتے تھے اور قریش جو کہ کعبہ سے متعلق مختلف امور کے ذمہ دار تھے حجاج کے قیام و طعام کا انتظام کرتے تھے۔ دوسری طرف سے اعمال حج کے ساتھ زائروں اور مکہ کے تاجروں کے درمیان تجارتی معاملات بھی انجام پاتے تھے۔[۲] اور یہ دو چیزیں شہر کی توسیع اور اقتصادی رونق میں مددگار ثابت ہوئیں۔

البتہ سرزمین حرم کا تقدس واحترام بھی جو کہ اطراف حرم میں امن و سکون کا سبب بنا ہوا تھا مکہ کی تجارتی رونق میں بہت زیادہ موثر ثابت ہوا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اور یہ کفار کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ حق کی پیروی کریں گے تو اپنی زمین سے اچک لئے جائیں گے۔ تو کیا ہم نے انھیں ایک محفوظ حرم پر قبضہ نہیں دیا ہے جس کی طرف ہر شی ء کے پھل ہماری دی ہوئی روزی کی بنا پر چلے آرہے ہیں لیکن ان کی اکثریت سمجھتی ہی نہیں ہے"۔[۳]

جناب ابراہیم نے بھی اپنی شریک حیات اور بچونکو کعبہ کے پاس ٹھہرانے کے بعد خدا کی بارگاہ میں اس طرح سے دعا فرمائی: "پروردگارا! میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو تیرے محترم مکان کے قریب بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ دیا تاکہ نمازیں قائم کریں اب تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف موڑ دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکر گزار بندے بن جائیں"۔[٤]

---

(۱) سورۂ قریش، آیت ٤۔ ۱.

(۲) عباس زریاب، سیرۂ رسول اللہ ﷺ (تہران: سروش، ط ۱، ۱۳۷۰)، ص ٦٧۔ ٦٦.

(۳) سورۂ قصص، آیت ۵۷.

(٤) سورۂ ابراہیم، آیت ۳۷.

"اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی کہ پروردگار اس شہر کو امن کا شہر قرار دیدے اور اس شہر کے ان لوگوں کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں پھلوں کا رزق عطا فرما"۔[۱]
ارشاد ہوا کہ پھر جو کافر ہو جائیں گے انھیں دنیا میں تھوڑی نعمتیں دے کر آخرت میں عذاب جہنم میں زبردستی دھکیل دیا جائے گا جو بدترین انجام ہے۔

قریش کی تجارت اور کلیدبرداری

دو چیزیں، تجارت اور کعبہ کا وجود، شہر مکہ کی توسیع اور مرکزیت کا سبب قرار پائیں اور مکہ میں قریش کے اقتدار کے اضافہ کا باعث بھی بنیں کیونکہ اقتصادی طاقت اور کعبہ کے سارے مذہبی پروگرام ان کے اختیار میں تھے۔

۱۔ قریش نے آہستہ آہستہ تجارت کے ذریعہ بے شمار دولت جمع کر لی اور مکہ میں بڑے بڑے ثروت مند پیدا ہو گئے جن میں بعض کی دولت و ثروت کی مقدار مبالغہ آمیز بتائی گئی ہے۔ جیسا کہ ان میں سے ایک کی دولت کی مقدار ایک قافلہ میں تیس ہزار دینار سے زیادہ تھی۔[۲]

قریش کی اہم شخصیتوں کے پاس سیاحتی علاقے اور طائف جیسی پاکیزہ جگہ جو آب و ہوا کے لحاظ سے سرزمین شام کا ایک حصہ سمجھی جاتی ہے۔[۳] باغات اور سیاحتی مراکز موجود تھے۔[٤] عباس ابن

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۱۲٦.

(۲) جواد علی، المفصل فی التاریخ العرب (بیروت: دار العلم للملایین، ط ۱، ۱۹٦۸ئ)، ج ۱، ص ۱۱٤ ـ گویا مقصود، سعید ابن العاص (ابی احیحہ) ہے کہ واقدی کے بقول (المغازی، ج ۱، ص ۲۷) شام سے پلٹتے وقت جنگ بدر کے موقع پر قریش کے قافلہ کی سب سے زیادہ دولت اس کے پاس تھی۔ لیکن واقدی کی عبارت اس صراحت کے ساتھ نہیں ہے۔

(۳) فیلیپ حتی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۰ .

(٤) طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۲۱؛ بلاذری، فتوح البلدان، (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۸ھ.ق)، ص ٦۸۔

عبد المطلب کے پاس طائف میں انگور کا باغ تھا کہ جس کا انگور شراب بنانے کے لئے مکہ جایا کرتا تھا[۱] او روہ مکہ کے بڑے سودخوروں میں سے تھا[۲] عبد المطلب کے مرنے کے بعد انھیں دو یمنی کپڑوں میں لپیٹا گیا جس کی قیمت ہزار مثقال سونا تھی۔[۳] (جس سے ان کے ورثہ کی دولت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے)، کہا جاتا ہے کہ ان کی لڑکی "ہند" نے ایک دن میں چالیس غلاموںکو آزاد کیا۔[٤] ولیدبن مغیرہ (قبیلۂ بنی مخزوم کا سردار) جس کے پاس بے شمار دولت اور متعدد اولادیں تھیں وہ ہر جگہ مشہور تھا۔[٥] بعد ییٔغرور اور گھمنڈکی بناپر، قرآن نے اس کی سرزنش کی[٦] عبداللہ بن جدعان تیمی کی دولت اور اس کی عمومی مہمان نوازی افسانے کے طور پر نقل ہوئی ہے۔[۷] شعرائ، انعام و اکرام کی خاطر اس کی مدح سرائی کرتے تھے۔[۸]

ایک شاعر نے اس کو "قیصر" سے تشبیہ دی تھی۔[۹] کہتے ہیں کہ اس نے قبیلہ جاتی جنگ میں اپنے

---

(۱) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ٦٨۔

(۲) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص ۲٥۱

(۳) ابن واضح، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۰۔

(٤) شوقی ضیف، گزشتہ حوالہ، ص ٥۱؛ جاحظ، المحاسن و الاضداد (بیروت: دارمکتبہ عرفان)، ص ٦۲۔ فصل محاسن السخائ)۔

(٥) ایک تفسیر کے مطابق۔ آیت "لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم۔" (سورۂ زخرف، آیت ۳۱.) میں دو بڑی شخصیتوں سے مرادمکہ میں ولید ابن مغیرہ، اور طائف میں عروہ ابن مسعود ثقفی تھے کہ مشرکین ان کی بے شمار دولت کی بنیادپر انھیں نبوت کے لئے نامزد کئے ہوئے تھے۔

(٦) طباطبائی، تفسیر المیزان، ج۲، ص ۹۳؛ ابن کثیر، تفسیر، ج٤، ص ٤٤۲؛ تفسیر سورۂ المدثر۔

(۷) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبۃ المعارف، ط۲، ۱۹۷۷ئ)، ج۲، ص ۲۲۹؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۸۹؛ محمد احمد جاد المولی بک (و معاونین)، ایام العرب فی الجاہلیہ (بیروت: داراحیاء التراث العربی)، ص ۲٤۸۔

(۸) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ۸۷؛ ابن کثیر، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۹۔

(۹) یوم بن جدعان، بجنب الحزورۃ

کانہ قیصرا و ذوالد سکرہ

(بکری، معجم ما ستعجم، عالم الکتب، ط۳، ۱٤۰۳ھ.ق)، ج۲، ص ٤٤٤؛ لفظ حزورہ؛ شوقی ضیف، گزشتہ حوالہ، ص ٥۱.)

ساتھیوں اور لڑنے والوں کو ۱۰۰۰ اونٹ دے رکھے تھے۔[۱] اور سو (۱۰۰) لوگوں کو اپنے خرچ پر مسلح کیا تھا۔[۲] وہ غلاموں کو رکھتا تھا او رکنیزوں کو فروخت کرتا تھا۔[۳] اور سونے کے برتن میں پانی پیتا تھا۔[٤] پیغمبر اسلام ﷺ نے فتح مکہ کے بعد جس وقت جنگ حنین کے لئے روانہ ہوئے۔ تو صفوان امیہ (مکہ کا ایک مشرک) سے سو (۱۰۰) زرہ اور ضروری اسلحے امانت کے طور پر لئے۔[۵]

۲۔ دوسری طرف سے، قریش نے قصی (رسول خدا ﷺ کے چوتھے جد) کے زمانہ سے کعبہ کی کنجی قبیلۂ خزاعہ کے ہاتھوں سے لے رکھی تھی۔[٦] اورحج و زیارت اور طواف سے مربوط مختلف ذمہ داریاں، جیسے حاجیوںکے لئے پانی کی فراہمی (سقایہ) او رقیام و طعام کا انتظام (رفادہ) کعبہ کی دربانی اورپردہ داری (سدانہ) اور کعبہ کی نگہبانی اورخدمت گزاری (عمارہ) قریش کے مختلف

---

(۱) محمد احمد جاد المولی بک، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳٤۔

(۲) گزشتہ حوالہ، ص ۳۲۹۔

(۳) ابن قتیبہ، المعارف، تحقیق: ثروت عکاشہ (قم: منشورات الشریف الرضی، ط ۱، ۱٤۱۵ھ.ق)، ص ۵۷٦؛ مسعودی، مروج الذہب، (بیروت: دار الاندلس، ط ۱)، ج ۲، ص ۲۸۷؛ جواد علی، گزشتہ حوالہ، ص ۹٦۔

(٤) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ص ۸۷۔

(۵) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ٤، ص ۸۳؛ واقدی، المغازی، تحقیق: مارسڈن جانس، ج ۳، ص ۸۹۰؛ ابن سعد، طبقات الکبری، (بیروت: دار صادر)، ج ۲، ص ۱۵۰؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۳، ص ٦۳۔ اسی طرح رسول خدا اپنے چچازاد بھائی نوفل بن حارث بن عبد المطلب سے تین ہزار نیزہ، امانت کے طورپر لیا (حلبی، گزشتہ حوالہ)، یہ سب ان کے عظیم مالی اقتدار کی علامت تھا۔

(٦) ازرقی، اخبار مکہ، تحقیق: رشدی الصالح ملحس (قم: منشورات الرضی، ط ۱، ۱٤۱۱ھ.ق)، ج ۱، ص ۱۰۷؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۳۰۔

سرداروں کے درمیان بٹی ہوئی تھی اور اس طرح سے انھیں مذہبی حمایت بھی حاصل تھی۔

اس کے علاوہ شہر کے اجتماعی امور کو بھی جیسے پرچم داری، دیت اور نقصان کا بدلہ دینے میں نظارت اور اختلافات کو ختم کرنے کی نمایندگی کو اپنے قبیلوں کے درمیان بانٹ کر شہر کے کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔[۱]

قریش کا اقتدار اور اثر و رسوخ

قریش جن کا شمار ایک زمانہ میں ایک چھوٹے خاندان میں ہوا کرتا تھا اور فقیر و تنگدست سمجھے جاتے تھے اور جنوب حجاز میں انکا کوئی مقام ودرجہ نہیں تھا وہ اپنے اقتصادی اور دینی انتظامات کی بنا پر آہستہ آہستہ عرب کے ایک طاقتور قبیلہ کی شکل میں ظاہر اور معروف ہوئے۔

اور شرف و بزرگی اور اہمیت کے اعتبار سے اپنے کو دوسرے قبیلوں سے بلند کردیا۔ ایک معاصر مورخ کے کہنے کے مطابق اس وقت قبیلۂ قریش حجاز کے تمام قبیلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ امتیازات و خوبیاں رکھتا تھا۔ جس طرح سے لاوی لوگ حجاز کے یہودیوں کے درمیان اور راہب عیسائیوں کے درمیان امتیاز رکھتے تھے۔[۲]

خاص طور سے ہاتھیوں کے لشکر اور ابرہہ کی شکست کے بعد قریش جو کہ کلیدار کعبہ تھے ان کا احترام لوگوں کی نظروں میں بڑھ گیا۔[۳] اور انھوں نے اس واقعہ سے اپنے حق میں اور فائدے

---

(۱) ابن عبد ربہ (العقد الفرید، (بیروت: دار الکتاب العربی، ۱٤۰۳ھ.ق) ج۳، ص ۳۱٤؛ احمد امین، گزشتہ حوالہ، ۲۲۷؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱٤۵؛ البتہ یہ اقدامات بعض عیسائی مورخین جیسے جرجی زیدان اور لامنس کے تصور کے برخلاف، اس دور کے حکومتی محکموں اور دفتروں جیسا نہیں تھا بلکہ ایک ابتدائی اور قبیلہ کی شکل رکھتا تھا۔

(۲) فیلیپ حِتی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۔

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۵۹؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۷٦۔

اٹھائے۔ اپنے کو "آل اللہ ، جیران اللہ اور سکان اللہ" کہتے تھے۔[۱] اور اس طرح انہوں نے اپنے مذہبی مراکز کو ہموار کیا اور ان کی قدرت و طاقت کے احساس نے انھیں فساد اور انحصار طلبی کی طرف مائل کردیا۔[۲] اور اس طرح سے انھوں نے دوسرے قبائل پر اپنی طرف سے نئے قوانین کا سلسلہ تھوپ دیا۔ مثلاً قریش دوسرے قبیلوں سے بغیر کسی شرط کے لڑکی لاتے تھے۔ لیکن اپنی لڑکیوں کو اس شرط پر انھیں دیتے تھے کہ قریش کی خاص دینی بدعتیں مخصوصاً اعمال حج اور طواف کو وہ قبول کرلیں۔[۳] اور جو مسافر مکہ میں داخل ہوتے تھے ان سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔[٤] اور اسے قریش کا حق سمجھتے تھے۔[٥] اس کے علاوہ حج کا پروگرام وہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر حاجیوں کو اپنے قوانین کا اس طرح تابع بناتے تھے کہ حاجیوں کی روانگی منی اور رمی جمرات سے ان کی اجازت پر موقوف ہوتی تھی۔[٦]

اسی طرح قریش اہل مکہ کے علاوہ دوسرے حاجیوں کو مجبور کرتے تھے کہ طواف کا لباس ان سے خریدیں ورنہ برہنہ طواف کریں اور اگر انھوں نے اپنے لباس میں طواف کیا تو طواف کے بعد

---

(۱) ابن عبد ربہ، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۱۳؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷٦۔

(۲) ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷٦۔

(۳) گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۹؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲٤۳۔

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۷۰۔

(٥) جواد علی، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ۲۱۔

(٦) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ٦۹؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۲٥، ۱۳۰؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۲۰؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۸۹۔

اسے پھینک دیں۔[۱] (تاکہ مجبور ہوکر قریش سے لباس خریدیں) اور حاجیوں کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ اپنے پاس موجود غذا کو استعمال کریں بلکہ اہل مکہ کی تیار کردہ غذا استعمال کریں۔[۲] (اور ان کے بازاروں سے غذائیں خریدیں) ۹ھ میں پیغمبر اسلام ﷺ نے علی کو مکہ بھیجا تاکہ مشرکین سے برائت کا اعلان کریں۔ قطعنامہ کی ایک شق جس کا علی نے حج کے عمومی پروگرام میں اعلان کیا یہ تھی کہ آج کے بعد سے کوئی بھی کعبہ کا برہنہ طواف نہ کرے۔[۳]

مکہ میں قریش کے اثر ورسوخ کا پتہ لگانا اس اعتبار سے قابل اہمیت ہے کہ ہم اس کے ذریعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کی پریشانیوں اور مشکلات کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور پھر غور کریں کہ آنحضرت ﷺ کا سامنا کتنے بڑے اور طاقتور دشمن سے تھا۔ خاص طور پر مکہ میں دعوت اور تبلیغ دین کے دوران بغیر کسی قوت و طاقت ونیز محدود حامیوں کے ساتھ، قریش سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے پنجہ سے پنجہ لڑا دیا!

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۷۲؛ ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷٤، ۱۷۸، ۱۸۲؛ کعبہ کا برہنہ طواف جس کے بارے میں پہلے بیان کرچکے ہیں اور نیز اس خاتون کی داستان جس نے بہت ہی بری حالت میں طواف کیا اور کہتی تھی: الیوم یبدو بعضہ او کلہ۔ و ما بدا منہ فلا احلہ، اس سختی اورانحصار طلبی کے نتیجہ میں تھا (ازرقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۷۸، ۱۸۲؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ۱۹۰؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ص ۲٤٤؛ صحیح مسلم بشرح النووی، ج۱۸، ص ۱٦۲، کتاب التفسیر.)

(۲) ازرقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۷.

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ۱۹۰.

دوسرا حصہ

حضرت محمد ﷺ ولادت سے بعثت تک

پہلی فصل: اجداد پیغمبر اسلام ﷺ

دوسری فصل: حضرت محمد ﷺ کا بچپن اور جوانی

تیسری فصل: حضرت محمد ﷺ کی جوانی

پہلی فصل

اجداد پیغمبر اسلام ﷺ

حضرت محمد مصطفی ﷺ کا حسب و نسب

حضرت محمد مصطفی ﷺ کے سلسلۂ نسب میں، آپ کے بیس اجداد کا تذکرہ اس طرح سے موجود ہے:

عبد المطلب، ہاشم، عبد مناف، قصی، کلاب، مرہ، کعب، لوی، غالب، فہر، مالک، نضر، کِنانہ، خزیمہ، مدرکہ، الیاس، مُضَر، نِزَار، مُعَدّ اور عدنان۔[1]

لیکن حضرت اسماعیل تک آنحضرت ﷺ کے دوسرے اجداد اور ان کے ناموں کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔[2]

---

(۱) طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۲، ص ۱۹۱؛ ابن اثیر، اسد الغابہ (تہران: المکتبۃ الاسلامیہ)، ج ۱، ص ۱۳؛ طبرسی، اعلام الوری (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط۳)، ص ٦-۵۔

(۲) ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳؛ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، دلائل النبوۃ، ترجمہ: محمود مہدوی دامغانی (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳٦۱)، ص ۱۱۸؛ مسعودی، التنبیہ و الاشراف (قاہرہ: دار الصاوی للطبع و النشر)، ص ۱۹٦ - ۱۹۵؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج ۲، ص ۳۳؛ جمال الدین احمد بن عنبہ، عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب (قم: منشورات الرضی، ط ۲)، ص ۲۸۔

آپ اپنے سلسلۂ نسب کو بیان کرتے وقت جب عدنان پر پہنچتے تھے تو ٹھہر جاتے تھے اور بقیہ کو نہیں بیان فرماتے تھے۔[۱] اور دوسروں کو بھی اسی بات کی نصیحت فرماتے تھے.[۲] اور عدنان سے اسماعیل تک اپنے اجداد کے سلسلۂ نسب کے بارے میں فرمایا: کہ اہل نساب نے جو بات کہی ہے وہ جھوٹ ہے۔[۳]

عرب کے تمام قبیلے دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ "قحطانی اور "عدنانی"[٤] اور قریش عدنان (رسول خدا ﷺ کے بیسویں جد) سے انتساب کی بنا پر، عدنانی کہے جاتے ہیں۔ عدنانی عرب میں، جس کا خاندان اور سلسلۂ نسب نضر بن کنانہ سے ملتا ہے وہ قرشی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ قریش، آپ کا نام یا لقب تھا۔[٥]

---

(۱) ابن سعد، طبقات الکبری، (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ٥٦؛ ہشام بن محمد الکلبی، جمهرة النسب، تحقیق: ناجی حسن (بیروت: عالم الکتب، ط ۱)، ص ۱۷۔

(۲) ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعة العلمیه)، ج ۱، ص ۱٥٥؛ طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص٦؛ مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیه)، ج ۱٥، ص ۱۰٥۔

(۳) کلبی، گزشتہ حوالہ، ص۱۷؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص٥٦؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص ۱٥٥؛ ابن عنبہ، گزشتہ حوالہ، ص ۲۸۔

(٤) پہلے گروہ کو یمانی (یمنی) اور دوسرے گروہ کو مضری، نزاری اور قیسی بھی کہتے ہیں

(٥) ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص ۱٥٤؛ ابن عنبہ، گزشتہ حوالہ، ص ۲٦؛ طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص٦؛ ابن قتیبہ، المعارف، تحقیق: ثروة عکاشه (قم: منشورات الرضی، ۱٤۱٥ھ.ق)، ص٦۷؛ طبرسی، مجمع البیان، (تہران: شرکة المعارف الاسلامیه)، ج ۱۰، ص ٥٤٥؛ ابن ہشام، السیرة النبویه، (قاہرہ: مطبعة مصطفی البابی الحلبی،، ۱۳٥٥ھ.ق)، ج ۱، ص ٩٦؛ ابن عبد ربہ، العقد الفرید (دار الکتاب العربی، ۱٤۰۳ھ.ق)، ج۳، ص ۳۱۲؛ ابن کثیر، السیرة النبویه، (قاہرہ: مطبعة عیسی البابی الحلبی)، ج ۱، ص ۸٤؛ محمد امین بغدادی سویدی، سبائک الذهب فی معرفة قبائل العرب (بیروت: دار صعب)، ص ٦۲؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبة الحیدریه، ۱۳۸۳ھ.ق)، ج ۱، ص ۲۰٤۔

بعض اہل نساب نے، فہر بن مالک بن نضر کو قرشی کہا ہے۔ رجوع کریں: کلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۱؛ ابن سعد. گذشتہ حوالہ، ص٥٥؛ ابن عنبہ. گذشتہ حوالہ، ص۲٦؛ ابن ہشام، گذشتہ حوالہ، ص ٩٦؛ محمد امین بغدای، گذشتہ حوالہ، ص٦۲؛ ابن واضح، گذشتہ حوالہ، ص ۲۰٤؛ ابن حزم، جمهرة انساب العرب (بیروت: دار الکتب العلمیه، ط ۱، ۱٤۰۳ھ.ق)، ص ۱۲؛ حلبی، السیرة الحلبیه، (انسان العیون) (بیروت: دار المعرفه)، ج ۱، ص ۲٦۔ ۲٥۔ دوسرے اقوال بھی اس بات میں موجود ہیں کہ جن کا ذکر کرنا فائدہ نہیں رکھتا۔ رجوع کریں: السیرة الحلبیه، ج ۱، ص ۲۷۔

قبیلۂ قریش[۱] متعدد خاندانوں او رحصوں میں بٹا ہوا تھا۔ جیسے بنی مخزوم، بنی زھرہ، بنی امیہ ، بنی سہم اور بنی ہاشم[۲] اور حضرت محمد ﷺ آخری خاندان سے تھے ۔

حضرت عبد المطلب کی شخصیت

حضرت محمد ﷺ کے اجداد میں ہم زیادہ تر معلومات آپ کے پہلے جد عبد المطلب کے بارے میں رکھتے ہیں کیونکہ ان کا دور حیات عصر اسلام سے نزدیک رہا ہے۔

جناب عبد المطلب، ایک ہر دل عزیز، مہربان، عقلمند، سرپرست اور قریش کی ایسی پناہ گاہ تھے[۳] جن کا کوئی مقابل اور رقیب نہیں تھا۔ وہ تمام عظیم الٰہی شخصیتوں کی طرح اپنے معاشرے میں نمایاں کردار رکھتے تھے ۔ طولانی عمر پانے کے باوجود مکہ کے آلودہ سماج کے رنگ میں اپنے کو کبھی

---

(۱) عرب کے قبیلے اور گروہ چھوٹے اور بڑے ہونے کے لحاظ سے اور اس کے اندر جو شاخیں پیدا ہوئی تھیں ان کے اعتبار سے ترتیب وار انھیں شعب، قبیلہ، عمارہ، بطن، فخذ اور فصیلہ کہا جاتا تھا۔ جیسے خزیمہ، شعب، کنانہ، قبیلہ، قریش، عمارہ، قصی، بطن، ہاشم، فخذ، اور عباس کو فصیلہ کہا جاتا تھا (ابن حزم، العقد الفرید، ج۳، ص ۳۳۰؛ ڈاکٹر حسین مؤنس، تاریخ قریش، (دار السعودیہ، ط ۱، ۱۴۰۸ھ.ق) ، ص ۲۱۵) اس بنیاد پر بعض دانشوروں نے قریش کو "قبیلہ" اور بعض نے "عمارہ" کہا ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اس تقسیم بندی کی بنیاد اور اصل ، محل بحث ہے۔ اور اصولی طور پر بعض محققین نے اس تقسیم بندی کو قبول نہیں کیا ہے۔ (تاریخ قریش، ص ۲۱۶۔ ۲۱۵)، ہم یہاں پر اس بحث سے ہٹ کر صرف آسانی کے لئے قریش کو قبیلہ کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔

(۲) مسعودی نے قبیلۂ قریش میں ۲۵ خاندان بتائے ہیں اور ان کا نام ذکر کیا ہے۔ (مروج الذھب، (بیروت: دار الاندلس، ط ۱، ۱۹۶۵)، ج۲، ص ۲۶۹.)

(۳) حلبی، گزشتہ حوالہ، ص۶۔

نہیں رنگا۔ اس وقت مکہ میں معاد کا عقیدہ نہیں پایا جاتا تھا یا بہت کم تھا۔ لیکن عبد المطلب نہ صرف معاد کا عقیدہ رکھتے تھے بلکہ روز قیامت کی جزا اور سزا کے بارے میں بھی تاکید فرماتے تھے اور کہتے تھے: اس دنیا کے بعد ایسی دنیا آئے گی جس میں اچھے اور برے لوگ، اپنے اعمال کی جزا اور سزا پائیں گے۔[1]

جبکہ اس وقت جزیرۃ العرب کے ماحول میں قبیلہ جاتی عصبیت عام تھی اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ہر شخص جھگڑے اور اختلافات میں (بغیر حق و باطل کا خیال کئے) اپنے قبیلے، خاندان اور احباب کی حمایت کرتا تھا۔ لیکن جناب عبد المطلب، ایسے نہیں تھے۔ چنانچہ حرب بن امیہ جو کہ آپ کے خاندان اور دوستوں میں سے تھا اس پر اتنا دباؤ ڈالا، تاکہ وہ ایک یہودی کا خون بہا دیدے جو اس کے ورغلانے پر قتل ہوا تھا[2] وہ اپنی اولاد کو ظلم و ستم اور دنیا کے پست اور گھٹیا کاموں سے منع کرتے تھے اور اچھے صفات کی ترغیب دلاتے تھے۔[3]

جناب عبد المطلب کا جو طریقۂ کار تھا اسلام نے زیادہ تر اس کی تائید فرمائی ہے۔ ان میں کچھ چیزوں، جیسے حرمت شراب، حرمت زنا، زناکار پر حد جاری کرنا، چور کے ہاتھ کاٹنا، فاحشہ عورتوں کو مکہ سے جلا وطن کرنا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، محرموں سے شادی کرنا اور خانہ کعبہ کا برہنہ طواف کرنے کو حرام قرار دینا اور نذر کی ادائیگی کو واجب جاننا اور حرام مہینوںکی قداست و احترام او رمباہلہ

---

(۱) گزشتہ حوالہ، ص٦؛ شکری آلوسی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، تصحیح محمد بہجۃ الاثری، (قاہرہ: دار الکتب الحدیثہ، ط۲)، ج۱، ص۳۲٤۔

(۲) حلبی، گزشتہ حوالہ، ص٦؛ آلوسی، گزشتہ حوالہ، ص۳۲۳؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲، ص ۱۵؛ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف)، ج۱، ص۷۳.

(۳) حلبی، گزشتہ حوالہ، ص۷؛ مسعودی، مروج الذہب، ج۲، ص ۱۰۹.

وغیرہ[۱] کے وہ قائل تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ عبدالمطلب "خدا کی حجت" اور ابوطالب ان کے "وصی" تھے۔[۲]

خاندان توحید

حضرت محمد ﷺ کا خاندان، موحد تھا۔ علماء امامیہ کے عقیدے کے مطابق آپ کے آباء و اجداد حضرت عبد اللہ سے لیکر حضرت آدم تک سب موحد تھے اور ان کے درمیان کوئی مشرک نہیں تھا۔ اس بارے میں آیات و روایات سے استدلال ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "خداوند عالم نے مجھے ہمیشہ پاک مردوں کی صلبوں سے پاکیزہ عورتوں کے رحموں میں منتقل کیا۔ یہاں تک اس دنیا میں بھیج دیا اور اس نے مجھے ہرگز جاہلیت کی کثافتوں سے آلودہ نہیں کیا"[۳] اور ہمیں یہ معلوم ہے

---

(۱) آلوسی، گزشتہ حوالہ، ۳۲٤؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۷؛ رجوع کریں: السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ۷؛ رجوع کریں: الخصال صدوق، باب الخمسہ، ج۲، ص ۳۱۳۔ ۳۱۲۔

(۲) صدوق، اعتقادات، ترجمہ: سید محمد علی بن سید محمد الحسنی (تہران: کتابخانۂ شمس، ط۳، ۱۳۷۹ھ.ق)، ص۱۳۵؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۵، ص ۱۱۷؛ رجوع کریں: اصول کافی، ج ۱، ص ٤٤٥۔

جناب عبد المطلب سے مربوط بحثوں میں سے ایک بحث خدا کی راہ میں ایک فرزند کی قربانی، ان کی نذر ہے جس کی خبر مشہور ہونے کے باوجود جس طرح سے تاریخ کی کتابوں میں آئی ہے وہ سند اور متن کے لحاظ سے جائے اشکال ہے۔ اور اس سلسلہ میں بحث و تحقیق کی ضرورت ہے۔ (رجوع کریں: علی دوانی، تاریخ اسلام از آغاز تا ہجرت، ص ٥٩۔ ٥٤؛ من لایحضرہ الفقیہ، تحقیق: علی اکبر غفاری، ج۳، ص ۸۹؛ باب الحکم بالقرعہ، حاشیہ، تعلیقۂ آغائے غفاری) چونکہ یہ کتاب اختصار کے طور پر لکھی گئی ہے لہٰذا اس کے بارے میں بحث کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں۔

(۳) صدوق، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۵؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۷؛ مفید، اوائل المقالات (قم: مکتبۃ الداوری)، ص ۱۲؛ طبرسی، مجمع البیان، ج٤، ص ۳۲۲؛ تفسیر آیہ ۷٤ سورۂ انعام، بعض معاصر دانشوروں نے اس حدیث کو طہارت نسل یعنی ولادت و پیدائش کا سبب، ازدواج قرار دیا ہے (نہ آزاد اور غیر مشروع روابط) سے تفسیر کیا ہے کہ اگر اس تفسیر کو قبول کریں تو ہماری بحث کے لئے شاہد قرار نہیں پائے گا۔ (سید ہاشم رسولی محلاتی، درس ھایی از تاریخ تحلیلی اسلام ماھنامہ پاسدار اسلام، ۱۳٦۷، ج ۱، ص ٦٤).

کہ کوئی بھی نجاست شرک سے بدتر نہیں ہے اگر ان کے درمیان کوئی ایک بھی مشرک ہوتا تو انھیں ہرگز پاک نہ کہا جاتا۔

علمائے امامیہ کا عقیدہ ہے کہ جناب ابوطالب اور آمنہ بنت وھب موحد[۱] تھے۔

حضرت علی نے فرمایا ہے کہ خدا کی قسم! میرے والد اور اجداد عبد المطلب، ھاشم اور عبد مناف میں سے کوئی بھی بت پرست نہیں تھا وہ لوگ دین ابراہیمی کے پیرو تھے اور کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔[۲]

---

(۱) مفید، گزشتہ حوالہ، ص ۱۲؛ صدوق، گزشتہ حوالہ، اہل سنت کے بعض نامور علماء جیسے فخر رازی اور سیوطی بھی اس سلسلے میں امامیہ کے ہم عقیدہ ہیں۔ رجوع کریں: بحار الانوار، ج۱۵، ص ۱۲۲۔ ۱۱۸.

(۲) صدوق، کمال الدین و تمام النعمہ، تصحیح علی اکبر الغفاری (قم: موسسہ النشر الاسلامی، ۱۳۶۳)، ج ۱، ص ۱۷۵؛ الغدیر، ج۷، ص ۳۸۷.

دوسری فصل

حضرت محمد ﷺ کا بچپن اور جوانی

ولادت

جاہل عرب میں تاریخ کی کوئی منظم اور مستقل، ابتدا مقرر نہیں تھی بلکہ علاقے کے اہم واقعات جیسے کسی بڑی اور مشہور شخصیت کے مرنے یا دو قبیلوں کے درمیان خون ریز جنگ کے دن کو ایک زمانے تک تاریخ کا آغاز قرار دیتے تھے۔[۱] یہاں تک تمام قبائل عرب میں تاریخ کے آغاز کے لئے ایک معین دن نہیں تھا بلکہ اس قبیلہ کے نزدیک جو بھی اہم واقعہ رونما ہوتا تھا اسی کو تاریخ کی ابتدا قراردیتے تھے۔[۲]

جس وقت ابرہہ (حبشہ کا بادشاہ) نے، ہاتھیوں سمیت لشکر کے ساتھ خانۂ کعبہ کو مسمار کرنے کے

---

(۱) اس واقعہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں: مسعودی، التنبیہ و الاشراف، ص ۱۸۱ ـ ۱۷۲؛ ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی، تاریخ پیغمبر اسلام ﷺ (ط ۲، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۶۱)، ص ۲۷ ـ ۲۶.

(۲) مسعودی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۷.

لئے مکہ پر حملہ کیا[۱] تو اعجاز پروردگار اور اس کی غیبی طاقت کے مقابلہ میں شکست کھا گیا۔ اور اس واقعہ سے اس زمانہ کے دوسرے تمام واقعات تحت الشعاع میں آگئے اور وہ سال ایک عرصہ تک "عام الفیل" کے عنوان سے تاریخ کی شروعات قرار پایا* اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سال مکہ میں پیدا ہوئے۔[۲]

یہ واقعہ بعض قرائن اور شواہد کے لحاظ سے جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت، جوکہ ۶۲۲ اور آپ کی وفات ۶۳۴ئ میں (۶۰ یا ۶۳) سال کی عمر میں ہوئی ہی اور یہ واقعہ تقریباً ۵۶۹ئ ، ۵۷۰ئ

---

(۱) شیخ طوسی، الامالی، (قم: دار الثقافہ، ط ۱، ۱۴۱۴ھ.ق)، ص ۸۲۔ ۸۰؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۷۔ ۹۴، ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۵۵۔ ۴۴؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۹۶۔ ۶۷؛ محمدبن حبیب بغدادی، المنمق فی اخبار قریش، تحقیق: خورشید احمد فارق (بیروت: عالم الکتب، ط ۱، ۱۴۰۵ھ.ق)، ص ۷۷۔ ۷۰)۔

* ہاتھیوں کے لشکر کے واقعہ سے پہلے قریش قصی (جوکہ ایک بڑی اور نامور شخصیت تھی اور جس نے پہلی بار قریش کو قدرت مند بنایا) کو تاریخ کی شروعات قرار دیتے تھے (ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۴)

(۲) کلینی ، اصول الکافی (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۱ھ.ق)، ج ۱، ص ۴۳۹؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۴؛ مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۲۷۴؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۵، ص ۲۵۲۔ ۲۵۰؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۵؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۷۳۔ ۷۲؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۲۰۱؛ محمد بن سعد، طبقات الکبری، ج ۱، ص ۱۰۱؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ۱، ص ۱۴؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۱۶۷؛ الشیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۳، ۱۴۰۷ھ.ق)، ج ۱، ص ۲۸۲؛ ابن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: سہیل زکار (بیروت: دار الفکر، ط ۱، ۱۳۹۸ھ.ق)، ص ۶۱۔

کے بیچ میں رونما ہوا ہے۔[1]

---

(۱) علی اکبر فیاض، تاریخ اسلام، (تہران: انتشارات تہران یونیورسٹی، ط۳، ۱۳۶۷)، ص ۷۲؛ عباس زریاب، سیرۂ رسول اللہ (پہلے حصہ سے ہجرت کے آغاز تک) (تہران: سروش، ط ۱، ۱۳۷۰)، ص ۸۷۔ ۸۶؛ سید جعفر شہیدی، تاریخ تحلیلی اسلام تا پایان امویان (تہران: مرکز نشر یونیورسٹی، ط ۱۰، ۱۳۶۹)، ص ۳۷۔

اس سلسلہ میں کہ کیا آنحضرت ﷺ کی ولادت ٹھیک اسی عام الفیل میں ہوئی یا اس سے پہلے یا بعد میں اور نیز عام الفیل کو عیسوی سالوں سے مطابقت کرنے میں دوسرے نظریات اور احتمالات بھی ذکر ہوئے ہیں کہ جس کے نقل کرنے کی اس کتاب میں ضرورت نہیں ہے۔ مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: محمد ختم پیامبران، ج ۱، ص ۱۷۷ ۔ ۱۷۶؛ مقالہ سید جعفر شہیدی؛ رسولی محلاتی، درسهای از تاریخ تحلیلی اسلام (قم: ماہنامہ پاسدار اسلام ۱٤۰۵ھ.ق)، ج ۱، ص ۱۰۷ کے بعد؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۲۰۳؛ تہذیب تاریخ ذمشق، ج ۱، ص ۲۸۲۔ ۲۸۱؛ سید حسن تقی زادہ، از پرویز تا چنگیز (تہران: کتابفرشی فروغی، ۱۳٤۹)، ص ۱۵۳؛ جسین مونس، تاریخ قریش (الدار السعودی، ط ۱، ۱٤۰۸ھ.ق)، ص ۱۵۹ ۔ ۱۵۳؛ اس کے علاوہ بعض یورپی مورخین اسلامی کتابوں میں ابرھہ کی لشکر کشی کا مقصد دینی جذبہ اور کعبہ اور یمن میں قلیس معبد کے درمیان رقابت کو بتایا ہے، ملکوں کی فتح اور ابرھہ کا حملہ ایران جزیرۃ العرب کے شمالی راستے سے حکومت روم کے اکسانے پر بتایا گیا ہے؛ فیاض، گزشتہ حوالہ، ص ٦۲؛ ابوالقاسم پایندہ، مقدمہ ترجمہ فارسی قرآن مجید، ص ۔ لز۔) جس کے بارے میں الگ سے بحث اور تحقیق کی ضرورت ہے جو اس کتاب کے حجم سے باہر ہے۔

کم سنی اور رضاعت کا زمانہ

حضرت محمد ﷺ ابھی دو مہینے کے تھے[۱] کہ آپ کے پدر بزرگوار جناب عبد اللہ، ملک شام سے تجارتی سفر کی واپسی میں، شہر یثرب میں انتقال فرما گئے اور وہیں پر آپ کو سپرد خاک کردیا گیا۔[۲]

قرآن کریم نے ان کی یتیمی کو اس انداز میں بیان کیا ہے: "کیا اس نے تم کو یتیم پاکر پناہ نہیں دی

---

(۱) کلینی، گزشتہ حوالہ، ص ۴۳۹؛ ابن واضح، گزشتہ حوالہ، ص۶؛ ابو الفتح محمد بن علی الکراجکی، کنز الفوائد (قم: دار الذخائر، ط ۱، ۱۴۱۰ھ.ق)، ج ۲، ص ۱۶۷؛ حضرت محمد ﷺ کا سن باپ کے مرنے کے سال، سات مہینے اور ۲۸ روز بھی لکھا ہے۔ (محمد بن سعد، طبقات الکبری، (بیروت: دار صادر، ج ۱، ص ۱۰۰)، بعض مورخین نے، حضرت عبد اللہ کی وفات کو حضرت رسول اسلا ﷺ م کی ولادت کے قبل ہی تحریر کیا ہے۔ (ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۰۰ ۔ ۹۹؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ۱، ص ۱۳؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۱۶۷؛ الشیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، تالیف ابن عساکر (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۳، ۱۴۰۷ھ.ق)، ج ۱ ص ۲۸۴.) لیکن بعض اسناد و شواہد، پہلی روایت کی تائید کرتے ہیں ان میں سے عبد المطلب کے اشعار بھی ہیں جو اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں:

اوصیکم یا عبد مناف بعدی

بمفرد بید ابیه فرد

فارقه وهو ضجیج المهد

فکنت کالام له فی المجد

(تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۰؛ رجوع کریں: ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج ۱، ص ۳۶.)

(۲) تہذیب تاریخ دمشق، ج ۱۷، ص ۲۸۲؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۹۹؛ مسعودی، التنبیه والاشراف، ص ۱۹۶؛ محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم و الملوک، (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج ۲، ص ۱۷۶؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، (بیروت: دار صادر)، ج ۲، ص ۱۰۔

ہے اور کیا تم کو گم گشتہ پاکر منزل تک نہیں پہنچایا اور تم کو تنگ دست پا کر غنی نہیں بنایا"۔[۱]

آمنہ کے لال نے ولادت کے ابتدائی دنوں میں اپنی ماں کا دودھ پیا[۲] اور اس کے بعد تھوڑے دن تک (ابو لہب کی آزاد شدہ کنیز) ثوبیہ نے اپنا دودھ پلایا۔[۳]

اس دور میں رسومات عرب[٤] کے مطابق آپ کو حلیمہ سعدیہ نامی دایہ کے سپرد کردیا گیا۔ وہ قبیلۂ بنی سعد بن بکر سے تعلق رکھتی تھیں اور دیہات[٥] میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ دایہ حلیمہ نے دو سال تک آپ کو دودھ پلایا[٦] اور پانچ سال تک پرورش کی اس کے بعد آپ کے گھر والوں کے سپرد کردیا۔[٧]

ایک نومولود بچہ کو کسی بادیہ نشین کے سپرد کرنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس کی پرورش صحرا کی پاک و صاف اور کھلی فضا میں ہو اور مکہ میں "وبا" کی بیماری کے خطرے سے دور رہے۔[۸]

---

(۱) سورۂ ضحی، آیت ۸۔ ٦۔

(۲) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ٦؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱٤۳۔

(۳) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص٦؛ طبرسی، اعلام الوری، ص٦؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۰؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج۱، ص۱۵؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۵، ص ۳۸٤۔

(٤) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۱٤٦۔

(٥) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۷؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۱؛ محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۰؛ مسعودی، التنبیہ والاشراف، ص ۱۹٦؛ مروج الذہب، ج۲، ص۲۷٤؛ طبرسی، اعلام الوری، ص٦؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص۱۰۲۔ ۱۰۱؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، ج۱، ص۲۲۵؛ ابن اسحاق، السیر والمغازی، تحقیق: سہیل زکار، ط ۱، ۱۳۹۸ھ.ق)، ص٤۹۔

(٦) بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف)، ج۱، ص۹٤؛ مقدسی، البدء و التاریخ، ط پیریس، ۱٤۰۳ئ، ج٤، ص ۱۳۱؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۵، ص ٤۰۱؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۱۲۔

(۷) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۷؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳۳؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص۹٤؛ مسعودی، مروج الذہب، ج۲، ص۲۷۵۔

(۸) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیۃ، ۱۹٦۱)، ج۱۳، ص۲۰۳؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ٤۰۱۔

اس کے علاوہ بدو قبیلوں کے درمیان زبان کی فصاحت و بلاغت اور خالص اصیل عربی سے آگاہی بھی ایک اہم چیز تھی جو بعض ہم عصر مورخین کی طرف سے بیان ہوئی ہے۔(۱)

پیغمبر اکرم ﷺ کا ایک جملہ، جو اس موضوع کی مناسبت سے نقل ہوا ہے جو شاید اس مقصد کے لئے شاہد قرار پائے، یہ ہے:

"میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں کیونکہ میں قرشی ہوں اور میں نے قبیلہ بنی سعد بن بکر میں دودھ بھی پیا ہے"(۲)

بعض تاریخی کتابوں میں جناب حلیمہ کو دایہ کے طور پر انتخاب کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ حضرت محمد ﷺ یتیم تھے لہذا کوئی دایہ آپ کو لینے کے لئے تیار نہیں ہوئی کیونکہ دائیاں دودھ پلانے کے عوض بچہ کے باپ سے اجرت لیتی تھیں اور چونکہ اس وقت دائی حلیمہ کو مکہ میں کوئی بچہ نہیں ملا تھا لہذا حضرت محمد ﷺ کو یتیم ہونے کے باوجود مجبوراً رضاعت کے لئے قبول کرلیا۔(۳) لیکن دایوں کی طرف

---

(۱) جعفر سبحانی، فروغ ابدیت (قم: مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی حوزۂ قم، ط۵، ۱۳۶۸)، ج ۱، ص ۱۵۹؛ سید جعفر مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم (قم: ۱۴۰۰ھ.ق)، ج ۱، ص ۸۱۔

(۲) انا اعربکم انا قرشي واسترضعت في بني سعد بن بكر، (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۱۷۶۔ اور رجوع کریں: ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۳؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۴۶؛ ابو سعید واعظ خرگوشی، شرف النبی، ترجمہ: نجم الدین محمود راوندی (تہران: انتشارات بابک، ۱۳۶۱). ص ۱۹۶۔

کہا جاتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت محمد ﷺ، حلیمہ کے پاس دیہات میں رہ رہے تھے واقعۂ شق صدر پیش آیا۔ لیکن تاریخ اسلام کے محققین اور تجزیہ نگاروں نے متعدد دلیلوں کی بنا پر اس موضوع کو حقیقت سے دور اور من گڑھت گردانا ہے۔ (رجوع کریں: سید جعفر مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج ۱، ص ۸۲؛ سید ہاشم رسولی محلاتی، تاریخ تحلیلی اسلام کے دروس، ج ۱، ص ۱۸۹ و ۲۰۴؛ شیخ محمد ابویہ، اضواء الی السنۃ المحمدیہ (مطبعۃ صور الحدیثہ، ط ۲، ھ.ق)، ج ۱، ص ۱۷۷۔ ۱۷۵.

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۷۲۔ ۱۷۱؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۹۳؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۱۔ ۱۱۰.

سے محمد ﷺ کو یتیمی کی خاطر قبول نہ کرنے کی وجہ قابل قبول نظر نہیں آتی۔ کیونکہ :

۱۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ بعض کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ جناب عبد اللہ کا انتقال، حضرت رسول خدا ﷺ کی ولادت کے چند مہینے بعد ہوا ہے اس لحاظ سے وہ اس وقت یتیم نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ جناب عبد المطلب کی عظیم شخصیت اور مکہ میں ان کا بلند مقام اور درجہ اور ان کی دولت و ثروت کو دیکھتے ہوئے نہ صرف دایوں نے لینے سے انکار نہ کیا ہوگا بلکہ ایسے خاندان کے بچہ کی رضاعت کے لئے آپس میں جھگڑا کرتی ہوں گی۔

۳۔ بہت ساری تاریخی کتابوں میں یہ واقعہ نقل ہوا ہے لیکن یہ بات کہیں نہیں ذکر ہے۔[۱] *

والدہ کا انتقال اور جناب عبد المطلب کی کفالت

جناب آمنہ دائی حلیمہ سے اپنے بچہ کو لینے کے بعد ام ایمن (جناب عبد اللہ کی کنیز) کے ساتھ ایک قافلہ کے ہمراہ مدینہ گئیں تاکہ اپنے شوہر جناب عبد اللہ کی قبر پر جاکر حاضری دے سکیں اور آپ کے ماموؤں سے ملاقات کرسکیں۔[۲]

مدینہ میں ایک ماہ قیام کے بعد مکہ پلٹتے وقت مقام ابواء میں آپ کا انتقال ہوگیا اور وہیں آپ کو دفن کردیا گیا اس وقت حضرت رسول خدا ﷺ چھ سال کے تھے۔[۳]

---

(۱) منجملہ ایک بزرگ اور نامور محدث ابن شہر آشوب نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے لیکن حضرت محمد ﷺ کی یتیمی کے موضوع کو جس طرح سے بیان کیا گیا ہے اس میں نہیں ہے (مناقب آل ابی طالب، ج ۱، ص ۳۳).

* پیغمبر اسلام ﷺ کی رضاعت کا مسئلہ چاہے حلیمۂ سعدیہ کے ذریعہ ہو یا دیگر کنیزوں کے ذریعہ محل اختلاف ہے، شیعہ محققین نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔ مترجم.

(۲) عبد المطلب کی ماں سلمی، مدینہ کی رہنے والی تھیں اور بنی نجار سے تعلق رکھتی تھیں. (بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۲۱.)

(۳) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۶۵؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۹۴؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۶؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۷؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۲۱؛ طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ۹؛ صدوق، کمال الدین و تمام النعمہ، تصحیح علی اکبر الغفاری (قم: مؤسسہ النشر الاسلامی، ۱۳۶۳)، ج ۱، ص ۱۷۲؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۷؛ الشیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، ج ۱، ص ۲۸۳۔

ام ایمن قافلہ کے ساتھ آپ کو مکہ لے کر آئیں اور جناب عبد المطلب کے حوالہ کردیا۔[1]

جناب عبد المطلب نے آپ کی سرپرستی اور کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، اور جب تک وہ زندہ رہے اپنے پوتے کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرتے رہے اور آپپر ان کی نظر عنایت ہوتی تھی اور کہتے تھے کہیہ بلند مقام پائے گا۔[2]

---

(۱) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۷۲۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۷۸؛ صدوق، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۷۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٠٦؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۹۔

جناب عبد المطلب کا انتقال اور جناب ابو طالب کی سرپرستی

حضرت رسول خدا ﷺ آٹھ سال کے تھے کہ آپ کے دادا جناب عبد المطلب کا انتقال ہوگیا اور آپ کی کفالت کی ذمہ داری جناب ابو طالب کو سونپ دی۔ جناب ابو طالب اور جناب عبد اللہ (رسول خدا کے پدر بزرگوار) ایک ہی ماں سے تھے۔[۳] اس وقت جناب ابو طالب کی مالی حالت اچھی نہیں تھی وہ کثیر العیال اور تنگدست تھے۔[٤] لیکن وہ ایک بہادر، باعزت، قابل احترام[٥] اور قریش کے درمیان بلند درجہ رکھتے تھے۔[٦] وہ محمد ﷺ کو

---

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص۱۸۹؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٠٦؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۹٤۔

(٤) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۱؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۱۹؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ٤٠٧؛ سہیلی، الروض الانف (قاہرہ: مؤسسة المختار)، ج۱، ص ۱۹۳۔

(٥) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۱؛ جواد علی، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام (بیروت: دار العلم للملایین، ط۱، ۱۹٦۸ئ)، ج٤، ص ۸۲۔

(٦) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹٦۲ئ)، ج۱٥، ص ۲۱۹۔

بہت زیادہ چاہتے تھے ۔یہاں تک کہ اپنے بیٹوں سے زیادہ انھیں عزیز رکھتے تھے۔[1]

فاطمہ بنت اسد نے بھی آپ کی پرورش اور سرپرستی میں اہم کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں بہت زیادہ زحمتیں اٹھائیں وہ نہ صرف محمد ﷺ کو ایک مہربان ماں کی طرح چاہتی تھیں بلکہ آپ کو اپنے بچوں پر ہمیشہ مقدم رکھتی تھیں۔ حضرت محمد ﷺ کبھی بھی ان کی زحمتونکو فراموش نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ اپنی ایک ماں کی طرح انھیں یاد فرماتے تھے۔[2]

شام کا سفر اور راہب کی پیشین گوئی

ایک سال جناب ابوطالب قریش کے قافلہ کے ساتھ تجارت کے لئے شام گئے تو حضرت محمد ﷺ کی خواہش اور اصرار پر (مورخین کے اختلاف کے مطابق اس وقت آپ کی عمر ۸، ۹، ۱۲ یا ۱۳ سال کی تھی) آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے جس وقت قافلہ مقام بصریٰ[3] پر پہنچا تو ایک معبد کے کنارے آرام کی غرض سے رک گیا، اس معبد میں "بحیرا" نام کا ایک راہب رہتا تھا، جو عیسائیوں کا بزرگ پادری تھا۔ جب مجمع کے درمیان اس کی نظر ابوطالب کے بھتیجے محمد ﷺ پر پڑی تو اس کی خاص توجہ کا مرکز بن گئی اس لئے کہ وہ پیغمبر موعود کی بعض نشانیوں سے آگاہ تھا. جب اس نے ان نشانیوں کو محمد ﷺ کے اندر دیکھا تو اس نے آپ سے مختصر گفتگو اور سوالات کے بعد آپ کے آئندہ "نبی" ہونے کے بارے

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۱۹؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳۶؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ۴۰۷؛ شیخ عبدالقادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، ج۱، ص ۲۸۵.

(۲) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۱؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۴؛ مقدمہ اصول کافی، ج۱، ص ۴۵۳.

(۳) دمشق کے علاقہ میں حوران سرزمین کا ایک قصبہ ہے (یاقوت حموی، معجم البلدان، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۹۹ھ.ق)، ج۱، ص ۴۴۱.

میں خبر دیدی اور جناب ابو طالب سے تاکید کی کہ اس بچہ کا خاص خیال کریں اور اس کو یہود کے شر سے محفوظ رکھیں۔[۱]

اس واقعۂ کے سلسلہ میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ یہ واقعہ بعض تاریخی او رحدیثی کتابوں میں مختصر انداز میں اور بعض دوسری کتابوں میں بطور مفصل نقل ہوا ہے۔ لیکن اصل واقعہ میں کسی قسم کی شک و تردید نہیں پائی جاتی کیونکہ قرآن مجید نے متعدد آیات میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے سلسلہ میں گزشتہ پیغمبروں کی پیشین گوئیوں کونقل کرکے آنحضرت ﷺ کی ذات اور نشانیوں کے سلسلہ میں علمائے اہل کتاب کی آگاہی اور معرفت کی تائید کی ہے۔[۲] اور اسی طرح اہل کتاب کی متعدد پیشین گوئیاں پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے سلسلہ میں تاریخ و

---

(۱)اس واقعہ کو اسلامی مورخین و محدثین نے مندرجہ ذیل کتابوں میں نقل کیا ہے:

ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۱۹۳۔ ۱۹۱؛ محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم و الملوک، ج ۲، ص ۱۹۵؛ سنن ترمذی، ج۵؛ المناقب، باب۳، ص ۵۹۰؛ المناقب، باب ۳، ص ۵۹۰، حدیث ۳۶۲۰؛ ابن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: سہیل زکار، ص۷۳؛ محمد بن سعد، طبقات الکبری، ج ۱، ص ۱۲۱؛ مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۲۸۶؛ صدوق، کمال الدین و تمام النعمہ، ج ۱، ۱۸۶۔ ۱۸۲؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج ۱، ص ۹۶؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ترجمۂ محمود مہدی دامغانی، ج ۱، ص ۱۹۵؛ طبرسی، اعلام الوری، ص ۱۸۔ ۱۷؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ۱، ص ۳۹۔ ۳۸؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۷؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ۱، ص ۱۵؛ شیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق (تالیف حافظ ابن عساکر)، ج ۱، ص ۲۷۰ و ۳۵۴؛ ابن کثیر، سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۱۹۱؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۵، ص ۴۰۹۔

(۲) سورۂ بقرہ، آیت ۴۱، ۴۲، ۸۹، ۱۴۶؛ سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷؛ سورۂ انعام، آیت ۲۰؛ سورۂ صف، آیت ۶۔

حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔(۱)

۲۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں علمائے اہل کتاب کی کتابوں میں جو علامتیں اور نشانیاں تھیں ان میں سے کچھ آپ کی ذاتی زندگی اور جسمانی خصوصیات کے بارے میں تھیں (جیسے عرب ہونا ایک باعظمت خاتون سے شادی کرنا وغیرہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی نشانیوں میں سے سب سے نمایاں نشانی یہ تھی کہ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان ایک بڑا تل تھا جس کو "خال نبوت" یا "مہر نبوت" کہا گیا ہے۔(۲)

۳۔ بحیرا راہب کی پیشین گوئی صرف قافلہ والوں کے لئے نئی بات تھی ورنہ جناب ابوطالب بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام قریبی رشتہ دار آپ کے درخشندہ مستقبل سے باخبر تھے۔(۳)

---

(۱) رجوع کریں: جعفر سبحانی، راز بزرگ رسالت (تہران: کتابخانۂ مسجد جامع تہران، ۱۳۵۸)، ص ۲۷۸۔ ۲۶۲؛ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ میں گزشتہ پیغمبروں کی پیشین گوئیوں کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے ذیل کی تین کتابوں کو نمونہ کے طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔

محمد در تورات و انجیل تالیف: پروفیسر، عبد الاحد داؤد: ترجمہ فضل اللہ نیک آئین؛ مدرسہ سیار، تالیف: شیخ محمد جواد بلاغی، ترجمہ: ع۔ و؛ انیس الاعلام، تالیف: فخر الاسلام۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۹۳؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۹۵؛ سنن ترمذی، تحقیق: ابراہیم عطوہ عوض (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ج۵، المناقب، باب ۳، ص ۵۹۰، حدیث ۲۶۲۰؛ شیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، ج۱، ص ۲۷۸؛ ابن کثیر، سیرۃ النبی، ج۱، ص ۲۴۵؛ صحیح بخاری، تحقیق: الشیخ قاسم الشماعی الرفاعی، ج۵، ص ۲۸، باب ۲۳، حدیث ۷۱۔

(۳) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج۱، ص ۸۱؛ اصول کافی، ج۱، ص ۴۴۷۔

عیسائیوں کے ذریعہ تاریخ میں تحریف

بعض عیسائی مورخین نے حضرت محمد ﷺ سے بحیرا کی ملاقات کے واقعہ میں تحریف کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اس ملاقات میں بحیرا راہب سے توریت اور انجیل کی تعلیمات حاصل کیں۔[1]

ویلڈورانٹ نے نرم لہجے میں اس بے بنیاد دعوے کی طرف اشارہ کیا ہے:

...آپ کے چچا ابوطالب آپ کو ۱۲ سال کی عمر میں اپنے ساتھ ایک قافلہ کے ہمراہ شام کے شہر بصریٰ تک لیکر گئے، یہ بعید نہیں ہے کہ اس سفر میں آپ دین یہود اور آئین عیسیٰ کی بعض تعلیمات سے آگاہ ہوئے ہوں۔[2]

اس تہمت اور تحریف کا ہمیں اس طرح جواب دینا چاہیئے:

۱۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ محمد امی تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

۲۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس وقت اپ کی عمر ۱۲ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

۳۔ بحیرا کے دیدار اور آپ کی بعثت کے درمیان کافی عرصے کا فاصلہ تھا۔

٤۔ بحیرا سے آپ کی ملاقات بہت مختصر ہوئی تھی اس دوران اس نے کچھ سوالات کئے اور آپ نے ان کے جوابات دیئے۔

اس بنا پر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک بچہ جس نے مدرسے میں تعلیم حاصل نہ کی ہو وہ ایک مختصر ملاقات میں کیسے توریت و انجیل کی تعلیمات حاصل کرسکتا ہے کہ جسے چالیس سال کے بعد ایک

---

(۱) گوستاولوبون، تمدن اسلام وعرب، ترجمہ: سیدہاشم حسینی، ص ۱۰۱؛ اجناس گلدزیھر، العقیدۃ و الشریعہ فی الاسلام، ترجمۂ عربی (قاہرہ: دار الکتب حدیثہ، ط ۲)، ص ۲۵؛ محمد غزالی، محاکمۂ گلدزیھر صہیونیست، ترجمۂ صدر بلاغی (تہران: حسینیۂ ارشاد، ۱۳٦۳)، ص ٤۷؛ کارل بروکلمان، تاریخ الشعوب الاسلامیہ، ترجمۂ عربی بہ قلم نبیہ امین فارس (اور) منیر البعلبکی، (بیروت: دار العلم للملایین، ط ۱، ۱۹۸۸ئ)، ص ۳٤؛ اسی طرح رجوع کریں: خیانت در گزارش تاریخ، ج ۱، ص ۲۲۵۔ ۲۲۰۔

(۲) تاریخ تمدن، عصر ایمان، (بخش اول)، ترجمہ ابوطالب صارمی اور ان کے ساتھی (تہران: سازمان انتشارات وآموزش انقلاب اسلامی، ط ۲، ۱۳٦۸)، ص ۲۰۷۔

کامل شریعت کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرے؟

۵۔ اگر حضرت محمد ﷺ نے راہب سے کچھ سیکھا ہوتا تو بہانہ باز ضدی اور ہٹ دھرم قریش اس کو محمد ﷺ کے خلاف تبلیغ کرنے میں دستاویز قرار دیتے جبکہ تاریخ اسلام میں ہمیں اس طرح کی کوئی بات نظر نہیں آتی ہے اور نہ ہی قرآن مجید میں جہاں قریش کی تہمتوں کا جواب دیا گیا ہے وہاں پر اس موضوع کے بارے میں کوئی تذکرہ ہوا ہے۔

۶۔ اگر اس طرح کی کوئی بات صحیح تھی تو اسے قافلہ والوں نے کیوں نہیں نقل کیا؟

۷۔ اگر حقیقت میں اس طرح کا کوئی دعویٰ تھا تو شام کے مسیحیوں نے کیوں نہیں نقل کیا اور یہ دعویٰ کیوں نہ کیا کہ ہم محمد ﷺ کے استاد تھے؟

۸۔ اور اگر یہ دعویٰ صحیح مان لیا جائے تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ اسلام کی تعلیمات اور توریت و انجیل کی تعلیمات میں یکسانیت ہو اور نہ صرف یہ کہ ان کی تعلیمات میں یکسانیت نہیں پائی جاتی بلکہ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوںکے بہت سارے عقائد اور توریت و انجیل کی بہت ساری تعلیمات کو نقل کرکے انھیں باطل قرار دیا ہے۔(۱)

ایک روز عمرو بن خطاب پیغمبر اسلام ﷺ سے، یہودیوں سے سنی ہوئی حدیثوں کو لکھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: "کیا تم یہود و نصاریٰ کے مانند اپنے دین کے بارے میں پریشان اور سرگرداں ہو؟ یہ نورانی اور پاک دین میں تمہارے لئے لیکر آیا ہوں اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو وہ صرف میری پیروی کرتے۔(۲)

پیغمبر اسلام ﷺ مدینے میں (جہاں بہت سے یہودی رہتے تھے) بہت سارے احکام اور پروگراموں

---

(۱) سورۂ نسائ، آیت ۵۱،۴۷، ۱۷۱؛ سورۂ مائدہ، آیت ۷۳۔۷۲؛ سورۂ توبہ، آیت ۳۰۔

(۲) شیخ عباس قمی، سفینۃ البحار، ج۲، ص ۷۲۷، لفظ "هوک"؛ مجد الدین ابن اثیر، النهایہ فی غریب الحدیث و الاثر، ج۵، ص ۲۸۲، وہی الفاظ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ.

میں یہودیونکی مخالفت کرتے تھے۔[۱] یہاں تک کہ وہ (یہودی) کہنے لگے۔ یہ شخص ہمارے سارے پروگراموںکی مخالفت کرنا چاہتا ہے"۔[۲]

عیسائیوں کے درمیان جس شخص نے اس بات کو اسلام کے خلاف جھوٹ، افتراء پردازی او رزہر گھولنے کا بہانہ او ردستاویز قرار دیا وہ کونستان ویرژیل گیور گیو ہے جس نے اس بات کو اس قدر مسخ اور تحریف شدہ نقل کیاہے وہ نہ صرف یہ کہ کسی معیار سے تناسب نہیں رکھتا بلکہ خود عیسائیوں کے دعوے سے مناسبت نہیں رکھتا ہے، وہ کہتا ہے:

"ابن ہاشم عرب کا راوی لکھتا ہے: بحیرہ ؟ لوگوں کے تصور کے برخلاف عیسائی نہیں تھا بلکہ مانوی تھا اور ایک سن رسیدہ شخص کا پیرو تھا جس کا نام مانی تھا اور اس نے ساسانیوں کے دور حکومت میں پیغمبری کا دعوا کیا تھا اور ساسانیوں کے پہلے بادشاہ، بہرام اول نے اسے ۲۷۶ئ میں خوزستان میں گندی شاپور کے دروازہ کے سامنے سولی پر چڑھوا دیا تھا"۔

مانی جس نے پیغمبری کا دعوا کیا تھا اس کے پیرکاروں میں سے بحیرہ بھی تھا جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ خدا ایک قوم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی ساری قوموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اورچونکہ دنیا کی ساری قومیں اس سے وابستہ ہیں لہٰذا خداوند جس قوم میں جب چاہتا ہے ایک پیغمبر مبعوث کردیتا ہے جواسی قوم کی زبان میں لوگوں سے باتیں کرے۔[۳]

---

(۱) مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم (قم: ۱۴۰۳ھ.ق)، ص ۱۰۶۔

(۲) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۳۳۲۔

(۳) محمد ﷺ پیامبری کہ ازنو باید شناخت، ترجمہ: ذبیح اللہ منصوری، ص ۱۰۵، اس کتاب میں بے شمار غلطیاں اور تحریفات ہوئی ہیں جس نے کتاب کی علمی اہمیت کو کم کردیاہے۔ مترجم: کے طریقۂ کارکی بھی ایک الگ داستان ہے جو اہل فضل و شرف پر مخفی نہیں ہے، رجوع کریں: مجلہ نشردانش، سال ۸، نمبر ۲، ص ۵۲، مقالہ پدیدہ ای بہ نام ذبیح اللہ منصوری، کریم امامی کے قلم سے۔

بظاہر اس کی ابن ہشام سے مراد عبد الملک بن ہشام (م۲۱۳ھ.ق) معروف کتاب "السیرۃ النبویہ" کے مؤلف ہیں جو تاریخ اسلام کا ایک مہم ماخذ ہے لیکن کلمہ مانوی کا ذکر نہ صرف سیرۂ ابن ہشام میں بلکہ کسی بھی قدیمی اسلامی کتاب میں نہیں ملتا ہے اس شخص کو تاریخ کی کتابوں میں مسیحی (اور بہت کم یہودی) کہا گیا ہے اور خود موضوع بحث سے بھی اس کے مسیحی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ گیورگیو نے یہ باتیں کہاں سے نقل کی ہیں؟!

اس کے علاوہ دین مانی کا شام میں کوئی پیرو نہیں تھا اور جیسا کہ ہم نے (جزیرۃ العرب) میں ادیان و مذاہب کے تجزیہ کے باب میں یہ کہا ہے کہ دین مانی کا مرکز ایران تھا۔ لہٰذا ہمیں ایک محقق کے کہنے کی بنا پر، یہ سوچنے کا حق ہے کہ بحیرا کے مانوی ہونے کا دعوا صرف اس بنا پر تو نہیں ہے کہ خداوند عالم کی توحید اور اسلام کے عالمی دین ہونے کے مسئلہ میں مانی کی تقلید تو نہیں کی جارہی ہے؟

یہ وہ چیزیں ہیں جس کی مثال ہمیں گزشتہ صدیوں میں مسیحیوں سے بہت دیکھنے کو ملی ہیں اور ان کے لئے یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ بلند ترین فکر کو وہ منسوخ ادیان کی طرف نسبت دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان ادیان کے ماننے والے زیادہ نہیں ہیں تاکہ ان کے لئے یہ چیز باعث افتخار بن سکے۔

صرف اسلام ایک ایسا دین ہے کہ، صلیبی جنگ کو سیکڑوں سال گزرنے کے باوجود، جس سے آج بھی عیسائی پریشان اور خوف زدہ ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ جھوٹ اور سچ ہر طریقے سے اس دین کی تعلیمات کی عظمت کو لوگوں کی نظروں میں کم کریں۔[۱]

لیکن اس بات پر توجہ رہے کہ اگر بالفرض اس واقعہ کی ہم نفی بھی کریں تو عظمت پیغمبر ﷺ میں کوئی کمی نہیں واقع ہوگی کیونکہ بعثت اور پیغمبر موعود کے ظہور کی پیشین گوئیاں صرف اس مسئلہ میں منحصر نہیں ہیں لیکن جیسا کہ متن میں کہا گیا ہے کہ چونکہ مستشرقین نے اس واقعہ کو جو متون اسلامی میں آیا ہے تاریخ اسلام کی تحریف کا دستاویز قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی ان کی باتوں کو ذکر کرکے اس پر تنقید کی ۔

---

(۱) محمد خاتم پیامبران، ج۱، ص۱۸۸؛ مقالہ سید جعفر شہیدی۔ بعض معاصر ایرانی محققین نے بحیرا کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی ملاقات میں شک و تردید پیدا کی ہے اور اصل واقعہ کی صحت کے بارے میں بحث کی ہے جو تاریخی لحاظ سے قابل بحث و تحقیق ہے۔ رجوع کریں: نقد و بررسی منابع سیرۂ نبوی (مجموعۂ مقالات) پژوہشکدۂ حوزہ و دانشگاہ ۱۳۷۸؛ رمضان محمدی، نقد و بررسی سفر پیامبر اکرم بہ شام، ص ۳۳۰۔ ۳۲۱۔

تیسری فصل

حضرت محمد مصطفٰی ﷺ کی جوانی

حلف الفضول ۱

"حلف الفضول" قریش کے بہترین اور اہم ترین عہد و پیمان میں سے ہے.[۲] جو قریش کے چند قبیلوں کے درمیان انجام پایا۔ یہ پیمان اس بنا پر انجام پایا کہ قبیلۂ بنی زبید کا ایک شخص مکہ آیا اور اس نے عاص بن وائل کا سامان، جو کہ بنی سہم کے قبیلہ سے تھا، فروخت کردیا۔ عاص نے مال کو لیا لیکن

۱جس واقعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے جوانی کے عالم میں اس میں شرکت کی "جنگ فجار" ہے اس واقعہ کو حلف الفضول سے پہلے جب آپ کی عمر ۱۴ سے ۲۰ سال کی تھی، نقل کیا گیا ہے ۔ لیکن چونکہ اس جنگ کے سلسلہ میں آپ کی شرکت میں شک پایا جاتا ہے بلکہ ایسے شواہد ملتے ہیں جو اس کی نفی کرتے ہیں لہذا ہم نے اس کو بیان نہیں کیا ہے۔ (الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج ۱، ص ۹۷۔ ۹۵؛ درس ھایی تحلیلی از تاریخ اسلام، ج ۱، ص ۵۰۳۔ ۳۰۳

(۲)ابن سعد، طبقات الکبری (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۱۲۸؛ محمد بن حبیب، المنمق فی اخبار قریش، تحقیق خورشید احمد فارق (بیروت: عالم الکتب، ط ۱، ۱۴۰۵ھ.ق)، ص ۵۲۔

اس کی قیمت نہیں دی زُبیدی نے بارہا اس سے مطالبہ کیا لیکن اس نے دینے سے انکار کردیا۔ جیسا کہ یہ چیز پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ اس وقت جزیرۃ العرب میں قبیلہ جاتی نظام پایا جاتا تھا۔ او رہر قبیلہ اپنے افراد کے منافع کی حمایت کرتا تھا۔ اگر کسی پردیسی پر ظلم ہوتا تھاتو اس کا کوئی ناصر و مددگار اورانصاف کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ جب سرداران قریش، کعبہ کے پاس اکٹھا ہوئے تو زبیدی مجبور ہوکر "ابو قبیس" پہاڑی کے اوپر گیا اور رنج و مصیبت میں ڈوبے ہوئے اشعار پڑھ کر ان سے انصاف کی فریاد کی۔[۱]

انصاف کی مانگ سن کر زبیربن عبد المطلب کی سرکردگی اور پیش قدمی میں، بنی ہاشم، بنی عبد المطلب، بنی زہرہ، بنی تمیم، اور بنی حارث (جو کہ قریش کے نامور قبیلہ سے تھا) عبداللہ بن جدعان تیمی کے گھر میں جمع ہوئے اور عہد و پیمان کیا کہ ہر مظلوم اور ستم دیدہ کی فریاد پر حق وانصاف دلانے کے لئے ایک ہو جائیں اور شہر مکہ میں کسی پر ظلم نہ ہونے دیں، چاہے وہ ان لوگوں سے وابستہ ہو یا کوئی پردیسی ہو، چاہے وہ فقیر اور معمولی انسان ہو یا ثروتمند اور باعزت۔ اس کے بعد عاص کے پاس جاکر زبیدی کا حق لے کر اسے دیدیا۔[۲]حضرت محمد ﷺ کی عمر اس وقت ۲۰ سال تھی جب آپ اس عہد کے ممبران میں سے تھے۔[۳]

---

(۱) یا آل فھر {یاللرجال خ ل} لمظلوم بضاعته

ببطن مکة نائی الأھل و النفر

و محرم اشعث {شعث خ ل} لم یقض عمرته

یا آل فھر و بین الحجر

والحجر ھل مخفر من بنی سھم بخفرته

ام ذاھب فی ضلالح مال معتمر

ان الحرام لمن تمت حرامته

و لا حرام لثوب الفاجر الغدر

(۲) محمد بن حبیب، گزشتہ حوالہ، ص ۵۳۔ ۵۲؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۲۸؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۳؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۱۴۲؛ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: الشیخ محمد باقر المحمودی (بیروت: مؤسسۃ الاعلی للمطبوعات، ط ۱، ۱۳۹۴ھ.ق)، ج۲، ص ۱۲۔

(۳) محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، حضرت محمد ﷺ کا سن اس وقت اس سے بھی زیادہ نقل ہوا ہے؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۳، المنمق، ص ۵۳؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۲م)، ج۱۵، ص ۲۲۵

اس عہد و پیمان میں پیغمبر اسلام ﷺ کی شرکت میں ایک بہادرانہ قدم اور اس جاہل سماج میں ایک طرح سے "حقوق بشر" کی حمایت تھی۔ اور اس لحاظ سے یہ اقدام بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ آپ کے ہم سن و سال جوان، مکہ میں عیش و عشرت اور خوشگزرانی میں سرگرم تھے۔ اور انسانی اقدار جیسے مظلوم کی حمایت، سماج کی تطہیر اور عدالت کا نفاذ ان کے لئے معنی و مفہوم نہیں رکھتا تھا۔ اور آپ قریش کے بزرگوں کے بغل میں کھڑے ہوکر اس طرح کے عہد و پیمان میں شرکت فرماتے تھے۔ اور بعثت کے بعد اپنی اس شرکت کو نیک اور اچھا کہتے تھے اور فرماتے تھے۔

"میں نے عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک پیمان میں شرکت کی کہ اگر اس کے بدلے مجھے سرخ بالوں کا اونٹ دیدیا جاتا تو پھر بھی میں اتنا خوش نہ ہوتا۔ اور اگر دور اسلام میں بھی ہمیں اس طرح کے عہد و پیمان کی دعوت دیں تو ہم اسکو قبول کریں گے"۔[۱]

یہ عہد اس لحاظ سے موجود عہدوں میں سب سے اہم اور برتر تھا اور اسے "حلف الفضول" کہا گیا ہے۔[۲] یہ عہد ہمیشہ مظلوموں اور بے پناہوں کی پناہ گاہ تھا اور بعد میں بھی کئی مرتبہ مظلوموں اور پردیسیوں کو اس پیمان کی مدد سے مکہ کے بدمعاشوں اور سرغنہ لوگوںکے چنگل سے رہائی ملی۔[۳]*

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۴۲؛ یعقوبی، گزشتہ حوالہ، ص۱۳؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص۱۶؛ محمد بن حبیب، گزشتہ حوالہ، ص۱۸۸۔

(۲) محمد ابن حبیب، گزشتہ حوالہ، ص ۵۵۔ ۵۴۔

(۳) گزشتہ حوالہ، بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳

* عصر اسلام میں اس عہد و پیمان کی یاد بھی باقی ہے جیسا کہ امام حسین نے ولید بن عتبہ بن ابی سفیان سے جو معاویہ کا بھتیجا اور مدینہ کا حاکم تھا ایک زمین کے سلسلہ میں اختلاف کی صورت میں اسے دھمکی دی کہ اگر طاقت کا استعمال کیا تو تلوار لیکر مسجد پیغمبر میں (قریش) کو ایسے عہد و پیمان کی دعوت دوں گا۔ یہ بات سن کر قریش کی کچھ شخصیتوں نے آپ سے نصرت کا وعدہ کیا جب ولید کو اس کی اطلاع ملی تو وہ اپنے ارادہ سے پیچھے ہٹ گیا!(ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۴۲؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۴؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۱۵؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۵، ص ۲۲۶؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۴۲۔

شام کی طرف دوسرا سفر

جناب خدیجہ (دختر خویلد) ایک تجارت پیشہ، شریف اور ثروتمند خاتون تھیں۔ تجارت کے لئے لوگوں کو ملازمت پر رکھتی تھیں اور انھیں اپنا مال دے کر تجارت کے لئے بھیجتی تھیں اور انھیں ان کی مزدوری دیتی تھیں۔[۱]

جب حضرت محمد ﷺ ۲۵ سال کے ہوئے[۲] تو جناب ابو طالب نے آپ سے کہا: میں تہی دست ہوگیا ہوں اور مشکلات و دشواریوں میں گرفتار ہوں اس وقت قریش کا ایک قافلہ تجارت کے لئے شام جارہا ہے۔ کاش تم بھی خدیجہ کے پاس جاتے اور ان سے تجارت کا کام لیتے، وہ لوگوں کو تجارت کے لئے بھیجتی ہیں۔

دوسری طرف سے جناب خدیجہ جو حضرت محمد ﷺ کے پسندیدہ اخلاق، صداقت و راست گوئی اور امانتداری سے آگاہ ہوگئی تھیں آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر ہمارے تجارت کے کام کو قبول کریں تو دوسروں سے زیادہ انھیں اجرت دوں گی۔ اور اپنے غلام میسرہ کو بھی ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے بھیجوں گی۔

حضرت محمد ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو قبول کرلیا۔[۳] او ر میسرہ کے ہمراہ قریش کے کاروان

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۹۹؛ ابن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: سہیل زکار (بیروت: دار الفکر، ط۱، ۱۳۹۸ھ.ق)، ص ۸۱؛ سبط ابنالجوزی، تذکرۃ الخواص، ص ۳۰۱، میں کہتا ہے کہ "جناب خدیجہ نے ان کو ٹھیکہ پر کام دیا تھا" اورابن اثیر اسد الغابہ میں، ج۱، ص۱٦ ۔ پر لکھتا ہے: " ان کو مزدوری یا ٹھیکہ پر کام دیا تھا"۔

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۲۹۔

(۳) ایسے ثبوت ملتے ہیں کہ محمد ﷺ کا کام مضاربہ کی شکل میں تھا آپ مزدوری پر کام نہیں کرتے تھے (الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج۱، ص ۱۱۲)

کے ساتھ شام کے لئے روانہ ہوگئے(۱) اس سفر میں انھیں گزشتہ سے زیادہ فائدہ ملا۔(۲)

میسرہ نے اس سفر میں حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ ایسی کرامتیں دیکھیں کہ وہ حیرت و استعجاب میں پڑ گیا۔ اس سفر میں "نسطور راہب" نے آپ کے آئندہ رسالت کی بشارت دی۔ اسی طرح میسرہ نے دیکھا کہ حضرت محمد ﷺ سے ایک شخص کا، تجارت کے معاملہ میں اختلاف ہوگیا ہے وہ شخص کہتا تھا کہ لات و عزیٰ کی قسم کھاؤ تاکہ میں تمہاری بات کو قبول کروں۔

آپ نے جواب دیا: میں نے ابھی تک کبھی لات و عزیٰ کی قسم نہیں کھائی ہے۔(۳)

میسرہ نے سفر سے پلٹتے وقت محمد ﷺ کی کرامتوں اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔ جناب خدیجہ سے آکر بتایا۔(٤)

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۹۹؛ ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۸۱

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۰

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۰۔

(٤) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص۸۲؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۱؛ ابناثیر، الکامل، فی التاریخ الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص۳۹؛ طبری، تاریخ الامم والملوک (بیروت: دارالقاموس الحدیث)، ج۲، ص ۱۹۶؛ بہقی، دلائل النبوۃ، ترجمۂ محمود مہدوی دامغانی (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳۶۱)، ج۱، ص۲۱۵؛ ابن اثیر، اسد الغابہ (تہران: المکتبۃ الاسلامیہ)، ج۵، ص ٤۳۵؛ ابی بشر، محمد بن احمد الرازی الدولابی، الذریۃ الطاھرۃ، تحقیق: السید محمد جواد الحسینی الجلالی (بیروت: مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ط۲، ۱٤۰۸ھ.ق)، ص ٤٦۔ ٤۵۔

جناب خدیجہ کے ساتھ شادی

جناب خدیجہ ایک باشعور، دور اندیش او رشریف خاتون تھیں اور نسب کے لحاظ سے قریش کی عورتوں سے افضل و برتر تھیں۔[۱] وہ متعدد اخلاقی اور اجتماعی خوبیوں کی بنا پر زمانۂ جاہلیت میں "طاہرہ"[۲] اور "سیدۂ قریش"[۳] کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ مشہور یہ ہے کہ اس سے قبل آپ نے دوبار شادی کی تھی اورآپ کے دونوں شوہروں کا انتقال ہوگیا تھا۔[٤]

تمام بزرگان قریش آپ سے شادی کرنا چاہتے تھے[٥] قریش کی معروف ہستیاں، جیسے عقبہ بن ابی معیط، ابوجہل اورابوسفیان نے آپ کے ساتھ شادی کا پیغام بھیجا لیکن آپ، کسی سے

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۰۱۔ ۲۰۰؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۳۱؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۱۵؛ رازی دولابی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٦؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۳۹۔

(۲) ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ٥، ص ٤٣٤؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۲٤؛ عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ج ٤، ص ۲۸۱؛ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (الاصابہ کے حاشیہ پر) ج ٤، ص ۲۷۹۔

(۳) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۲٤۔

(٤) ان کے گزشتہ شوہر عتیق بن عائد (عابد نسخہ بدل) اور ابوھالہ ہند بن نباش تھے۔ (ابن کثیر، اسد الغابہ، ج ٥، ص ٤٣٤؛ ابن حجر، گزشتہ حوالہ، ص ۲۸۱؛ ابن عبد البر، گزشتہ حوالہ، ص ۲۸۰؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۲۹؛ ابو سعید خرگوشی، شرف النبی، ترجمہ: نجم الدین محمود راوندی (تہران: انشارات بابک، ۱۳٦۱)، ص ۲۰۱؛ شیخ عبد القادر بدران، تہذیب دمشق (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۳، ۱٤۰۷ھ۔ق)، ج ۱، ص ۳۰۲)، لیکن کچھ اسناد و شواہد اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ جناب خدیجہ نے اس سے قبل شادی نہیں کی تھی اور حضرت محمد ﷺ آپ کے پہلے شوہر تھے۔ بعض معاصر محققین بھی اس بات کی تاکید کرتے ہیں (مرتضیٰ العاملی، جعفر، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج ۱، ص ۱۲۱)۔

(٥) ابن سعد، گزشتہ حوالہ؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۱٥؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۱۹۷؛ حلبی، گزشتہ حوالہ؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ٤۰.

شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئیں۔[١]

دوسری طرف خدیجہ، حضرت محمد ﷺ کی رشتہ دار تھیں اور دونوں کا نسب قصی سے ملتا تھا آپ حضرت محمد ﷺ کے روشن مستقبل سے بھی باخبر تھیں[٢] اور ان سے شادی کی خواہش مند تھیں۔[٣]

جناب خدیجہ نے حضرت محمد ﷺ کے پاس شادی کا پیغام بھیجوایا اور محمد ﷺ نے اپنے چچا کی مرضی سے اس پیغام کو قبول کرلیا اور یہ شادی انجام پائی۔[٤] مشہور قول کے مطابق خدیجہ اس وقت ٤٠ برس کی تھیں اور محمد ﷺ ٢٥ سال کے تھے۔[٥] جناب خدیجہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ شادی کی۔[٦]

---

(١) مجلسی، بحار الانوار (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ج ١٦، ص ٢٢۔

(٢) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ٢١۔ ٢٠؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٢٠٣؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج ١، ص ٤١۔

(٣) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ٢٣۔ ٢١۔

(٤) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ٨٢؛ بلاذری، انساب الاشراف، محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف)، ج ١، ص ٩٨؛ تاریخ یعقوبی، ج ٢، ص ١٦؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ٢، ص ٤٠؛ رازی دولابی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٦؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ٢٢٧؛ ابن شہر آشوب، ج ١، ص ٤٢؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ١٦، ص ١٩۔

(٥) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ٩٨؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ١٣٢؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ٢، ١٩٦؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ٢٢٨؛ ابن عبد البر، الاستیعاب، ج ٤، ص ٢٨٠؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ٥، ص ٤٣٥؛ الکامل فی التاریخ، ج ٢، ص ٣٩۔ جناب خدیجہ کی شادی کے وقت ان کی عمر کے بارے میں دوسرے اقوال بھی موجود ہیں۔ رجوع کریں: امیر مھیا الخیامی، زوجات النبی ﷺ واولادہ (بیروت: مؤسسۃ عز الدین، ط ١، ١٤١١ھ.ق)، ص ٥٤۔ ٥٣۔

(٦) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٢٠١؛ رازی دولابی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٩؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٢١٦؛ ابو سعید خرگوشی، گزشتہ حوالہ، ص ٢٠١؛ شیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، ج ١، ص ٣٠٢؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ٥، ص ٤٣٤۔

حجر اسود کا نصب کرنا

حضرت محمد ﷺ کے نیک اخلاق و کردار، امانت و صداقت اور اچھے اعمال نے اہل مکہ کو ان کا گرویدہ بنادیا تھا۔ سب آپ کو "امین" کہتے تھے[۱] آپ لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے بس گئے تھے۔ کہ حجر اسود[۲] کے نصب کے سلسلہ میں لوگوں نے آپ کے فیصلہ کا استقبال کیا اور آپ نے اپنی خاص تدبیر او ر حکمت عملی کے ذریعہ ان کے درمیان موجود اختلاف کو حل کردیا۔ جس کی توضیح یہ ہے۔

جس وقت حضرت محمد ﷺ ۳۵ برس کے ہوئے تو مکہ کے پہاڑوں سے چشمہ کے جاری ہونے کی وجہ سے خانہ کعبہ کی دیواریں کئی جگہ سے منہدم ہوگئیں کعبہ میں اس وقت تک چھت نہیں تھی اور اس کی دیواریں چھوٹی تھیں اس اعتبار سے اس کے اندر موجود چیزیں محفوظ نہیں تھیں۔ قریش نے چاہا کہ کعبہ کی چھت کو بنائیں لیکن وہ یہ کام نہیں انجام دے سکے۔ اس کے بعد مکہ کے بزرگوں نے چاہا کہ کعبہ کی دیوار کو توڑ کر پھر سے از نو تعمیر کریں او راس پر چھت بھی ڈالیں۔

لہٰذا کعبہ کی تعمیر نو کے بعد، قریش کے قبیلوں کے درمیان حجر اسود کے نصب کرنے کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوگیا اور قبیلہ جاتی رسّہ کشی اور فخر و مباہات دوبارہ زندہ ہوگئیں، ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اس پتھر کے نصب کرنے کا شرف اس کو حاصل ہو بعض قبیلوں نے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو خون سے لبریز طشت میں ڈال کر یہ عہد کیا کہ یہ افتخار دوسرے قبیلہ کے پاس نہیں جانے دیں گے۔

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۲۱؛ ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۱۰؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۱۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۱۵، ص ۳۶۹۔

(۲) یہ پتھر کعبہ کے مقدس ترین اجزاء میں سے ہے۔ روایات میں نقل ہوا ہے کہ یہ بہشتی اور آسمانی پتھر ہے جس کو جناب ابراہیم نے حکم خدا سے کعبہ کا جزء قرار دیا ہے (مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۹۹۔ ۸۴)، ازرقی، تاریخ مکہ، تحقیق: رشدی الصالح ملحس، (بیروت: دارالاندلس، ط ۳، ۱۴۰۳ھ.ق)، ج ۱، ص ۶۳۔ ۶۲؛ حجر اسود ابھی تک باقی ہے جو انڈہ کے شکل، سیاہ رنگ، مائل بہ سرخی ہے اور کعبہ کے رکن شرقی میں زمین سے ڈیڑھ میٹر کی بلندی پر نصب ہے او رطواف کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے۔

آخرکار قریش کے ایک بزرگ اور سن رسیدہ شخص کے مشورہ پر یہ طے پایا کہ کل جو شخص سب سے پہلے باب بنی شیبہ (یا باب صفا) سے مسجد الحرام میں داخل ہوگا۔ وہی قبائل کے درمیان حجر اسود کے نصب کرنے کا فیصلہ کرے گا۔

اچانک حضرت محمد ﷺ اس دروازہ سے داخل ہوئے سب نے ملکر کہا: یہ محمد ﷺ ، امین ہیں ہم سب ان کے فیصلہ پر راضی ہیں لہٰذا آنحضرت کے حکم سے ایک چادر منگائی گئی اور چادر کو پھیلا کر اس میں حجر اسود کو رکھا گیا اور قبائل کے سرداروں سے کہا گیا کہ ہر ایک اس کا ایک گوشہ پکڑ لے اور سب ملکر پتھر کو دیوار تک لائیں جب پتھر دیوار کے پاس آگیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو اپنے دست مبارک سے اٹھاکر اپنی قدیمی جگہ پر رکھ دیا۔[1] اور اس طرح آپ نے اپنے حکیمانہ او ر مدبرانہ عمل کے ذریعہ قبائل کے درمیان موجود اختلاف کو حل فرمایا اور انھیں ایک خون ریز جنگ سے بچا لیا۔

علی مکتب پیغمبر ﷺ میں

کعبہ کی تعمیر نو کے چند سال بعد او ربعثت پیغمبر ﷺ سے چند سال قبل مکہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ اس وقت پیغمبر ﷺ کے چچا جناب ابوطالب تہی دست اور کثیر العیال تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنے دوسرے چچا عباس کو (جو کہ بنی ہاشم کے ثروتمند ترین افراد میں سے تھے) مشورہ دیا کہ ہم میں سے ہر ایک ابوطالب کے ایک فرزند کو اپنے گھر لے جائے تاکہ ان کا مالی بوجھ کم ہوجائے۔

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ ، ج ۱، ص ۱۴۶ ۔ ۱۴۵ ؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۵ ۔ ۱۴ ؛ مجلسی، گزشتہ، ج ۱۵، ص ۳۳۸ ۔ ۳۳۷؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۰۰ ۔ ۹۹؛ مسعودی، مروج الذہب، (بیروت: دار الاندلس، ط ۱، ۱۹۶۵.)، ج ۲، ص ۲۷۲ ۔ ۲۷۱؛ بعض مورخین نے کعبے کی خرابی اوراس کی تعمیر نو کا سبب ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے لیکن سب نے حجر اسود کے نصب کے سلسلے میں آپ کے فیصلہ کو نقل کیا ہے۔ رجوع کریں: ابن اسحاق، السیر و المغازی، ص ۱۰۳ ؛ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۰۵؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ترجمہ: محمود مہدوی دامغانی، ج ۱، ص ۲۱۰۔

عباس اس بات پر راضی ہوگئے اور دونوں ابو طالب کے پاس گئے اور اپنی بات ان سے کہی تو وہ بھی راضی ہوگئے اور پھر جعفر کو عباس نے اور حضرت علی کو حضرت محمد ﷺ نے اپنی تربیت اور کفالت میں لے لیا اور حضرت علی آنحضرت ﷺ کے گھر میں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کو مبعوث بہ رسالت کیا اور علی نے آپ کی تصدیق اور پیروی کی۔[۱]

حضرت علی اس وقت چھ سال کے تھے۔[۲] یہ ان کی شخصیت سازی اور تربیت پذیری کا حساس دور تھا گویا حضرت محمد ﷺ چاہتے تھے کہ ابو طالب کے کسی ایک لڑکے کی تربیت کر کے ان کی اور ان کے شریک حیات کی زحمتوں کا بدلا چکا دیں۔ لہٰذا ابو طالب کی اولاد میں سے علی کو اس معاملہ میں مستعد تر پایا۔ جیسا کہ آپ نے علی کی کفالت قبول کرنے کے بعد فرمایا ہے: میں نے اس کو منتخب کیا جس کو خدا نے منتخب کیا ہے۔[۳]

حضرت محمد ﷺ علی سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی تربیت میں کسی قسم کی کوشش سے پیچھے نہیں ہٹے۔ فضل بن عباس (علی کا چچا زاد بھائی) کہتا ہے کہ: میں نے اپنے والد محترم (عباس بن عبد المطلب) سے پوچھا کہ پیغمبر ﷺ اپنے فرزندوں میں سے کس کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں؟ کہا: علی ابن ابی طالب کو۔

---

(۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، (قاہرہ: مکتبہ مصطفی البابی الحلبی)، ۱۳۵۱ ھ.ق)، ج ۱، ص ۲۶۲؛ طبری، تاریخ الامم والملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج ۲، ص ۲۱۳؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ۱۳۹۹ھ.ق)، ج ۲، ص ۵۸؛ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: الشیخ محمد باقر المحمودی (بیروت: مؤسسہ الاعلمی للمطبوعات، ط ۱)، ۱۳۹٤ھ.ق، ج ۲، ص ۹۰؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۲ئ)، ج ۱۳، ص ۱۹ اور ج ۱، ص ۱۵۔

(۲) ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۵؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج ۲، ص ۱۸۰۔

(۳) ابو الفرج اصفہانی، مقاتل الطالبین (نجف اشرف: منشورات المکتبۃ الحیدریہ)، ص ۱۵۔

میں نے کہا: میں نے رسول خدا ﷺ کے لڑکوں کے بارے میں پوچھا ہے ۔ کہا: رسول خدا ﷺ اپنے تمام لڑکوں میں علی کو زیادہ چاہتے ہیں اور سب سے زیادہ ان پر مہربان ہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے علی کو زمانۂ کمسنی سے اپنے سے الگ کیا ہو؟ مگر ایک سفر میں جو آپ نے جناب خدیجہ کے لئے کیا تھا۔ ہم نے کسی پدر کو اپنی اولاد کے بارے میں رسول خد ﷺ اسے زیادہ مہربان نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی علی سے زیادہ فرمانبردار کوئی لڑکا دیکھا ہے جو اپنے باپ کی فرمانبرداری کرے۔[1]

بعثت کے بعد حضرت محمد ﷺ نے علی کو اس طرح سے تعلیمات اسلام سے آگاہ کیا کہ اگر رات میں وحی نازل ہوتی تھی تو صبح ہونے سے قبل علی کو بتادیتے تھے اور اگر دن میں وحی نازل ہوتی تھی تو رات ہونے سے قبل علی کو اس سے آگاہ کردیتے تھے۔[2]

علی سے پوچھا گیا: کس طرح آپ نے دوسرے اصحاب سے پہلے آنحضرت ﷺ سے حدیث سیکھی؟ تو آپ نے جواب دیا: جب میں پیغمبر ﷺ سے پوچھتا تھا تو وہ جواب دیتے تھے اور جب میں خاموش رہتا تھا تو وہ خود مجھے حدیث بتاتے تھے۔[3]

حضرت علی نے اپنے دور خلافت میں اپنی تربیت کے زمانہ کو یاد کرکے اس طرح سے فرمایا ہے:

"اور تم رسول خدا ﷺ کی قریبی قرابت کے حوالے سے میرا مقام اور بالخصوص قدر و منزلت جانتے ہی ہو میں بچہ تھا کہ رسول ﷺ نے مجھے گود میں لے لیا تھا مجھے اپنے سینہ سے چمٹائے رکھتے تھے اور بستر میں اپنے پہلو میں جگہ دیتے اور جسم مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے ۔ وہ کوئی چیز خود چباتے پھر اس کے لقمے میرے منھ میں دیتے تھے اور میں ان کے پیچھے پیچھے اس طرح لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے رہتا ہے وہ ہر روز مجھے اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتے تھے

---

(۱) ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۳، ص ۲۰۰۔

(۲) شیخ طوسی، الامالی (قم: دار الثقافہ للطباعۃ والنشر و التوزیع، ط ۱، ۱۴۱۴ھ.ق)، ص ۶۲۴۔

(۳) سیوطی، تاریخ الخلفاء (قاہرہ: ط۳، ۱۳۸۳ھ.ق)، ص ۱۷۰۔

اور مجھے اس کی پیروی کا حکم دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ (کوہ) حرا میں مجھے ساتھ رکھتے تھے اور وہاں انھیں میرے سوا کوئی نہیں دیکھتا تھا... اور جب حضور پر پہلے پہل وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی چیخ سنی جس پر میں نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ آواز کیسی ہے؟ فرمایا: یہ شیطان ہے جو اپنی عبادت سے محروم ہوگیا ہے جو کچھ میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو فرق صرف یہ ہے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ تم میرے وزیر ہو اور یقینا خیر پر ہو۔[1]

اگرچہ یہ بات بعثت کے بعد پیغمبر ﷺ کی عبادت سے مربوط ہو سکتی ہے جو آپ نے غار حرا میں انجام دی ہے لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ پیغمبر ﷺ کی عبادت غار حرا میں غالباً رسالت سے قبل رہی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ موضوع، حضرت محمد ﷺ کی رسالت سے قبل کا تھا اور شیطان کے نالہ و فریاد کا سننا آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت، جب قرآن کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں تھیں۔ اس وقت سے مربوط ہے۔ بہرحال علی کی پاکیزہ نفسی اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مسلسل تربیت کی وجہ سے وہ بچپنے ہی سے اپنی چشم بصیرت و بصارت اور گوش سماعت اور قلبی ادراک کے ذریعہ ایسی چیزونکو دیکھتے اور سنتے تھے جو عام انسانوں کے لئے ممکن نہیں تھا۔

---

(۱) نہج البلاغہ، صبحی صالح، خطبہ ۱۹۲

تیسرا حصہ

بعثت سے ہجرت تک

پہلی فصل: بعثت اور تبلیغ

دوسری فصل: علی الاعلان تبلیغ اور مخالفتوں کا آغاز

تیسری فصل: قریش کی مخالفتوں کے نتائج اور ان کے اقدامات

پہلی فصل

بعثت اور تبلیغ

رسالت کے استقبال میں

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے آباء و اجداد موحد تھے اور ان کا خاندان طیب و طاہر تھا اور خدا نے انھیں حسب و نسب کی طہارت کے علاوہ بہترین تربیت سے نوازا تھا وہ بچپنے سے ہی اہل مکہ کے برے اخلاق اور بت پرستی میں ملوث نہیں تھے۔(۱) وہ بچپنے سے ہی خداوند عالم کی عنایت اور اس کی خاص تربیت کے زیر نظر تھے اور آپ کے زمانۂ تربیت کو حضرت علی نے اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

"اور خدا نے آنحضرت ﷺ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم المرتبت ملک کو آپ کے ساتھ کردیا تھا جو شب و روز بزرگوں کی راہ اور حسن اخلاق کی طرف لے چلتا تھا۔(۲)

---

(۱)علی بن برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیہ (انسان العیون)، (بیروت: دار المعرفہ)، ج۱، ص ۲۰۴-۱۹۹؛ ابی الفداء اسماعیل بن کثیر، السیرۃ النبویہ، تحقیق: مصطفی عبد الواحد(قاہرہ: مطبعہ عیسی البابی الحلبی)، ج۱، ص ۲۵

(۲)و لقد قرن اللہ بہ من لدن ان کان فطیماً اعظم ملک من ملائکتہ، یسلک بہ طریق المکارم و محاسن اخلاق العالم لیلہ و نہارہ...، *نہج البلاغہ*، حطبہ ۱۹۲.

حضرت امام محمد باقر نے فرمایا ہے: جس وقت سے آنحضرت ﷺ کا دودھ چھوڑایا گیا خداوند عالم نے آپ کے ساتھ ایک بڑے فرشتہ کو کردیا تاکہ وہ آپ کو نیکیوں اور اچھے اخلاق کی تعلیم دے اور برائیوں اور برے اخلاق سے روکے یہ وہی فرشتہ تھا جس نے جوانی میں آپ کو مبعوث بہ رسالت ہونے سے قبل آواز دی تھی اور کہا تھا: "السلام علیک یا محمد رسول اللہؐ" لیکن آپ نے سوچا کیا کہ یہ آواز پتھر اور زمین سے آرہی ہے کافی غور کیا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔(۱)

بعثت سے قبل حضرت محمد ﷺ کی عقل و فکر کامل ہوچکی تھی اور آپ کو اپنے یہاں کے آلودہ ماحول سے تکلیف اور کوفت ہوتی تھی لہذا آپ لوگوں سے بچتے تھے۔(۲) اور ۳۷ سال کی عمر میں آپ کے اندر معنویت پیدا ہوگئی تھی اور آپ محسوس کرتے تھے کہ غیب کے دریچے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں آپ کے بارے میں جو باتیں اکثر آپ کے رشتہ داروں اور اہل کتاب کے دانشوروں جیسے بحیرا، نسطور وغیرہ کے ذریعہ سنی گئی تھیں، وہ عنقریب رونما ہونے والی تھیں کیونکہ آپ ایک خاص نور دیکھنے لگے تھے اور آپ کے اوپر اسرار فاش ہونے لگے تھے اور اکثر آپ کے کانوں سے غیب کی صدا ٹکراتی تھی لیکن کسی کو آپ دیکھتے نہیں تھے۔(۳) کچھ دنوں تک خواب کی حالت میں آواز سنائی پڑتی تھی کہ کوئی انھیں پیغمبر ﷺ کہہ رہا ہے ایک دن مکہ کے اطراف کے بیابانوں میں ایک شخص نے آپ کو رسول اللہ کہہ کر پکارا آپ نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "میں جبرئیل ہوں۔

---

(۱) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۱ئ)، ج ۱، ص ۲۰۷

(۲) ابن کثیر، سابق، ج ۱، ص ۳۸۹.

(۳) حلبی، سابق، ج ۱، ص ۳۸۱۔ ۳۸۰؛ ابن ہشام، السیرة النبویہ، تحقیق: مصطفی السقاء اور دوسرے افراد (قاہرہ: مطبعہ مصطفی البابی الحبی، ۱۳۵۵ھ)، ج ۱، ص ۱۵۰؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج ۲، ص ۲۰۴۔ ۲۰۳؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعہ العلمیہ)، ج ۱، ص ۴۳؛ مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ج ۱۸، ص ۱۸۴ اور ۱۹۳؛ مراجعہ: تاریخ یعقوبی (نجف: المکتبة الحیدریہ، ۱۳۸۴ھ)، ج ۲، ص ۱۷.

خداوند عالم نے مجھے بھیجا ہے تاکہ تمہیں پیغمبری کے منصب پر مبعوث کروں حضرت محمد ﷺ نے جس وقت یہ خبر اپنی زوجہ کو سنائی تو وہ خوش ہوکر بولیں "امید کرتی ہوں کہ ایسا ہی ہو"۔[1]

اس وقت حضرت محمد ﷺ سال میں کچھ دن "غار حرا"[2] میں رہا کرتے تھے اور دعا و عبادت کیا کرتے تھے[3] اور اس طرح کی گوشہ نشینی اور غار حرا میں عبادت، قریش کے خدا پرستوں میں سابقہ نہیں رکھتی تھی۔[4] پہلا شخص جس نے اس سنت کو قائم کیا حضرت محمد ﷺ کے جد حضرت عبد المطلب تھے کہ جب ماہ رمضان آتا تھا تو غار حرا میں چلے جاتے تھے اور فقیروں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔[5]

---

(۱) ابن شہر آشوب، سابق، ج ۱، ص ٤٤؛ مجلسی، سابق، ج۱۸، ص ۱۹٤؛ طبرسی، اعلام الوریٰ باعلام الہدی (تہران: دار الکتب السامیہ، ط۳)، ص ۳٦؛ ان دلائل و شواہد کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ مرحوم کلینی نے روایت کی ہے حضرت محمد ﷺ اس وقت "نبی" تھے لیکن ابھی مرتبۂ رسالت پر نہیں پہنچے تھے (الاصول من الکافی، تہران: مکتبہ الصدوق، ۱۳۸۱ھ)، ج ۱، ص ۱۷٦۔

(۲) غار حرا مکہ کے شمال مشرقی حصے میں واقع ہے اور اس لحاظ کہ خورشید وحی کے طلوع کی جگہ قرار پائی "جبل النور" (کوہ نور) کہا جاتا ہے کچھ سال پہلے شہر مکہ سے اس پہاڑ تک تھوڑا فاصلہ پایا جاتا تھا لیکن اب، شہر مکہ کی توسیع کی بنا پر پہاڑ کے کنارے تک گھر بن گئے ہیں، حرا پہاڑ جو کئی پہاڑ کے بیچ میں ہے سب سے بلند اور اونچا ہے غار حرا جو پہاڑ کی چوٹی میں واقع ہے "در اصل وہ غار نہیں ہے بلکہ پتھر کی ایک عظیم پٹیہ جو پتھر کے دو بڑے ٹکڑوں کے اوپر چپکی ہوئی اس سے ایک چھوٹا سا غار تقریباً ڈیڑھ میٹر کا بن گیا تھا، غار کا منھ پھیلا ہوا ہے ہر شخص آسانی سے اس میں آجا سکتا ہے لیکن آدھا حصہ اس کا بعد والا تنگ اور اس کی چھت چھوٹی ہے اور سورج کی روشنی غار کے آدھے حصہ سے زیادہ نہیں پہنچ پاتی ہے۔

(۳) نہج البلاغہ، تحقیق صبحی صالح، خطبہ ۱۹۲ (قاصعہ)؛ ابن ہشام، سابق، ج ۱، ص ۲۵۱.

(٤) ابن ہشام، سابق، ج ۱، ص ۲۵۱؛ سابق، ج ۲، ص ۲۰٦؛ ابن کثیر، سابق، ج ۱، ص ۳۹۰؛ بلاذری۔

(۵) حلبی، سابق، ص ۳۸۲.

رسالت کا آغاز

حضرت محمد ﷺ جب چالیس برس کے ہوئے[۱] تو اس وقت بھی آپ اپنے قدیمی دستور کے مطابق کچھ دن کے لئے غار حرا میں چلے گئے تو وہاں وحی کا نمائندہ نازل ہوا اور خدا کی بارگاہ سے قرآن مجید کی ابتدائی آیات آپ کے سینہ پر نازل ہوئیں۔[۲]

(بسم الرحمن الرحیم. اقرأ باسم ربک الذی خلق. خلق الانسان من علق. اقرأ و ربک الأکرم. الذی علَّم بالقلم. علم الانسان ما لم یعلم"[۳]

اس خدا کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا ہے

اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے

پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے

جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے

اور انسان کو وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو اسے نہیں معلوم تھا۔

خداوند عالم نے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ فرشتۂ وحی (جناب جبرئیل) کا دیدار اور اس کے پیغام پہنچانے کو قرآن مجید میں دو مقام پر ذکر فرمایا ہے:

---

(۱) ابن ہشام، سابق، ص ۲٤۹؛ طبری، سابق، ص ۲۰۹؛ بلاذری، ص ۱۱۵ ـ ۱۱٤؛ ابن، الطبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۱۹۰؛ مسعودی، التنبیہ و الاشراف، (قاہرہ: دار الصاوی للطبع و النشر)، ص ۱۹۸؛ حلبی، سابق، ص ۳٦۳؛ مجلسی، سابق، ص ۲۰٤۔

(۲) طبرسی، مجمع البیان (تہران: شرکۃ المعارف الاسلامیہ، ۱۳۷۹ھ)، ج ۱۰، ص ۵۱٤؛ مسعودی، مروج الذہب، (بیروت: دار الاندلس، ط ۱، ۱۹٦۵ئ)، ج ۲، ص ۱۲۹ و ۲۷٦۔

(۳) سورۂ علق، آیت ۵ ـ ۱ .

قسم ہے ستارہ کی جب وہ ٹوٹا

تمہارا ساتھی (محمد ﷺ) نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا

اور وہ اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتا ہے

اس کا کلام وہی وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے

اسے (فرشتہ) نہایت طاقت والے (جبرئیل) نے تعلیم دی ہے

وہ صاحب حسن و جمال جو سیدھا کھڑا ہوا

جبکہ وہ بلند ترین افق پر تھا

پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا

یہاں تک کہ دو کمان یا اس سے کم کا فاصلہ رہ گیا

پھر خدا نے اپنے بندہ کی طرف جس راز کی بات کرنا چاہی وحی کردی

دل نے اس بات کو جھٹلایا نہیں جس کو آنکھوں نے دیکھا

کیا تم اس سے اس بات کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہو جو وہ دیکھ رہا ہے۔[۱]

تو میں ان ستاروں کی قسم کھاتا ہوں جو پلٹ جانے والے ہیں

چلنے والے اور چھپ جانے والے ہیں

اور رات کی قسم جب ختم ہونے کو آئے

---

(۱) سورۂ نجم، آیت ۱۲ـ ۱؛ اسلامی دانشوروں نے ان آیات کو پیغمبر اسلا ﷺ م کی بعثت سے مربوط قرار دیا ہے قرائن اور شواہد بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں (مراجعہ کریں: مجلسی، بحار الانوار، ج۱۸، ص ۲۴۷؛ محمدہادی معرفت، التمہید فی علوم القرآن، ج۱، ص ۳۵؛ احمد بن محمد القسطلانی، المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ، تحقیق: صالح احمد الشامی (بیروت: المکتب الاسلامی، ط ۱، ۱۴۱۲ھ) ج۳، ص ۸۹ـ ۸۸؛ لیکن دوسری تفسیر کی بنیاد پر معراج سے مربوط ہے۔

اور صبح کی قسم جب سانس لینے لگے
بیشک یہ ایک معزز فرشتے کا بیان ہے
وہ صاحب قوت ہے اور صاحب عرش کی بارگاہ کا مکین ہے
وہ وہاں قابل اطاعت اور پھر امانت دار ہے
اور تمہارا ساتھی پیغمبر دیوانہ نہیں ہے
اور اس نے فرشتہ کو بلند افق پر دیکھا ہے
اور وہ غیب کے بارے میں بخیل نہیں ہے
اور یہ قرآن کسی شیطان رجیم کا قول نہیں ہے
تو تم کدھر چلے جارہے ہو۔[1]

---

(۱) سورۂ تکویر، آیت ۲۶۔ ۱۵.

طلوع وحی کی غلط عکاسی

بعض تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں پیغمبر اسلا ﷺ م کی بعثت کو غلط اور افسانوی شکل میں نقل کیا گیا ہے جو کسی طرح سے حدیث اور تاریخی معیاروں کے مطابق، قابل قبول نہیں ہے اور اس اعتبار سے کہ یہ خبر، مشہور ہے۔ فارسی کی درسی کتابوں میں بھی نقل ہوئی ہے۔ لہٰذا مناسب ہے ہم اس کو نقل کریں اور اس پر تنقید کریں۔

عائشہ کہتی ہیں کہ پہلی بار جب رسول خدا ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو وہ سچا خواب تھا وہ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ صبح روشن کے مانند ہوا کرتا تھا اس کے بعد وہ چاہتے کہ گوشہ نشین ہوجائیں اور پھر غار حرا میں گوشہ نشین ہو جاتے تھے اور وہاں کچھ راتیں عبادت میں بسر کرتے اور پھر اپنے اہل خانہ کے پاس

واپس چلے آتے تھے اور خدیجہ سے آذوقہ لیتے تھے (اور پھر غار حرا میں واپس چلے جاتے تھے) یہاں تک کہ حق آپ کے پاس آیا اور آپ اس وقت غار میں تھے۔ فرشتہ وحی آپ کے پاس آیا اور کہا: پڑھو۔ کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے نے مجھے پکڑا اور زور سے دبایا یہاں تک کہ میں بے دم ہوگیا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں دوبارہ ہم کو پکڑا اور اتنی زور سے دبایا کہ میری ساری طاقت چلی گئی۔ اس وقت مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا ہوں تیسری بار پھر مجھے پکڑا اور اتنی زور سے دبایا کہ میری ساری طاقت ختم ہوگئی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جو خالق ہے... (پانچویں آیت تک)

اس وقت رسول خدا ﷺ لرزتے ہوئے دل کے ساتھ پلٹے اور جناب خدیجہ کے پاس پہنچے اور فرمایا: مجھے اڑھادو! مجھے اڑھادو! تو انھوں نے اڑھا دیا تاکہ آپ کا اضطراب اور خوف ختم ہو جائے{!} رسول خدا ﷺ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا اسے آپ نے خدیجہ سے بتایا اور فرمایا کہ میں اپنے بارے میں خوف زدہ ہوں{!} خدیجہ نے کہا: قسم خدا کی! خدا آپ کو ہرگز رسوا نہ فرمائے گا؛ کیونکہ آپ اپنے رشتہ داروں اور گھر والوں کے ساتھ نیکی اور غیروں کے ساتھ بخشش و خیرات کرتے ہیں۔ فقیروں اور تہی دستوں کی دلجوئی اور مہمانوں کی ضیافت اور حق والوں کی مدد فرماتے ہیں۔

پھر جناب خدیجہ آپ کے ساتھ، اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں وہ ایک سن رسیدہ اور نابینا شخص تھے اور زمانۂ جاہلیت میں عیسائیت کے گرویدہ ہوگئے تھے وہ عبرانی زبان سے واقف تھے اور انجیل کو اسی زبان میں لکھتے تھے۔

خدیجہ نے ان سے کہا: عمو زادہ! اپنے بھائی کی بات سنیئے (کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟) ورقہ نے کہا: "بھائی تم نے کیا دیکھا؟" رسول خدا ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بتایا۔ ورقہ نے کہا: "یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا کاش آج میں جوان ہوتا۔ کاش میں اس دن زندہ رہوں؟ جب تمہاری قوم والے تم کو شہر سے باہر کردیں گے"۔

رسول خدا نے فرمایا: "کیا یہ لوگ مجھے شہر سے باہر کردیں گے۔ کہا: ہاں..." [1]

تنقید و تحلیل

جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے کہ یہ روایت اس شکل میں قابل قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر سند اور متن دونوں لحاظ سے ناقابل اعتبار ہے۔

۱۔ اس واقعہ کی ناقل عائشہ ہیں اور وہ بعثت کے چوتھے یا پانچویں سال پیدا ہوئیں۔[2] لہٰذا وہ واقعہ کے وقت موجود ہی نہیں تھیں کہ واقعہ کی عینی گواہ بن سکیں اور چونکہ وہ اصلی راوی کا نام کہ شاید جس سے یہ واقعہ سنا ہے ذکر نہیں کرتیں لہٰذا ان کی نقل، فاقد سند اور علوم حدیث کی اصطلاح میں "مرسل" ہے اور روایت مرسل قابل اعتبار نہیں ہے۔

۲۔ اس روایت کی بنیاد پر فرشتۂ وحی نے متعدد بار حضرت محمد ﷺ کو پڑھنے کے لئے کہا اور آپ نے اظہار ناتوانی فرمایا۔ اگر مقصد یہ تھا کہ آنحضرت کلام خدا کو لوح سے دیکھ کر پڑھیں تو ایسی چیز معقول نہ تھی؛ کیونکہ خدا اور اس کا فرشتہ جانتا تھا کہ آپ امی ہیں اور پڑھنا نہیں جانتے ہیں اور اگر مقصد یہ تھا کہ فرشتہ کے کہنے پر آپ پڑھیں تو یہ کام کوئی مشکل نہیں تھا۔ جس سے حضرت محمد ﷺ (جو کہ ذہانت اور دقت میں معروف تھے) کمال عقل و فکر کے باوجود عاجز رہے ہوں!

---

(۱) صحیح بخاری، شرح و تحقیق: الشیخ قاسم الشماعی الرفاعی (بیروت: دار القلم، ط ۱، ۱۴۰۷ھ.ق)، ج ۱، ص ۶۰۔ ۵۹، کتاب بدء الوحی؛ صحیح مسلم، بشرح امام النووی (بیروت: دار الفکر، ۱۴۰۳ھ.ق)، ج ۲، ص ۲۰۴۔ ۱۹۷، باب بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۰۶۔ ۲۰۵۔

(۲) عسقلانی، الاصابہ فی تمیز الصحابہ (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۱، ۱۳۲۸ھ) ج ۴، ص ۳۵۹۔

۳۔ فرشتۂ وحی کے ذریعہ مسلسل دباؤ کے کیا معنی ہوسکتے ہیں؟ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یاد کرنا ایک ذہنی کام ہے جس میں دباؤ کارگر نہیں ہوتا ہے اگر خیال کریں کہ یہ کام اس لئے تھا کہ حضرت، قدرت خدا سے اچانک پڑھنا سیکھ جائیں تو صرف ارادۂ الٰہی اس کام کے لئے کافی تھا ان مقدمات کی ضرورت نہیں تھی اور اگر دباؤ کے مسئلہ کو رسول خد ﷺ ا، پروردگار عالم اور عالم غیب سے مربوط سمجھیں پھر بھی قابل تاویل نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ خداوند عالم نے صراحت کے ساتھ قرآن میں بیان کردیا ہے کہ پیغمبروں کا رابطہ عالم غیب سے ان تین طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ رہا ہے۔

۱۔ ڈائرکٹ رابطہ اور بغیر کسی واسطہ کے پیغام الٰہی کو دریافت کرنا؛

۲۔ آواز کے ذریعہ، بغیر کسی کو دیکھے ہوئے؛

۳۔ فرشتۂ وحی کے ذریعہ۔(۱)

صرف وحی کے بغیر کسی واسطے کے دریافت کرنے پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے دباؤ اور سختی کو برداشت کیا اور بعض روایتوں کی بنیاد پر آپ کا چہرہ متغیر ہو جایا کرتا تھا اور عرق کے قطرات موتی کی شکل میں آپ کے چہرے سے گرنے لگتے تھے۔(۲)

لیکن اگر پیغام الٰہی فرشتہ کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا تو حضرت پر کوئی خاص کیفیت طاری نہیں ہوا کرتی تھی جیسا کہ حضرت امام صادق فرماتے ہیں: "جس وقت وحی جبرئیل لے کر آتے تھے تو پیغمبر ﷺ عام حالت میں فرماتے تھے۔ یہ جبرئیل ہیں یا جبرئیل نے مجھ سے اس طرح یہ کہا ہے لیکن

---

(۱)"و ما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من ورآ حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنه مایشاء انه عل حکیم" (سورۂ شوریٰ، آیت ۵۱) اس بارے میں مزید آگاہی کے لئے مراجعہ کریں: (بحار الانوار، ج۱۸، ص ۲۴۶، ۲۵۴، ۲۵۷

(۲)ابن سعد، سابق، ج۱، ص ۱۹۷؛ ابن شہر آشوب، سابق، ج۱، ص ۴۳؛ مجلسی، گزشتہ، ج۱۸، ص ۲۷۱۔

اگر وحی آپ پر براہ راست نازل ہوتی تھی تو گرانی اور بوجھ کا احساس کرتے تھے اور بے ہوشی جیسی کیفیت آپ پر طاری ہو جایا کرتی تھی"[1] جب جبرئیل حامل وحی ہوا کرتے تھے تو آنحضرت ﷺ ان کو دیکھ کر نہ تنہا کوئی خاص احساس نہ کرتے تھے بلکہ جب بھی آپ کی خدمت میں وہ حاضر ہوتے تھے، بغیر آپ کی اجازت کے آپ کی خدمت میں قدم نہیں رکھتے تھے اور پیغمبر ﷺ کی بارگاہ میں نہایت ہی ادب سے بیٹھتے تھے۔[2]

اس تشریح اور توضیح کے ساتھ چونکہ مورخین کا اتفاق ہے کہ قرآن کی ابتدائی آیات کو جبرئیل غار حرا میں لے کر آئے تھے لہٰذا کسی طرح کا بوجھ اور سنگینی نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ذمہ داری کی سنگینی کا احساس نہیں تھا اور آنحضرت ﷺ کو بت پرستوں کی مخالفت کی فکر نہیں تھی۔

٤۔ حضرت محمد ﷺ کی آمادگیوں اور تیاریوں کو دیکھتے ہوئے اور اس سے قبل، غیبی پیغاموں کے دریافت کو دیکھتے ہوئے، کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا کہ حضرت گھبرائے ہوں اور خوف و اضطراب آپ پر طاری ہوا ہو اس سے قطع نظر بعض کتابوں میں ذکر ہوا ہے کہ جناب جبرئیل شب شنبہ اور شب یکشنبہ کے ابتدائی حصہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کے قریب آئے اور تیسری بار (یعنی دوشنبہ کے دن) تھا کہ منصب رسالت پر آپ کو فائز کردیا گیا۔[3] لہٰذا غار حرا میں بھی آنحضرت ﷺ کا پہلا دیدار، فرشتے سے نہیں

---

(١) مجلسی، سابق، ص ٢٦٨ اور ٢٧١؛ صدوق، التوحید (تہران: مکتبۃ الصدوق)، ص ١١٥؛ مراجعہ کریں: مہر تابان، (آیۃ اللہ سید محمد حسین حسینی طہرانی کا انٹریو مرحوم علامہ سید محمد حسین طباطبائی سے) ص ٢١١۔ ٢٠٧۔

(٢) صدوق، کمال الدین و تمام النعمہ (قم: موسسہ النشر الاسلامی، ١٤٠٥ھ)، ج ١، ص ٨٥؛ علل الشرایع (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ١٣٨٥ھ)، باب ٧، ص ٧۔

(٣) طبری، گزشتہ حوالہ، ج ٢، ص ٢٠٧؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ١٠٥؛ مسعودی، مروج الذہب، ج ٢، ص ٢٧٦؛ تاریخ یعقوبی، ج ٢، ص ١٧۔

ہوا کہ اس کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ کو خوف و اضطراب طاری ہوا ۔ اصولی طور پر جب تک کوئی ہر لحاظ سے سرّ الٰہی (رسالت) کو لینے کے لئے تیار نہ ہو خدائے حکیم اتنا بڑا عہدہ اور منصب اس کو نہیں عطا کرتا ہے۔

۵۔ کس طرح یہ بات قابل قبول ہو سکتی ہے کہ جناب خدیجہ کی معلومات (جو کہ ایک عام فرد تھیں) پیغمبر اسلام ﷺ سے زیادہ تھیں اور وہ آنحضرت ﷺ کے خوف و اضطراب کو دیکھ کر ان کی دلجوئی اور دلداری کرتی تھیں۔

٦۔ اور سب سے زیادہ قبیح بات یہ کہ ہم حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تصور کریں جو کہ رسالت اور لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کیا چیز آئندہ رونما ہونے والی ہے اور جبرئیل امین کو نہیں پہچانتے تھے اور اس کے پیغام کو صحیح طرح سے تشخیص نہیں دے سکتے یہاں تک کہ ایک ضعیف اور نابینا مسیحی نے ان کی رسالت کے اوپر مہر تصدیق لگائی اور محمد ﷺ کو اس کے اظہارات کے ذریعہ اپنی رسالت کے بارے میں اطمینان حاصل ہوا اور ان کے دل کو سکون و قرار ملا۔ اس بات کا بے بنیاد ہونا اتنا واضح ہے کہ کسی دلیل یا برہان کی ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ اس خبر میں حضرت محمد ﷺ کی طرف جس شک و تردید کی نسبت دی گئی ہے وہ قرآن کی آیت کے مطابق نہیں ہے قرآن فرماتا ہے کہ (قلب محمد ﷺ) نے جس چیز کو دیکھا اس کو جھٹلایا نہیں۔[۱]

طبرسی (مشہور شیعہ عالم دین اور مفسر) کہتے ہیں:

"خداوند عالم اپنے رسول ﷺ کو وحی نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کو روشن دلیلوں کے ہمراہ کرے اور اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس پر وحی ہوتی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے اور اسے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس پر خوف و اضطراب طاری نہیں ہوتا۔[۲]

---

(۱) "ما كذب الفؤاد ما رأىٰ" سورۂ نجم، آیت ۱۱

(۲) مجمع البیان، ج۱۰، ص ۳۸٤، تفسیر آیہ "یا ایها المدثر..."

حضرت امام صادق نے اپنے ایک صحابی کے سوال کرنے پر کہ رسول خدا ﷺ وحی کے وقت، اس بات سے کیوں نہیں ڈرے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہوسکتا ہے؛ فرمایا: "جس وقت خداوند عالم، اپنے کسی بندے کو رسالت کے درجہ پر فائز کرتا ہے تو اس کو ایسا اطمینان و سکون عطا کردیتا ہے کہ جو کچھ خدا کی جانب سے اس پر نازل ہو وہ اس کے لئے ویسے ہی ہو جیسے کوئی اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔(۱)

کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم (جس میں عائشہ سے روایت نقل ہوئی ہے) کی شرح کرنے والے مشہور عالم ہونے کے باوجود، چونکہ اصل روایت کو مسلم جانتے تھے چونکہ اس کی صحیح تفسیر اور توضیح میں درماندہ اور حیران و پریشان ہوئے، ضعیف اور بے بنیاد توجیہات میں لگ گئے، جو باعث تعجب ہے۔(۲)

پیغمبر اسلا ﷺ م کی بعثت کے بارے میں اس کے مشابہ چند حدیثیں، عبد اللہ بن شدّاد، عبید بن عُمیر، عبد اللہ بن عباس اور عروہ بن زبیر جیسے راویوں کے ذریعہ نقل ہوئی ہیں۔ جنکی ہم نے توضیحات پیش کی ہیں ان کے ذریعہ، ان کا جعلی ہونا واضح ہو جاتا ہے اور اس کے بیان کرنے کی ضرورت

---

(۱) مجلسی، بحار الانوار، ج۱۸، ص ۲۶۲؛ محمدہادی معرفت، التمہید فی علوم القرآن (مرکزمدیریت حوزہ علمیہ قم)، ج ۱، ص ۴۹.

(۲) جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ پہلا شخص جو اس روایت کے ضعیف اور بے اعتبار ہونے کی طرف متوجہ ہوا وہ مرحوم سید عبد الحسین شرف الدین موسوی (۱۲۹۰۔ ۱۳۷۷ھ.ق) جبل عامل کے مایہ ناز شیعہ عالم دین تھے جنھوں نے اپنی کتاب "الی المجمع العلمی العربی بدمشق" اور کتاب النص و الاجتہاد، ص ۳۲۲۔ ۳۱۹ میں اس روایت پر تنقید اور تجزیہ کیا ہے پھر ہمارے محققین اور علماء نے خاص طور سے دانشمند معظم جناب علی دوانی نے مذکورہ کتاب میں اس کے ذیل میں تفصیلی بحث اور تحقیق فرمائی ہے اور مسئلہ کو مکمل حل کردیا ہے اور ہم نے اس بحث میں ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔

شعاع وحی برفراز کوہ صرا، ص ۱۰۸۔ ۷۰؛ تاریخ اسلام از آغاز تا ہجرت، ص ۱۱۰۔ ۹۸؛ نقشہ ائمہ در احیاء دین، ج ۴، ص ۴۴۔ ۶؛ الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج ۱، ص ۲۳۲۔ ۲۱۶؛ خیانت در گزارش تاریخ، ج ۲، ص ۲۳۔ ۱۳؛ التمہید، ج ۱، ص ۵۶۔ ۵۲؛ درسھایی تحلیلی از تاریخ اسلام، ج ۲، ص ۲۳۶۔ ۱۹۶۔

نہیں پڑتی۔[1] یہ غلط خبر مسیحیوں کی کتابوں میں بھی نقل ہونے لگی ہے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے اس کو زہر چھڑکنے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف وسوسہ ڈالنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔[2]

اس تنقید کے ذریعہ ان کی، غلط فہمی کا بے بنیاد ہونا بھی واضح اور آشکار ہو جاتا ہے۔

مخفی دعوت

حضرت محمد ﷺ نے تین سال تک خاموشی سے لوگوں کو تبلیغ کی[3] کیونکہ مکہ کے حالات ابھی ظاہری تبلیغ کے لئے ہموار نہیں ہوئے تھے۔ اس تین سال کے دوران آپ مخفی طور سے ایسے افراد سے ملے جن کے بارے میں آپ کو معلوم تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لہٰذا ان کو خدا کی وحدانیت اس کی عبادت اور اپنے نبوت کی طرف دعوت دی۔ اس عرصہ میں قریش آپ کے دعوے سے باخبر ہوگئے تھے۔ لہٰذا جب کہیں اپ کو راستے میں دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ نبی عبدالمطلب کا جوان آسمان سے باتیں کرتا ہے۔[1] لیکن چونکہ آپ عمومی جگہوں پر کلام نہیں کرتے تھے لہٰذا آپ کی دعوت کی باتوںسے کوئی باخبر نہیں تھا اور اسی بنا پر وہ لوگ کوئی عکس العمل نہیں دیکھاتے تھے۔

---

(۱) سید مرتضیٰ عسکری، نقش عائشہ در احیائے دین، انتشارات مجمع علمی اسلامی، ج ٤، ص ١٢.

(۲) مراجعہ کریں: دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ترجمہ عربی توسط محمد ثابت الفندی (اور دوسرے افراد)، ج ٣، ص ٣٩٨۔ (لفظ بحیرا)۔ مونٹگومری واٹ۔ اڈینبورو یونیورسٹی کے عربی محکمہ کا چیرین۔ ان لوگوں میں سے ہے جس نے اس سلسلہ میں زہر چھڑکا ہے اور بے بنیاد باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتا ہے: "... ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے آٹھویں صدی عیسوی میں مکہ جیسے دور دراز شہر میں زندگی بسر کی، یہ ایمان رکھنا کہ خدا کی جانب سے وہ پیغمبری کے لئے مبعوث ہوا ہے حیرت کی بات ہے لہٰذا تعجب کی بات نہیں ہے اگر ہم یہ سنیں کہ محمد ﷺ کو خوف اور شک لاحق ہوا تھا۔ اس سلسلے میں قرآن اور احادیث میں ایسے شواہد ملتے ہیں جو اس کی زندگی سے مربوط ہیں اور پتہ نہیں کب اسے، اطمینان حاصل ہوا کہ خدا نے اس کو فراموش نہیں کیا ہے!!۔ دوسرا خوف، جنون کا خوف تھا کیونکہ اس زمانہ میں عرب عقیدہ رکھتے تھے کہ اس طرح کے افراد، روحوں یا جنات کے قبضہ میں ہیں۔

مکہ کے کچھ لوگ حضرت محمد ﷺ کے الہامات کو ایسا بتاتے تھے اور وہ خود بھی کبھی اس تردید کا شکار ہو جاتے تھے کہ حق ان لوگوں کے ساتھ ہے یا نہیں؟!! (محمد پیامبر و سیاستمدار، ترجمہ اسماعیل والی زادہ (تہران: کتابفروشی اسلامی، ١٣٤٤)، ص ٢٧۔ ٢٦.

(۳) ابن ہاشم، سابق، ج ١، ص ٢٨٠؛ طبری، سابق، ج ٢، ص ٢١٦؛ مسعودی، مروج الذہب، ج ٢، ص ٢٧٦۔ ٢٧٥؛ بلاذری، سابق، ج ١، ص ١١٦؛ تاریخ یعقوبی، ج ٢، ص ١٩؛ حلبی، سابق، ج ١، ص ٤٥٦؛ طوسی، الغیبہ (تہران: مکتبہ نینوی الحدیثہ)، ص ٢٠٢؛ صدوق، کمال الدین و تمام النعمۃ، (قم: موسسہ النشر الاسلامی، ١٣٦٣)، ج ٢، ص ٣٤٤، ح ٢٩.

اس عرصہ میں کچھ لوگ مسلمان ہوئے اور انھیں ابتدائی مسلمانوں میں سے ایک شخص جس کا نام ارقم تھا اس نے اپنا گھر (جو صفا پہاڑی کے کنارے تھا) پیغمبر ﷺ کے حوالہ کردیا حضرت رسول خدا ﷺ اور تمام مسلمان اسی گھر میں؛ جو تبلیغات کا سنٹر تھا ظاہری تبلیغ کے زمانہ تک جمع ہوتے تھے اور وہیں نماز پڑھا کرتے تھے۔[۲]

پہلے مسلمان مرد اور عورت

تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ جناب خدیجہ وہ پہلی خاتون ہیں جو مسلمان ہوئیں اور مردوں میں حضرت علی وہ پہلے شخص ہیں جو پیغمبر ﷺ کے گرویدہ ہوئے۔(۳-٤) کیونکہ یہ بات فطری ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م

نے غار حرا سے پلٹنے کے بعد اپنے آئین کو سب سے پہلے اپنی شریک حیات جناب خدیجہ اور حضرت علی جو اسی گھر کی ایک فرد اور آپ کی آغوش کے پرورده تھے ان کے درمیان بیان کیا اور ان دونوں حضرات نے، جو کہ آپ کی نبوت کی نشانیوں اور صداقت و راستگوئی سے اچھی طرح واقف تھے، اس کی تصدیق کی۔

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۱۹؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج۱، ص ۱۹۹؛ بلاذری، سابق، ج۱، ص ۱۱۵

(۲) حلبی، سابق، ج۱، ص ٤٥٧۔ ٤٥٦.

(۳) ابن ہشام نے ابتدائی مسلمانوں کی تعداد ۸ افراد تک اس طرح سے نقل کی ہے "علی، زید بن حارثہ، ابوبکر، عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبد الرحمان بن عوف، سعد بن وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ" (السیرۃ النبویہ، ج۱، ص ۲٦۹۔ ۲٦۲.)

(٤) جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ چونکہ علی بچپنے سے موحد تھے اور کبھی بت پرستی میں آلودہ نہیں ہوئے ان کے مسلمان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پہلے (معاذ اللہ) بت پرست تھے اور پھر اسے ترک کردیا۔ (جبکہ پیغمبر ﷺ کے دوسرے اصحاب کے بارے میں ایسا ہی تھا) بلکہ انھوں نے حقیقت میں دین اسلام جو کہ اسی توحید پر استوار تھا بہ عنوان دین آسمانی قبول کیا۔ زینی دحلان لکھتے ہیں "علی ہرگز سابقہ شرک نہیں رکھتے تھے؛ کیونکہ وہ رسول خدا ﷺ کے ایک فرزند کی طرح آنحضرت کے ہمراہ اور ان کے زیر تربیت تھے اور تمام امور میں ان کی پیروی کرتے تھے حدیث میں آیا ہے کہ تین افراد نے ہرگز کفر نہیں اختیار کیا، مومن آل یاسین، علی بن ابی طالب، آسیہ فرعون کی بیوی (السیرۃ النبویہ، ج۱، ص ۹۲) ابن سعد علی کے بارے میں نقل کرتا ہے کہ لم یعبد الاوثان قط لصغرہ۔ (الطبقات الکبریٰ، ج۳، ص ۲۱) اور ابن حجر ہیثمی مکی (۹۷٤۲ھ.ق.) ابن سعد کے اس جملہ کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: و من ثم یقال فیہ کرم اللہ وجہہ۔ (الصواعق المحرقۃ۔ الباب التاسع، ص ۱۲۰) قبول اسلام کے وقت علی کے سن کے بارے میں مراجعہ کریں: شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید (ط مصر) ج۱۳، ص ۲۳۵۔ ۲۳٤۔

حضرت علی کی سبقت کی دلیلیں

جو کچھ ذکر ہو چکا ہے اس کے اعتبار سے اگر کوئی حدیث یا تاریخی سند اس مطلب کی تائید نہ بھی کرے پھر بھی اس کا ثابت کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جبکہ بے شمار دلیلیں اور شواہد ایسے موجود ہیں جو اس موضوع کی تائید کرتے ہیں، نمونہ کے طور پر ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ حضرت علی کے پہلے اسلام قبول کرنے کو پیغمبر اسلا ﷺ م نے بیان کیا ہے اور مسلمانوں کے ایک گروہ کے درمیان فرمایا ہے: "تم میں سے سب سے پہلا شخص، جو روز قیامت مجھ سے حوض (کوثر) پر ملاقات کرے گا وہ علی بن ابی طالب ہوں گے جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا ہے"۔[۱]

---

(۱) اولکم وروداً علی الحوض ، اولکم اسلاماً علی بن ابی طالب۔ (ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، حاشیۃ الاصابہ میں، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۱، ۱۳۲۸ھ)، ج۳، ص ۲۸؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۳، ص ۲۲۹؛ مراجعہ کریں: الحاکم النیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین، تحقیق: عبد الرحمن المرعشی (بیروت: دار المعرفہ، ط ۱، ۱٤۰٦ھ)، ج۳، ص ۱۷؛ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد (بیروت: دار الکتاب العربی)، ج۲، ص ۸۱؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ٤۳۲؛ بعض روایات میں اس طرح نقل ہوا ہے: اول ہذہ الامۃ وروداً علی الحوض اولہا اسلاماً علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالی عنہ۔ (حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ٤۳۲.)

۲۔ علمائے کرام اور محدثین نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلا ﷺ م دوشنبہ کے دن مبعوث بہ نبوت ہوئے اور علی نے اس کے دوسرے دن (سہ شنبہ) آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔[۱]

۳۔ حضرت علی نے خود فرمایا ہے:

اس روز اسلام، صرف پیغمبر ﷺ اور خدیجہ کے گھر میں داخل ہوا تھا اور میں ان میں سے تیسرا شخص تھا میں نے نور وحی اور رسالت کو دیکھا اور نبوت کی خوشبو کو محسوس کیا۔[۲]

٤۔ امیر المومنین علی ایک دوسری جگہ اسلام میں اپنی سبقت کے بارے میں اس طرح سے بیان فرماتے ہیں:

اے خدا! میں وہ پہلا شخص ہوں جو تیری طرف آیا ہوں اور تیرے پیغام کو سنا اور پیغمبر ﷺ کی دعوت پر لبیک کہی ہے مجھ سے پہلے پیغمبر ﷺ کے علاوہ کسی نے نماز نہیں پڑھی ہے۔[۳]

---

(۱) استنبیء النبی یوم الأثنین و صلی علی یوم الثلاثائ۔ (ابن عبد البر، گزشتہ حوالہ، ص ۳۲؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر، ۱۳۹۹)، ج۲، ص ۵۷.) حاکم نیشاپوری، اس حدیث کو دو طریقہ سے "نبیء رسول اللہ..." اور "وحی رسول اللہ یوم الاثنین..." نقل کیا ہے (گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۱۲.) بعض روایات میں اس طرح نقل ہوا ہے: استنبیء النبی ﷺ یوم الاثنین و اسلم علی یوم الثلاثائ۔ (ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۹؛ جوینی خراسانی، فرائد السمطین (بیروت: مؤسسۃ المحمودی للطباعۃ و النشر، ط ۱ ج ۱، ص ۲٤٤)۔ علی خود بھی اس بات پر تاکید کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بعث رسول اللہ یوم الاثنین و اسلمت یوم الثلاثائ۔ (سیوطی، تاریخ الخلفاء (قاہرہ: المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ، ط ۳، ۱۳۸۳ھ)، ص ١٦٦؛ الشیخ محمد الصبان، اسعاف الراغبین، درحاشیہ نور الابصار، ص ١٤٨؛ احمد بن حجر الھیتمی المکی، الصواعق المحرقہ (قاہرہ: ط۲، ۱۳۸۵ھ ۱۲۰.)

(۲) لم یجمع بیت واحد یومئذ فی الاسلام غیر رسول اللہ و خدیجہ و انا ثالثھما، اریٰ نور الوحی و الرسالۃ و اشم ریح النبوۃ۔ (نہج البلاغہ، تحقیق: صبحی صالح، خطبہ ۱۹۲ (قاصعہ)

(۳) اللّٰھم انی اول من اناب، و سمع و اجاب، لم یسبقنی الا رسول اللہ بالصلاۃ۔ (گزشتہ حوالہ، خطبہ ۱۳۱)

۵۔ اور ایک جگہ آپ نے اس طرح سے فرمایا: میں خدا کا بندہ، پیغمبر ﷺ کا بھائی اور صدیق اکبر ہوں میرے بعد اس کلام کو، سوائے جھوٹے، افتراء پرداز کے کوئی نہیں کہے گا۔ میں نے سات سال کی عمر میں، لوگوں سے پہلے رسول خدا کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔[۱]

٦۔ عفیف بن قیس کندی کہتا ہے: میں دور جاہلیت میں عطر کا تاجر تھا۔ ایک تجارتی سفر کی غرض سے مکہ گیا جب مکہ میں داخل ہوا تو عباس (جو کہ مکہ کے ایک تاجر اور پیغمبر ﷺ کے چچا تھے) کا مہمان ہوا، ایک دن میں مسجد الحرام میں عباس کے بغل میں بیٹھا ہوا تھا اور سورج نصف النہار کو پہنچ چکا تھا اس عالم میں ایک جوان مسجد میں داخل ہوا جس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی اور پھر کعبے کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا کچھ دیر گزری تھی کہ ایک خوبصورت نوجوان آیا اور اس کے داہنی طرف کھڑا ہو گیا پھر ایک نقاب پوش خاتون آئی اور ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور تینوں ایک ساتھ نماز میں مشغول ہو گئے اور رکوع و سجود بجالانے لگے۔

میں (بت پرستوں کے بیچ یہ منظر دیکھ کر کہ تین افراد آئین بت پرستی سے ہٹ کر ایک دوسرے آئین کو اپنائے ہوئے ہیں) حیرت میں پڑ گیا اور عباس کی طرف رخ کر کے کہا: یہ بہت بڑا واقعہ ہے! اس نے بھی اسی جملہ کو دہرایا اور مزید کہا: کیا تم ان تینوں کو پہچانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں: اس نے کہا: پہلا شخص جو دونوں سے پہلے داخل ہوا وہ میرا بھتیجا محمد بن عبد اللہ ہے اور دوسرا شخص میرا دوسرا بھتیجا علی بن ابی طالب ہے اور تیسرے محمد ﷺ کی زوجہ ہیں. محمد ﷺ کا دعوا ہے کہ اس کا دین خدا کی طرف سے نازل ہوا

---

(۱)انا عبد اللہ و اخو رسولہ و انا الصدیق الاکبر لایقولھا بعدی الا کاذب مفتر. صلیت مع رسول اللہ قبل الناس سبع سنین.(طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۱۲؛ ابن اثیر، کامل فی التاریخ، ج۲، ص۵۷.) اور اسی مضمون پر کتاب "مستدرک علی الصحیحین، ج۳، ص ۱۱۲؛ میں جمع آوری ہوئی ہے۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۳، ص ۲۰۰، و ۲۲۸؛ مراجعہ کریں: مناقب علی بن ابی طالب، ابوبکر احمد بن موسی مردویہ اصفہانی، اور مقدمہ عبد الرزاق محمد حسین حرز الدین (قم: دار الحدیث، ط۱، ۱٤۲۲ھ)، ص ٤۸۔ ٤۷.

ہے اور ابھی روئے زمین پر ان تینوں کے علاوہ کسی نے اس دین کی پیروی نہیں کی ہے۔[۱]

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کی دعوت کے آغاز میں آپ کی زوجہ جناب خدیجہ کے علاوہ صرف حضرت علی نے آپ کے آئین کو قبول کیا تھا۔

اسلام کے قبول کرنے میں پیش قدمی کرنا ایک ایسی فضیلت ہے جس پر قرآن نے تکیہ کر کے فرمایا ہے: "جو لوگ اسلام لانے میں پیش قدم تھے خدا کی بارگاہ میں بلند درجہ رکھتے ہیں اور وہی اللہ کی بارگاہ میں مقرب ہیں"۔[۲]

دین اسلام، قبول کرنے میں سبقت کے موضوع پر قرآن کی خاص توجہ اس حد تک ہے کہ جو لوگ فتح مکہ سے قبل ایمان لائے اور خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال سے دریغ نہیں کیا، یہ لوگ ان لوگوں سے جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور جہاد کیا، بنص قرآن ان سے افضل اور برتر ہیں۔

"اور تم میں فتح مکہ سے پہلے انفاق اور جہاد کرنے والا اس کے جیسا نہیں ہو سکتا ہے جو فتح کے بعد انفاق اور جہاد کرے۔ پہلے جہاد کرنے والے کا درجہ بہت بلند ہے اگرچہ خدا نے سب سے نیکی کا

---

(۱) طبری، سابق، ج۲، ص ۲۱۲؛ ابن ابی الحدید، سابق، ج ۱۳، ص ۲۲٦- ابن ابی الحدید نے اس واقعہ کو عبد اللہ بن مسعود سے بھی نقل کیا ہے: وہ مکہ کے سفر میں اس واقعہ کے گواہ تھے- حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج ۱، ص ٤۳٦- اسی طرح مراجعہ کریں: ابن عبد البر، الاستیعاب (الاصابہ کے حاشیہ میں) ج۳، ص ۱٦٥؛ عفیف بن قیس کندی کے حالات زندگی کی تشریح میں، ص ۳۳؛ پر علی کے حالات زندگی میں تھوڑا لفظ کے اختلاف کے ساتھ؛ محمد بن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: ڈاکٹر سہیل زکار، (بیروت، دار المعرفہ، ط ۱، ۱۳۹۸ھ) ص ۱۳۸- ۱۳۷؛ ابو الفتح کراجکی، کنز الفوائد (قم: دار الذخائر، ط ۱، ۱٤۱۰ھ)، ج ۱، ص ۲٦۲- اور اسلام قبول کرنے میں علی کی پیش قدمی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے الغدیر کی طرف رجوع کریں- ج ۲، ص ۳۱٤؛ ج ۳، ص ۲۲٤- ۲۲۰

(۲) "والسابقون السابقون. اولئک المقربون." سورۂ واقعہ، آیت ۱۱- ۱۰.

وعدہ کیا ہے اور وہ تمہارے جملہ اعمال سے باخبر ہے"۔[1]

مسلمانوں کے ایمان کی برتری کی وجہ فتح مکہ (جو کہ ۸ھ میں رخ پایا) سے پہلے یہ تھی کہ وہ لوگ ایسے وقت میں ایمان لائے کہ جب اسلام، جزیرۃ العرب میں پورے طور سے قدم نہیں جما سکا تھا اور ابھی بت پرستوں کا اڈہ، یعنی شہر مکہ شکست ناپزیر قلعہ کے مانند باقی رہ گیا تھا اور ہر طرف سے خطرات مسلمانوں کی جان و مال کو خوف زدہ کئے ہوئے تھے. البتہ مدینہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کے بعد اور دو قبیلے، اوس و خزرج اور مدینہ کے اطراف میں موجودہ قبائل کا، اسلام کی طرف رجحان پیدا ہونے سے وہاں ترقی اور کچھ امنیت پائی جانے لگی تھی اور بہت ساری لڑائیوں میں انھیں کامیابی بھی ملی۔ لیکن چونکہ خطرات ابھی پورے طور سے برطرف نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اسلام کی طرف رجحان اور جان و مال کی قربانی خاص اہمیت رکھتی تھی۔ یقینا ایسا کام، پیغمبر ﷺ کی تبلیغ کے آغاز میں جبکہ قریش کی قدرت کے علاوہ اور کوئی قدرت اور بت پرستوں کی طاقت کے علاوہ اور کوئی طاقت نہ تھی، بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اسی وجہ سے پیغمبر اسلا ﷺ م کے اصحاب کے درمیان اسلام میں سبقت کو ایک بہت بڑا افتخار سمجھا جاتا تھا اور اس توضیح کے ذریعہ اسلام کے سلسلہ میں حضرت علی کی سبقت کی اہمیت اور آپ کے معیار کا اچھی طرح سے اندازہ ہو جاتا ہے۔

اسلام قبول کرنے میں سبقت کرنے والے گروہ

اس زمانہ کے اجتماعی گروہوں اور طبقوں میں سے دو طبقہ اسلام قبول کرنے میں پیش قدم تھا۔

الف: جوانوں کا طبقہ:

ابتدائی مسلمانوں کی فہرست کا تجزیہ کرنے اور دوسرے شواہد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر ابتدائی مسلمان جوان تھے۔ بزرگ اور سن رسیدہ افراد مخالف تھے اور بت پرستی

---

(۱) "لایستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل اولٰئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد و قاتلوا و کلًّا وعد اللہ الحسنیٰ..." (سورۂ حدید، آیت ۱۰)

کا رواج ان کے افکار میں رچ بس گیا تھا۔ لیکن جوان نسل کے اذہان اور افکار، جوانی کی بنا پر نئے عقائد او رافکار کو قبول کرنے کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔

ایک تاریخی رپورٹ کی بنیاد پر پیغمبر اسلا ﷺ م کے مخفی دعوت کے زمانہ میں جوانوں اور ضعیفوں کا ایک گروہ اسلام کا گرویدہ ہوگیا تھا۔(۱)

جس وقت پیغمبر اسلا ﷺ م نے ظاہری تبلیغ کا آغاز کیا اور آپ کی اتباع اور پیروی کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو قریش کے سردار کئی مرتبہ ابو طالب سے شکایت کرنے کے بعد، آخری بار ان کے پاس آئے اور ان سے کہا: ہم کئی بار تمہارے پاس آچکے ہیں تاکہ تمہارے بھتیجے کے بارے میں تم سے بات کریں کہ ہمارے آباؤ و اجداد اور خداؤوں کو برا بھلا نہ کہیں اور ہمارے بچوں، جوانوں، غلاموں اور کنیزوں کو ہمارے راستے سے نہ ہٹائیں..."۔(۲)

پیغمبر اسلا ﷺ م نے جب طائف کا تبلیغی سفر کیا تو اس شہر کی اہم شخصیتوں نے اس ڈر سے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا کہ کہیں ان کے جوان آنحضرت ﷺ کی پیروی نہ کرنے لگیں۔(۳) مسلمانوں کے حبشہ ہجرت کرنے کے بعد جب قریش کے نمائندے مہاجرین کو پلٹانے کے لئے نجاشی کے دربار میں گئے تو درباریوں سے گفتگو کے دوران اسلام کی طرف مکہ کے جوانوں کے رجحانات کی شکایت کی۔(٤)

ایک شخص قبیلۂ "ہذیل" سے مکے میں آیا تو پیغمبر اسلا ﷺ م نے اسے اسلام کی طرف دعوت دی۔

---

(۱) ابن سعد، طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۱۹۹.

(۲) بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف، ط ۳)، ج ۱، ص ۲۲۹؛ مراجعہ کریں: بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۱۸۵ .

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۱۲۔

(٤) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۵۸؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط ۳)، ص ٤٤؛ سبط ابن جوزی، تذکرۃ الخواص (نجف: المکتبہ الحیدریہ، ۱۳۸۳ھ)، ص ۱۸٦۔

ابو جہل نے اس ہذلی سے کہا: "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس کی بات کو قبول کرلو؛ اس لئے کہ وہ ہم کو بے وقوف اور ہمارے گزشتہ آبا و اجداد کو جہنمی کہتا ہے اور دوسری عجیب و غریب باتیں کرتا ہے!"

ہذلی نے کہا: تم کیوں نہیں اس کو اپنے شہر سے باہر کردیتے؟

ابو جہل نے جواب دیا: اگر وہ باہر چلا گیا اور جوانوں نے اس کی باتوں کو سن لیا اور اس کی شیرین بیانی کو دیکھ لیا تو وہ اس کے گرویدہ ہو جائیں گے اور اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور ممکن ہے وہ ان کی مدد سے ہم پر حملہ کردے۔[۱]

عتبہ: (قریش کا ایک سردار) نے بھی اسعد بن زرارہ (جو کہ مدینہ میں قبیلۂ خزرج کے بزرگوں میں سے تھا) سے ملنے پر پیغمبر اسلام ﷺ سے جوانوں کے رجحانات اور لگاؤ کا شکوہ کیا۔[۲]

ابتدائی مسلمانوں کی فہرست کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں زیادہ تر افراد کی عمر، اسلام قبول کرتے وقت ۳۰ سال سے کم تھی۔ مثلاً سعد بن وقاص ۱۷[۳] یا ۱۹[٤] سال، زبیر بن عوام ۱۵[٥] یا ۱٦[٦] اور عبد الرحمن بن عوف ۳۰ سال کے تھے کیونکہ وہ "عام الفیل" کے دس سال بعد پیدا ہوئے تھے۔[۷] مصعب ابن عمیر بھی تقریباً ۲۵ سال کے تھے۔ کیونکہ جنگ احد ۳ھ میں شہادت کے وقت تقریباً چالیس سال کے تھے۔[۸] ارقم جن کا گھر پیغمبر ﷺ کے اختیار میں تھا وہ ۲۰ یا ۳۰

---

(۱) بلاذری، سابق، ص ۱۲۸.

(۲) طبرسی، سابق، ص ٥٦.

(۳) ابن سعد، سابق، ج۳، ص ۱۳۹.

(٤) حلبی، سیرۃ الحلبیہ، (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۱، ص ٤٤٦.

(٥) حلبی، سابق، ج ۱، ص ٤۳٤.

(٦) ابن سعد، سابق، ج۳، ص ۱۰۲.

(۷) گزشتہ حوالہ، ص ۱۲٤.

(۸) ابن سعد، سابق، ج۳، ص ۲۲۲.

سال کے تھے کیونکہ مرتے وقت (۵۵ھ) میں وہ ۸۰ یا ۸۲ سال کے تھے۔[1]

ب: محروموں اور مظلوموں کا طبقہ:

اس گروہ کا مطلب جو اسلامی کتابوں میں "ضعیفوں" اور "مستضعفین" کے نام سے ذکر ہوا ہے۔ غلام یا آزاد شدہ افراد تھے جو اپنی آزادی کے باوجود عربوں کی رسم کے مطابق ایک طرح سے اپنے آپ کو آقاؤوں سے متعلق اور وابستہ سمجھتے تھے اور اصطلاح میں ان کو "مولیٰ" (آزاد شدہ) کہا جاتا تھا۔ مستضعفین کا دوسرا گروہ پردیسی اور مسافروں کا تھا جو دوسرے علاقوں سے آکر مکہ میں بس گئے تھے اور چونکہ وہاں کے کسی قبیلہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا وہ مجبوری کے تحت اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے کسی ایک طاقت ور قبیلہ کی پناہ میں رہتے تھے لیکن پھر بھی قریش کے لوگوں کے مساوی حقوق سے محروم تھے اور اجتماعی لحاظ سے انھیں ایک پست اور حقیر طبقہ سمجھا جاتا تھا۔

مکہ میں اس گروہ کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں تھا اور نہ ہی اس کے پاس کوئی قدرت و طاقت تھی[2] لیکن اسلام قبول کرنے میں سب سے آگے تھے لہٰذا ان کا مسلمان ہو جانا مشرکوں پر بہت ہی تلخ اور گراں گزرا اور انھیں مسلمانوں کی تحقیر کا مناسب بہانہ مل گیا۔

ایک روایت کی بنا پر جب پیغمبر اسلا ﷺ م مسجد الحرام میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ کے ضعیف پیرو، جیسے عمار یاسر، خباب بن الارت، صُہَیب بن سنان، بلال بن رَباح، ابوفکیَہ اور عامر بن فُہیر، آپ کے پہلو میں بیٹھتے تھے تو قریش ان کا مذاق اڑاتے تھے اور طعنہ دے کر ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ دیکھو اس کے ہم نشین ایسے لوگ ہیں۔ خدا نے ہم سب لوگوں کے درمیان مینٔسے فقط ان

---

(۱) ابن سعد، سابق، ج۳، ص ۲٤٤۔ عبد المتعال مصری نے ایک کتاب "شباب قریش فی بدء الاسلام" کے نام سے تالیف کی ہے اور قریش کے جن چالیس جوان افراد نے دعوت اسلام کو قبول کیا تھا ان کو ترتیب کے ساتھ ذکر کیا ہے اور انھیں سنّی بتایا ہے، جن میں سب سے اول حضرت علی ہیں۔ ص ۳٤۔ ۳۳.

(۲) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۵٦ اور ۱۸۱؛ رجوع کریں: طبقات الکبریٰ، ج۳، ص ۲٤۸۔

پر احسان کیا ہے (کہ اسلام کو قبول کرکے ہدایت یافتہ ہوئے ہیں)۔[۱]

ایک دن قریش کے سرداروں کا ایک گروہ پیغمبر ﷺ کی مجلس کے بغل سے گزرا تو اس وقت صہیب ، خبّاب، بلال، عمار وغیرہ پیغمبر ﷺ کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے تھے ان لوگوں نے یہ منظر دیکھ کر کہا: "اے محمد ﷺ ! اپنی قوم والوں میں سے صرف ان پر تکیہ کیا ہے؟! کیا ہم ان کی پیروی کریں؟! کیا خدا نے صرف ان پر احسان کیا ہے (اور ان کی ہدایت کی ہے؟!) ان کو اپنے سے دور کردو شاید ہم تمہاری پیروی کرلیں ۔ اس وقت سورۂ "انعام" کی ۵۲ ویں اور ۵۳ ویں آیت نازل ہوئی۔[۲]

"اور خبردار جو لوگ صبح و شام اپنے خدا کو پکارتے ہیں اور خدا ہی کو مقصود بنائے ہوئے ہیں انھیں اپنی بزم سے الگ نہ کیجئے گا۔ نہ آپ کے ذمہ ان کا حساب ہے اور نہ ان کے ذمہ آپ کا حساب ہے کہ آپ انھیں دھتکار دیں اور اس طرح ظالموں میں شمار ہوجائیں"۔

اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ وہ یہ کہیں کہ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہمارے درمیان فضل و کرم کیا ہے اور کیا وہ اپنے شکر گزار بندوں کو بھی نہیں جانتا؟![۳]

پیغمبر ﷺ کی رسالت کے ابتدائی سالوں میں قریش نے چند نمائندے مدینہ بھیجے تاکہ اس شہر کے یہودیوں سے آپ کے بارے میں تحقیق کریں۔ ان لوگوں نے یہودیوں سے کہا: "جو حادثہ ہمارے شہر میں رونما ہوا ہے اس کے لئے ہم تمہارے پاس آئے ہوئے ہیں ایک یتیم اور حقیر جوان بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے اس کا خیال ہے کہ وہ "رحمان" کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور ہم، صرف ایک شخص کو اس نام سے جو "یمامہ" میں رہتا ہے جانتے ہیں"

یہودیوں نے پیغمبر اسلا ﷺ م کی خصوصیات کے بارے میں چند سوالات کئے ان میں ایک سوال یہ تھا

---

(۱)گزشتہ حوالہ۔

(۲) طبرسی، مجمع البیان، ج۲، ص ۳۰۵.

(۳)سورۂ انعام، آیت ۵۳۔ ۵۲۔

کہ کن لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے؟

ان لوگوں نے کہا: ہم میں سے پست لوگوں نے۔

یہودیوں کا بڑا عالم ہنسا اور کہا: یہ وہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کی نشانیاں ہماری کتابوں میں موجود ہیں اور اس کی قوم اس کی شدید دشمن ہو جائے گی۔(۱)

البتہ مفلوک الحال لوگوں کا تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف رجحان ہرگز مصلحتی اسلام یا طبقاتی منافع کی خاطر نہیں تھا بلکہ انسانی تسلط اور حکمرانی کے نفی کا پہلو اور خدائی حکمرانی کے قبول کرنے کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ سب سے زیادہ، مستکبرین اور تسلط خواہوں کے اجتماعی طاقت کے لئے خطرہ بن گیا تھا اور ان کی مخالفت کو اکسانے کا باعث بنا تھا جیسا کہ گزشتہ پیغمبروں کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

"تو ان کی قوم کے بڑے لوگ جنھوں نے کفر اختیار کرلیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو تم کو اپنا ہی جیسا ایک انسان سمجھ رہے ہیں اور تمہارے اتباع کرنے والونکو دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے پست طبقہ کے سادہ لوح افراد ہیں۔ ہم تمہارے لئے اپنے اوپر کسی فضیلت وبرتری کے قائل نہیں ہیںبلکہ تمھیں جھوٹا خیال کرتے ہیں"۔(۲)

"تو ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کمزور بنادیئے جانے والے لوگوں میں سے جو ایمان لائے تھے ان سے کہنا شروع کیا کہ کیا تمھیں اس کا یقین ہے کہ صالح خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بیشک ہمیں ان کے پیغام کا ایمان اور ایقان حاصل ہے۔ تو بڑے لوگوں نے جواب دیا کہ ہم تو ان باتوں کے منکر ہیں جن پر تم ایمان لائے ہو"۔(۳)

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱٦٥؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۴۹۹۔

(۲) سورۂ ہود، آیت ۲۷۔

(۳) سورۂ اعراف، آیت ۷٦۔ ۷۵۔

دعوت ذو العشیرہ

پیغمبر اسلا ﷺ م کی رسالت کے تیسرے سال فرشتۂ وحی خدا کا حکم لیکر آپ کے پاس نازل ہوا کہ اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کو ڈرائیں اور انھیں دعوت دیں:

"اور پیغمبر ﷺ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈارئیے اور جو صاحبان ایمان آپ کا اتباع کرلیں ان کے لئے اپنے شانوں کو جھکا دیجئے پھر یہ لوگ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں کے اعمال سے بیزار ہوں" (۱)

اس آیت کے نازل ہونے پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے علی کو حکم دیا کہ کھانے کا انتظام کیا جائے اور عبد المطلب کی اولاد کو دعوت دی جائے تاکہ خدا کا حکم ان تک پہنچایا جا سکے۔ چنانچہ علی نے ایسا ہی کیا۔ تقریباً کم و بیش چالیس (٤٠) افراد جمع ہوئے جن میں ابوطالب، حمزہ اور ابولہب بھی تھے، کھانا کم تھا اور عام طور سے اتنا کم کھانا اتنے بڑے مجمع کے لئے ناکافی تھا۔ لیکن سب نے سیر ہوکر کھایا۔ ابولہب نے کہا: "اس نے تم پر جادو کر دیا ہے" یہ بات سن کر سارا مجمع پیغمبر ﷺ کی بات سننے سے کنارہ کش ہوگیا اور پیغمبر ﷺ نے بھی کوئی بات نہیں کہی اور مجلس کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر تمام ہوگئی۔ پیغمبر ﷺ کے حکم سے دوسرے دن علی نے پھر اسی طرح کھانے کا انتظام کیا اور ان لوگوں کو دعوت دی اس مرتبہ پیغمبر ﷺ نے مجمع سے کھانا کھانے کے فوراً بعد فرمایا:

"عرب کے درمیان کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے بہتر چیز تمہارے لئے لے کر آیا ہو میں دنیا اور آخرت کی بھلائی اور نیکی تمہارے لئے لیکر آیا ہوں خدا نے حکم دیا ہے کہ تم کو اس کی جانب دعوت دوں تم میں سے کون ہے جو اس وقت میری مدد کرنے کے لئے تیار ہے؟ تاکہ وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین تمہارے درمیان قرار پائے"

کسی نے جواب نہ دیا، علی جو کہ سب سے کم سن تھے، کہا: اے خدا کے رسول ﷺ ! میں آپ کی مدد

---

(۱) سورۂ شعرا، آیت ٢١٦۔ ٢١٤۔

کرنے کے لئے تیار ہوں" پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "یہ تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے، اس کی باتوں کو سنو اور اس کی اطاعت کرو"۔[1]

یہ واقعہ ہم کو ایک بنیادی مطلب کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ "نبوت" اور "امامت" دو ایسے بنیادی اصول ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں کیونکہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے اپنی رسالت کے ابتدائی

---

(۱) یہ واقعہ اسلامی دانشوروں کے درمیان "بدء الدعوۃ"، "یوم الدار" اور "یوم الانذار" کے نام سے مشہور ہے، اکثر محدثین، مفسرین اور مورخین نے اس واقعہ کو تھوڑے سے الفاظ کے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں سے محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم و الملوک، ج۲، ص ۲۱۷؛ ابن اثیر، الکامل فی تاریخ، ج۲، ص ٦۳؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۳، ص ۲۱۱؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ترجمہ محمود مہدی دامغانی، ج۱، ص ۲۷۸؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۷، ص ۲۰٦؛ شیخ مفید، الارشاد، ص ۲۹؛ علی بن موسی بن طاوس، الطرائف فی معرفۃ مذاہب الطوائف، ج۱، ص ۲۰؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (انسان العیون)، ج۱، ص ٤٦۱؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۸، ص ۱۷۸؛ ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۱٤؛ علامہ امینی، الغدیر، ج۲، ص ۲۸۹ ـ ۲۷۸؛ سید مرتضی عسکری، نقش ائمہ در احیاء دین، ج۲، ص ۸٦؛ ج٦، ص ۱۸ ـ ۱۷؛ احمد حنبل، مسند، ج۱، ص ۱۵۹ ـ قابل ذکر ہےجیسا کہ مرحوم علامہ امینی نے توجہ دی ہے کہ مورخین کے درمیان طبری نے اپنی تاریخ میں اسی طرح سے نقل کیا ہے جیسا کہ ہم نے لکھا ہے۔ لیکن اپنی تفسیر (جامع البیان، ج۱۹، ص ۷۵) میں کلام پیغمبر ﷺ کو دو جگہ پر تحریف کر کے بجائے میرا وصی اور جانشین کے "ایسا اور ویسا" لفظ ذکر کیا ہے: فأیُّکم یؤازرنی علی ھذا الامر علی ان یکون اخی و کذا و کذا ثم قال ان ھذا اخی و کذا و کذا فأسمعوا لہ و اطیعوہ۔ اسماعیل بن کثیر شامی نے بھی اپنی تین کتابوں میں (تفسیر، ج۳، ص ۳۵۱، البدایہ و النہایہ، ج۳، ص ٤۰، السیرہ النبویہ، ج۱، ص ٤۵۹)، میں اس غلط روش میں اس کی پیروی کی ہے! البتہ ان دو افراد کے خاص نظریات کی بنا پر اس مسئلہ میں ان کے مقاصد کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

سالوں میں اپنی نبوت کے اعلان کے دن، مسلمانوں کی آئندہ رہبری اور امامت کو بھی بیان کیا۔

دوسری طرف سے یہ تصور نہ ہو کہ پیغمبر ﷺ نے صرف ایک بار وہ بھی "غدیر خم" میں (اپنی زندگی کے آخری مہینے میں) علی کی امامت کو بیان کیا ہے۔ بلکہ دعوت ذو العشیرہ کے علاوہ بھی دوسری مناسبتوں سے (جیسے حدیث منزلت میں) بھی اس موضوع کو ذکر فرمایا ہے: البتہ غدیر میں سب سے زیادہ واضح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جہاں مجمع بھی بہت زیادہ تھا۔

سوروں کی ترتیب نزول کے لحاظ سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ دعوت ذو العشیرہ کا واقعہ، دعوت ظاہری سے کچھ دن پہلے پیش آیا ہے۔[1]

---

(۱) سورۂ "شعرائ" جس میں آیات انذار موجود ہے سورۂ واقعہ کے بعد نازل ہوا ہے اور پھر ترتیب وار سورۂ "نمل، قصص، اسرائ، یونس، ھود، یوسف" اور "سورۂ حجر" جس میں علنی دعوت کا حکم "فاصدع بما تؤمر" موجود ہے نازل ہوا ہے (محمد ہادی معرفت، التمہید فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۰۵)

دوسری فصل

علی الاعلان تبلیغ اور مخالفتوں کا آغاز

ظاہری تبلیغ کا آغاز

پیغمبر اسلا ﷺ م ایک عرصہ سے مخفی دعوت کا آغاز کرچکے تھے اس کے بعد خداوند عالم کی طرف سے آپ کو حکم ملا کہ اپنی دعوت کو علی الاعلان پیش کیجئے اور مشرکین سے نہ ڈریئے۔ "پس آپ اس بات کا واضع اعلان کردیں جس کا حکم دیا گیا ہے اور مشرکین سے کنارہ کش ہو جائیں ہم ان استہزاء کرنے والوں کے لئے کافی ہیں"۔[(۱)]

یہ فرمان ملنے پر ایک دن پیغمبر اسلا ﷺ م مقام "ابطح"[(۲)] میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: "میں خدا کی جانب سے بھیجا گیا ہوں تم کو خدائے یکتا کی عبادت اور بتوں کی عبادت ترک کرنے کی دعوت دیتا

---

(۱) سورۂ حجر، آیت ۹۵.

(۲) ابطح سے مراد، منیٰ کے نزدیک ایک درہ ہے (یاقوت حموی، معجم البلدان، ج ۱، ص ۷٤) گویا حج کے وقت منی میں حاجیوں کے اجتماع کے موقع پر فرمایا ہے۔

ہوں جو کہ نہ تمہیں نفع پہنچاتے ہیں اور نہ نقصان، نہ تمہارے خالق ہیں اور نہ ہی رازق، اور نہ کسی کو زندہ کرتے ہیں اور نہ کسی کو مارتے ہیں"۔[۱]

اس دن سے پیغمبر ﷺ کی دعوت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوگئی اور آپ نے اجتماعی پروگراموں ہیںؐچ کے دوران، منیٰ اور اطراف مکہ میں رہنے والے قبائل کے درمیان دعوت و تبلیغ، شروع کردی۔

قریش کی کوششیں

پیغمبر اسلا ﷺ م کے ظاہری تبلیغ کے آغاز میں، قریش نے کوئی خاص عکس العمل (ریکشن) نہیںدکھایا؛ لیکن جس دن سے پیغمبر ﷺ نے ان کے بتوں کا کھلے الفاظ میں سختی سے انکار کیا اور بتوں کو ایک بے شعور اور بے اثر؛ موجود بتایا، ان کو طیش آگیا اور وہ پیغمبر ﷺ کی مخالفت اور ان کے خلاف گروپ بازی پر کمر بستہ ہوگئے۔[۲] لیکن چونکہ مکہ میں قبیلہ جاتی نظام پایا جاتا تھا لہٰذا محمد ﷺ کو گزند پہنچانے پر انھیں قبیلۂ بنی ہاشم کے انتقام کا خطرہ لاحق تھا لہٰذا وہ قریش کے سرکردہ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پرپہنچے کہ محمد ﷺ کودعوت سے روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ابو طالب پر جو کہ اس کے چچا ہیں اور ان کی نظر میں محمد ﷺ کا بڑا احترام ہے ،دباؤ ڈالیں تاکہ وہ اپنے بھتیجے کو اس راہ پر چلنے سے منع کریں۔ لہٰذا وہ لوگ کئی بار جناب ابوطالب سے اس خیال سے ملے کہ وہ (ابوطالب) حسب و نسب اور سن کے لحاظ سے

---

(۱) تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۱۹۔ پیغمبر اسلا ﷺ م کی پہلی ظاہری دعوت مختلف صورتوں میں نقل ہوئی ہے۔ اور شاید آنحضرت ﷺ نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بت پرستوں کو اس طرح کے بیانات سے دعوت دی ہے۔ مراجعہ کریں: یعقوبی، سابق، ص ۱۹؛ طبری ، سابق، ج ۲، ص ۲۱۶؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج ۱، ص ۱۲۱؛ بیہقی، سابق، ج ۱، ص ۲۷۹؛ طبری ، اعلام الوریٰ ، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط ۳) ص ۳۹؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۱۸۵؛ حلبی، سابق، ج ۱، ص ٤٦١.

(۲) طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۱۸؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج ۱، ص ۲۸۲؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۹۹؛ ابناثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ٦۳۔

سماج میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور ان سے کہا کہ وہ اپنے بھتیجے کو منع کریں کہ وہ ان کے خداؤوں کو برا بھلا" اور ان کے دین و آئین کو بیکار؛ اور ان کو بیوقوف اور ان کے آباء و اجداد کو گمراہ کہنے سے باز آجائے۔

وہ لوگ ان ملاقاتوں میں کبھی دھمکی کے ذریعہ اور کبھی مال و ثروت او رریاست کی لالچ دے کر ان سے مطالبہ کرتے تھے اور جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو ابوطالب سے پیش کش کی کہ اس کو (محمد ﷺ) عمارہ بن ولید بن مغیرہ سے جو کہ ایک خوبصورت اور طاقت ور جوان، اور قریش کا شاعر ہے بدل لیں۔ لیکن ابوطالب نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ ایک مرتبہ کفار قریش نے جناب ابوطالب اور پیغمبر اسلا ﷺ م کو جنگ اور قتل کی سخت دھمکی دی تو آنحضرت ﷺ نے ان کی دھمکی کے جواب میں فرمایا: "چچا جان! اگر سورج کو ہمارے داہنے ہاتھ پر اور چاند کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں پھر بھی میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ خداوند اس کام کو کامیابی سے ہمکنار کردے یا میں اس راہ میں نابود ہوجاؤں۔ [1]

---

(۱) طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۰۰۔ ۲۱۸؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۲۸۷۔ ۲۸۲ اور ۳۱۳، ۳۱۶؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۸۲؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۰۳۔ ۲۰۲؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳۲۔ ۲۳۱؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۶۵۔ ۶۳؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۴۶۳۔ ۴۶۲؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ عیسی البابی الحلبی، ۱۳۸۳ھ.ق)، ج ۱، ص ۴۷۴۔

اس نقل کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ کا سورج اور چاند سے جواب دینا قریش کی دھمکی سے ظاہراً مناسبت نہیں رکھتا تھا اور اس کے سند میں بھی بحث ہوئی ہے لیکن جو جواب بعض کتابوں میں نقل ہوا ہے وہ قریش کی دھمکی سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس نقل کی بنیاد پر رسول خدا ﷺ نے اپنے چچا سے قریش کے دھمکی آمیز پیغام کو سننے کے بعد آسمان کی طرف رخ کرکے فرمایا: "میرے لئے تبلیغ اور رسالت کا چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تم میں سے کوئی ہاتھ پھیلائے اور چاہے کہ خورشید کا ایک شعلہ اپنے ہاتھ میں لے لے" اس وقت جناب ابوطالب نے قریش کے نمائندوں سے کہا: خدا کی قسم! میرے بھتیجے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ تم لوگ یہاں سے پلٹ جاؤ!" (حافظ نور الدین ھیثمی، مجمع الزوائد، بیروت: دار الکتاب، ج۶، ص ۱۵؛ معجم اوسط، کبیر طبرانی اور مسند ابی یعلی کے نقل کے مطابق) ھیثمی نے روایت ابویعلی کی سند کو صحیح بتایا ہے اور مزید رجوع کریں۔ فقہ السیرۃ کی طرف۔ محمد غزالی، عالم المعرفہ، ص ۱۱۵۔ ۱۱۴.

ابوطالب کی طرف سے حمایت کا اعلان

قریش کی دھمکیوں پر جناب ابوطالب نے (رشتہ داری کے ناتے) پیغمبر اسلام ﷺ کی حمایت کا اعلان کیا اور قبیلۂ بنی ہاشم کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان رہے ہوں یا بت پرست سب کو اسی کام کے لئے آمادہ کیا اور قریش کو خبردار کیا کہ اگر ان کے بھتیجے کو گزند پہنچا تو بنی ہاشم کے انتقام سے وہ بچ نہیں سکتے ہیں۔[1] کیونکہ قبائلی جنگ ایک خطرناک کام تھا اور اس کے نتائج افسوس ناک اور غیر مشخص تھے اور قریش کے سردار ابھی اس قسم کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لہٰذا وہ اپنی اس دھمکی کو پورا نہیں کرسکے اور ناکام رہے۔ بنی ہاشم میں سے صرف ابولہب، دشمنوں کی صف میں تھا۔

قریش کی طرف سے مخالفت کے اسباب

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قریش نے پیغمبر اسلا ﷺ م کی ظاہری دعوت کے ابتدائی سالوں میں جبکہ اس وقت اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے احکام ابھی تھوڑے سے نازل ہوئے تھے، کن خطرات کا احساس کرلیا تھا کہ مخالفت کے لئے کمر بستہ ہوگئے تھے؟

کیا ان کی مخالفت فقط اس بنا پر تھی کہ وہ بت پرست تھے یا دوسرے اسباب و علل بھی پائے جاتے تھے۔ (البتہ یہ گفتگو قریش کے سرداروں اور ان کے بزرگوں کے جذبات کے بارے میں ہے، لیکن عوام الناس اپنے قبائل کے سرداروں کی پیروی میں تھے۔ ان کے احساسات اور جذبات کو ابھارنا اور ان کو ایک نئے دین کے خلاف ورغلانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے عقائد و

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص۲۸۷؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص۲۲۰؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج۱، ص۵۹؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ص ٦٥؛ ابن کثیر، گزشتہ حوالہ، ص ٤٧٧؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٦٣۔

آداب و رسوم کے اس قدر پابند تھے کہ کسی بھی جدید دین کے مقابلہ میں عکس العمل دکھا سکتے تھے۔(۱)

مکہ میں قریش کی قدرت ، نفوذ اور ان کے اعلیٰ مقام کو دیکھتے ہوئے شاید ان کی مخالفت کو سمجھنا دشوار نہ تھا اس لئے کہ تجارت اور خانہ کعبہ کی کنجی کی ذمہ داری کی بحث میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ یہ قبیلہ مکہ کی اجتماعی اور اقتصادی قدرت کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا اور اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کرتا تھا اور کسی کو اجازت نہیں دیتا تھا کہ بغیر اس کی یا اس کے قبیلہ کی مرضی کے کوئی قدم اٹھا سکے۔ قریش دوسرے قبائل سیخراجلیتے تھے اوران کے ساتھ دوگانہ سلوک کرتے تھے۔ اور اپنی سیاست خانۂ خدا کے زائروں پر تھوپتے تھے۔

اس بنا پر یہ فطری بات تھی کہ بزرگان قریش، حضرت محمد ﷺ کے دین کو برداشت نہ کریں؛ کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کے ابتدائی بیانات سے سمجھ گئے تھے کہ اس کا دین ہمارے دین کے برخلاف اور ضد ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر ﷺ کو یہ پیش بینی کردی گئی تھی کہ بہرحال ایک گروہ، آپ کے دین کو قبول کرے گا اور آپ کو اس کے ذریعہ شہرت ملے گی۔ لہذا یہ چیزیں ہرگز قریش کی شان کے مطابق نہ تھیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر مکہ میں نازل ابتدائی آیات اور سوروں اور تمام دستاویز اور شواہد کے تجزیہ و تحلیل سے قریش کی مخالفت کے اسباب و عوامل میں سے چند اہم اسباب کو شمار کیا جاسکتا ہے:

---

(۱) خداوند عالم نے قرآن مجید میں، متعدد مقامات پر ان کے دینی تعصب؛اور موروثی عقائد اور رسم و رواج کی تقلید کے بارے میں ذکر فرمایا ہے اور اس کی مذمت کی ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں: سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۰ ، مائدہ، آیت ۱۰٤ ؛یونس، آیت ۷۸؛ لقمان ، آیت ۲۱ ؛ زخرف ، آیت ۳۲۔ ۲۲.

۱۔ سماجی نظام کے بکھرنے کا خوف

مکہ میں رائج سماجی نظام کے قبائلی ہونے کے اعتبار سے، اور قریش کے پاس بہت ہی زیادہ امتیازات ہونے کی بنا پر ایک طرح سے وہاں قریش کی استکباری حکومت پائی جاتی تھی اور سرداران قریش اس نظام کے عادی ہوگئے تھے لہٰذا وہ کسی طرح سے تیار نہیں تھے کہ ایک معمولی سی ضرب بھی اس نظام کے ڈھانچہ پر لگے!

یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت محمد ﷺ کی پیروی کرنے والا پہلا گروہ جوانوں، ضعیفوں، محروموں اور غلاموں کا تھا۔ اور خود آنحضرت ﷺ بھی سرمایہ داروں میں سے نہیں تھے بلکہ بچپن میں یتیم، جوانی میں نادار اور تہی دست اور قبیلہ کے اندر آپ کا شمار دوسرے درجہ کے افراد میں ہوتا تھا۔ آپ کے چچا ابو طالب بھی تمام خاندانی شرافتوں کے باوجود تنگدست تھے اور یہ تمام چیزیں سرداران قریش کو خبردار کر رہی تھیں کہ حضرت محمد ﷺ کی دعوت تبلیغ نے ان کے نظام اجتماعی کی بنیادوں کو خطرہ میں ڈال دیا اور ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ وہ لوگ، تبلیغ کے انھیں ابتدائی دنوں سے جوانوں، محروموں اور غلاموں کے رجحانات کا شکوہ کرتے تھے۔ اور حبشہ سے مہاجرین کو پلٹانے کے لئے قریش کے نمائندوں نے نجاشی کے دربار میں اپنے آپ کو مکہ کے سرمایہ داروں کا نمائندہ بتایا۔[۱]

قرآن ان کے اس استکبارانہ نظریات پر معترض ہوا (کیونکہ مکہ یا طائف کا کوئی ثروتمند پیغمبری کے درجے پر فائز نہیں ہوا تھا) اوراس کو اس طرح سے بیان کیا: "اور یہ کہنے لگے کہ آخر یہ قرآن دو بستیوں (مکہ و طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا ہے"۔[۲]

ایک تفسیر کی بنیاد پر مرد بزرگ سے مراد مکہ میں ولید بن مغیرہ (بنی مخزوم کا سردار) اور طائف میں عروہ بن مسعود ثقفی (مشہور دولتمند) ہے۔[۳] اس آیت کی شان نزول کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ایک دن ولید نے کہا: کس طرح سے یہ قرآن محمد ﷺ پر نازل ہوا؟ اور مجھ پر نازل نہ ہوا؟ جبکہ میں

---

(۱) وقد بعثنا فيهم اشراف قومهم۔ (ابن ہشام، السیرة النبویہ، ج ۱، ص ۳۵۸.

(۲) "و قالوا لولا نزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم" (سورۂ زخرف، آیت ۳۱)

(۳) طبرسی، مجمع البیان، ج ۹، ص ٤٦.

قریش کا سید و سردار ہوں!"[۱] لہٰذا ابتدا میں قریش حضرت محمد ﷺ کی دعوت سے اس لئے مخالف ہوگئے کہ وہ ان کے اجتماعی نظام کے لئے خطرہ بن گئے تھے نہ اس لحاظ سے کہ انھوں نے ایک نیا آئین پیش کیا تھا۔

اقتصادی خوف

بعض معاصر محققین نے قریش کی مخالفت کا ایک قوی سبب اقتصادی مقاصد کو قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی مکی آیات کا ایک حصہ ثروتمندوں اور مالداروں کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔ مکہ کے بڑے سرمایہ داروں اور دولتمندوں نے (جیسا کہ تجارت اور کعبہ کی کنجی کی بحث میں، بعض افراد کی بے شمار دولت سے آگاہ ہوچکے ہیں) ان آیات کو سن کر، خطرے کا احساس کیا کہ محمد ﷺ کے دین کو ترقی ملنے پر، ان کے اقتصادی منافع خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس طرح کی کچھ آیات بطور نمہ پیش ہیں:

"اب مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دو جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا ہے۔ اور اس کے لئے کثیر مال قرار دیا ہے۔ او رنگاہ کے سامنے رہنے والے بیٹے قرار دئے ہیں ۔ اور ہر طرح کے سامان میں وسعت دی ہے اور پھر بھی چاہتا ہے کہ او راضافہ کروں۔ ہرگز نہیں یہ ہماری نشانیوں کا سخت دشمن تھا"۔[۲]

"ہم عنقریب اسے جہنم واصل کردیں گے۔ اور تم کیا جانو کہ جہنم کیاہے۔ وہ کسی کو چھوڑنے والا اور باقی رکھنے والا نہیں ہے۔ بدن کو جلا کر سیاہ کردینے والا ہے"۔[۳]

---

(۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۱، ص ۳۸۷؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ۱، ص ۵۰۔

(۲) سورۂ مدثر، آیت ۱۱۔ ۱۶۔

(۳)"سأصليه سقر،ومادريک ما سقر،لاتبق ولاتذر،لواحة للبشر" (سورۂ مدثر، آیت ۲۶۔ ۲۹)، سورۂ مدثر کو سوروں کی ترتیب نزول کے اعتبار سے چوتھا سورہ کہا گیا ہے۔ (التمہید، ج ۱، ص ۱۰۴)

"ابو لهب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو جائے۔ نہ اس کا مال ہی اس کے کام آیا اور نہ اس کا کمایا ہوا سامان ہی۔ وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا"۔[۱]

"تباہی اور بربادی ہے ہر طعنہ زن اور چغلخور کے لئے۔ جس نے مال کو جمع کیا اور خوب اس کا حساب رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔ ہرگز نہیں اسے یقینا حطمہ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ حطمہ کیا شے ہے۔ یہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ جو دلوں تک چڑھ جائے گی"۔[۲]

"پھر جس نے خدا کی راہ میں مال عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا۔ اور نیکی کی تصدیق کی۔ تو اس کے لئے ہم آسان راہ کا انتظام کردیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور لاپرواہی برتی۔ اور نیکی کو جھٹلایا ہے۔ اس کے لئے سختی کی راہ ہموار کردیں گے۔ اور اس کا مال کچھ کام نہ آئے گا جب وہ ہلاک ہو جائے گا"۔[۳]

ان آیات میں غور و غوض کرنے سے اور ان کی شان نزول کے بارے میں تحقیق کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیات ان کی مخالفت کے اظہار کے بعد نازل ہوئی ہیں (اور ان کی ابتدائی مخالفت کی علت نہیں تھیں) اور شاید مخالفت اور دشمنی میں شدت پیدا کرنے کے لئے اور مخالفین کی تعداد کے بڑھنے میں مؤثر تھیں۔

بہر حال، مکہ کے بڑے سرمایہ دار اور تاجر حضرت کے اصل مخالفین میں تھے۔

---

(۱) "تبَّت یدا ابی لهب و تب، ما اغنی عنه ماله و ماکسب، سیصلی ناراً ذات لهب"۔ (سورۂ مسد، آیت ۳۔ ۱) سورۂ مسد کو سوروں کی ترتیب نزول کے اعتبار سے چھٹا سورہ کہا گیا ہے۔ (التمہید ، ج ۱، ص ۱۰٤)

(۲) سورۂ همزة، آیت ۷۔ ۱۔

(۳) "فأما من اعطیٰ و اتقی و صدق بالحسنیٰ، فسنیسره للیسری، و اما من بخل و استغنیٰ و کذب بالحسنیٰ فسنیسره للعسری و مایغنی عنه ماله اذا تردیٰ"

(سورۂ لیل، آیت ۱۱۔ ۵) اس سورہ کو ترتیب نزول کے اعتبار سے نواں سورہ کہا گیا ہے۔ (التمہید، ج ۱، ص ۱۰٤)

ایک مورخ کہتا ہے: "چونکہ رسول خدا ﷺ اپنی قوم کو راہ راست اور اس نور کی طرف بلا رہے تھے جو ان پر نازل ہوا تھا لہٰذا دعوت کے آغاز میں وہ آپ سے دور نہیں ہوئے اور قریب تھا کہ وہ آپ کی باتوں کو قبول کرلیں۔ اسی اثنا میں آپ نے ان کے طاغوتوں اور خداؤں کو برا بھلا کہنا شروع کردیا اور قریش کا ایک ثروتمند اور مالدار گروہ طائف سے آیا[1] اور آپ کی باتوں کو ناپسند کیا اور قبول کرنے سے انکار کردیا اور آپ کے ساتھ بری طرح سے لڑنے کے لئے کھڑا ہوگیا اور اپنے چاہنے والوں کو آپ کے خلاف ورغلایا اس وقت کچھ لوگ آپ سے کنارہ کش ہوگئے اور آپ کو چھوڑ دیا۔[2]

---

(۱) گویا ان لوگوں نے اپنا سرمایہ طائف میں لگا رکھا تھا اور مکہ کے علاوہ وہاں پر بھی تجارت کا ایک مرکز بنا رکھا تھا۔

(۲) طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دارالقاموس الحدیث)، ج ۲، ص ۲۲۱؛ جو لوگ انسانی زندگی اور سماج کی تبدیلیوں کو صرف مادی نظر سے دیکھتے ہیں وہ اسلام سے قریش کی مخالفت کا سبب، اقتصادی مقاصد کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ درحقیقت مسئلے کے صرف ایک پہلو کو نظر میں رکھتے ہیں۔ پطروشف کی (جو کہ روس کا مشہور اسلام اور ایران شناس اور رلیننگراڈیونیورسٹی کے شرق شناسی کالج کا پروفیسر ہے، کو اس قسم کے مسئلہ میں قضاوت اور تفکر کا ایک نمونہ سمجھا جاسکتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "... بزرگان مکہ، رباخور اور غلاموں کی تجارت کرتے تے اور کھلم کھلا محمد ﷺ کی تبلیغات کی مخالفت کرتے تھے یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس دشمنی کا سبب دینی تعصب تھا بلکہ بت پرستی کے خلاف محمد ﷺ کی تبلیغات مکہ کے تاجروں کے سیاسی اور تجارتی منافع کے لئے خطرہ بن گئی تھیں، کیونکہ آپ کی دعوت سے ممکن تھا کہ کعبہ اور بتوں کی پرستش ختم ہو جائے اور یہ نہ تنہا زوار کے ہجوم کو کم کرے گا بلکہ مکہ کے بازار کو بھی ماند اور اس شہر کے تجارتی معاملات کو دوسرے علاقوں سے بھی کم کردے گا بلکہ مکہ کے سیاسی نفوذ کے ختم ہونے کا باعث بنے گا۔ یہی وجہ تھی کہ صنادید مکہ محمد ﷺ کی دعوت کو اپنے منافع کے لحاظ بہت زیادہ خطرناک سمجھ رہے تھے اور آپ سے نفرت کرتے تھے (اسلام در ایران، ترجمۂ کریم کشاورزی، ج ۷، تہران: انشارات پیام، ۱۳۶۳، ص ۲۶)، متن میں جو وضاحت ہم نے کی ہے اس سے پطروشفتکی کے نظریہ کا بے بنیاد ہونا ثابت ہو جاتا ہے اور مزید توضیح کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

پڑوسی طاقتوں کا خوف وہراس

قرآن مجید نے ان کے خوف وہراس کے اظہارات کو نقل کیا ہے جو انھیں پڑوسی ملکوں اور طاقتوں سے اسلام قبول کرنے کی صورت میں لاحق تھا۔ اور اس خوف وہراس کو بے جا قرار دیا ہے۔

"اور کفار کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ حق کی پیروی کریں گے تو اپنی زمین سے اچک لئے جائیں گے۔ تو کیا ہم نے انھیں ایک محفوظ حرم پر قبضہ نہیں دیا ہے جس کی طرف ہر شے کے پھل ہماری دی ہوئے روزی کی بنا پر چلے آرہے ہیں لیکن ان کی اکثریت سمجھتی ہی نہیں ہے"۔[۱]

ایک دن حارث بن نوفل بن عبد مناف نے پیغمبر اسلام ﷺ سے کہا: "ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں اور آپ کے ہم عقیدہ ہو جائیں تو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں عرب ہمیں اپنی سرزمین سے نکال نہ دیں اور ہم عرب سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں"۔[۲]

ان کے اظہارات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں ایران و روم کے شہنشاہوں[۳] کی ناراضگی کا خوف بھی تھا۔ اور یہ چیز پڑوسی ملکوں کے مقابلہ میں عربوں کی حقارت اور کمزوری کی علامت بھی ہے۔ جیسا کہ ایک دن پیغمبر اسلا ﷺ م نے عرب کے چند بڑے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن کریم کی کچھ آیات کو جو فطری اور اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھیں ان کے لئے تلاوت فرمائی؛ تو وہ سب کے سب بے حد متاثر ہوئے اور ہر ایک نے اپنے طور پر آپ کی تحسین و تعریف کی لیکن مثنی بن حارثہ جو، ان کا رأس رئیس اور اصل سرغنہ تھا اس نے کہا: "ہم دو پانی کے بیچ بسے ہوئے ہیں ایک طرف سے عرب کا دریا اور ساحلی علاقہ اور دوسری طرف سے ایران اور کسریٰ کی نہریں ہم کو گھیرے ہوئے ہیں، کسریٰ نے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ کوئی نئی بات نہ ہونے پائے اور کسی خطاکار کو پناہ نہ دی جائے۔

---

[۱] سورۂ قصص، آیت ۵۷۔

[۲] طبرسی، مجمع البیان، ج ۷، ص ۲۶۰؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج ۱، ص ۵۱۔

[۳] مناقب، ج ۱، ص ۵۹۔

لہذا شاید آپ کے آئین کو قبول کرنا شہنشاہوں کیلئے خوش آئند نہ ہو۔ اور اگر ہم سے ، سرزمین عرب میں کوئی غلطی ہو جائے تو وہ قابل چشم پوشی ہے لیکن اس طرح کی غلطیاں ایران کے علاقے میں (کسری کی طرف سے) قابل عفو و بخشش نہیں ہیں۔[1]

قبیلہ جاتی رقابت اور حسد

قبائلی ڈھانچے کا ایک اثر یہ ہوا کہ اہم موضوعات پر رقابت اور بے حد فخر و مباہات شروع ہوگئے جس کی وجہ سے اس قبائلی سماج میں ناانصافی ہونا شروع ہوگئی اور چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ قبیلۂ بنی ہاشم سے تھے لہذا سارے سرداران قبائل رقابت اور قبائلی حسد کے جذبہ کے تحت آپ کی نبوت کو (جوکہ بنی ہاشم کی شرافت اور فخر و مباہات کا باعث تھی) قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ابوجہل قبیلۂ بنی مخزوم سے تھا، جوکہ قبائل قریش میں سے ثروتمندترین اور پرنفوذ ترین قبیلہ تھا اس نے اس بات کو کھل کر بیان کیا:

"ہم نے عبد مناف کے لڑکوں سے شرف و بزرگی کی خاطر جنگ کی، وہ لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے لہذا ہم نے بھی لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کردیا وہ لوگوں کے لئے سواری کا انتظام کرتے تھے۔ لہذا ہم نے بھی ایسا کیا وہ لوگوں کو پیسہ دیتے تھے تو ہم نے بھی ایسا کیا۔ یہاں تک ہم دونوں برابر ہوگئے اور دو گھوڑوں کی طرح دونوں میں مسابقہ ہوا اس وقت وہ کہنے لگے کہ ہم میں سے ایک پیغمبر ﷺ کے درجہ پر فائز ہوا جس کے اوپر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے لہذا اب ہم کس طرح سے اس مرتبہ میں ا س کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس پر ایمان نہ لائیں گے او رنہ ہی اس کی تصدیق کریں گے"!۔[2]

---

(۱) محمد ابوالفضل ابراہیم (اور ان کے معاونین)، قصص العرب (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۸۲ھ.ق)، ج۲، ص ۲۵۸؛ ابن کثیر، الدایہ و النہایہ (بیروت: مطبعۃ المعارف، ط۲، ۱۹۷۷ئ)، ج۳، ص ۱۴۴۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۳۷؛ ابن شہر آشوب، ج۱، ص ۵۰؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، تحقیق: مصطفی عبد الواحد (قاہرہ: ۱۳۸۴ھ.ق)، ج۱، ص ۵۰۷۔ ۵۰۶۔

امیہ بن ابوالصلت ، جو کہ طائف کا بہت بڑا شاعر اور رئیس تھا اور پہلے حنفاء میں رہتا تھا۔(۱) اور اسی جذبہ کے تحت اس نے اسلام کو قبول نہیں کیا کہ وہ برسوں سے پیغمبر موعود کے انتظار میں تھا لیکن وہ خود ایک حدتک امید لگائے بیٹھا ہوا تھا کہ اس درجہ پر فائز ہوگا۔ لہٰذا اس نے جیسے ہی پیغمبر اسلام ﷺ کے بعثت کی خبر سنی ، آپ کی پیروی سے کنارہ کش ہوگیا اور اس کی وجہ اس نے زنان ثقیف سے حیاء و شرم بتائی اور کہا: "مدتوں سے ہم نے ان سے کہا تھا کہ ہم پیغمبر موعود بنیں گے اب کس طرح سے یہ برداشت کریں کہ وہ ہم کو عبد مناف کے ایک جوان کا پیرو دیکھیں"۔(۲)

---

(۱) مراجعہ کریں: اس کتاب کے باب "جزیرۃ العرب اور اس کے اطراف میں ادیان و مذاہب" میں (حنفا).

(۲) ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، ج۱، ص ۱۳۰.

تیسری فصل

قریش کی مخالفت کے نتائج اور ان کے اقدامات

مسلمانوں پر ظلم و تشدد

مسلمانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ جناب ابوطالب سے قریش کی گفتگو کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بنی ہاشم پیغمبر اسلا ﷺ م کی حمایت کے لئے کھڑے ہوگئے تو وہ پیغمبر ﷺ کو جانی نقصان پہنچانے سے ناتواں ہوگئے اور مسلمانوں کو نئی نئی اذیتیں اور سزائیں دینا شروع کردیں تاکہ اس طرح سے انھیں اسلام کی طرف جانے سے منع کردیں گے۔[۱]

قریش کے لئے مشکل یہ تھی کہ نو مسلم افراد صرف ایک دو قبیلہ سے نہیں تھے جن کو آسانی سے روکا جاسکتا ہے بلکہ ہر قبیلہ سے چند افراد اس نئے دین کو اپنائے ہوئے تھے۔ مشرکین مکہ کے آزار و اذیت سے تنگ آکر جن مسلمانوں نے ۵ ھ میں حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی ان کی فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں اور مرد مختلف قبائل (جیسے بنی عبد شمس، بنی اسد، بنی عبد الدار، بنی زہرہ، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی عدی، بنی حارث، بنی عامر اور نبی امیہ) سے مسلمان ہوئے تھے۔

---

(۱) طبری، تاریخ الامم والملوک، (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۲، ص۲۲۱۔

اس بنا پر مشرکوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہر قبیلہ، اپنے مسلمانوں کو سزائیں دے تاکہ دوسرے قبائل کے افراد کے مداخلہ کرنے سے ان میں تعصب نہ پیدا ہو اور وہ کوئی عکس العمل نہ دکھائیں۔

زیادہ تر تکلیفیں اور سزائیں نو مسلم مستضعفوں کو دی جاتیں تھیں کہ جن کے بارے میں ہم نے بتایا ہے کہ وہ غلام، پردیسی اور بغیر کسی قبیلہ کی حمایت کے رہتے تھے۔[1] یاسر اور ان کے فرزند عمار، بلال بن رباح، خبّاب بن ارت، ابوفکیہ، عامر بن فُهَیرہ، صُہَیب بن سنان اور خواتین اور کنیزوں میں سُمَیّہ، ام عُبَیس، (یا اُم عُنَیس)، زِنّیرہ، لَبیبہ (یا لُبَنیہ) اور نَہدیہ؛ یہ وہ افراد تھے[2] جن کو مختلف مواقع پر بھوک اور پیاس، قید و بند، ضرب و شتم اور مکہ کے تپتے ہوئے ریگ زار پر لٹا کر شدید گرمی کے عالم میں سزائیں دی گئیں یا تپتے ہوئے صحرا میں آھنی زرہ پہنا کر یا ان کی گردنوں میں رسی باندھ کر بچوں کے ذریعہ پھرایا گیا۔

حبشہ کی طرف ہجرت

خود پیغمبر اسلا ﷺ م، جناب ابوطالب اور بنی ہاشم کی حمایت کے سایہ میں قریش کے جانی نقصان سے محفوظ تھے۔ لیکن اور دوسرے مسلمانوں کی بے پناہ اذیتوں اور سزاؤں کو دیکھ کر (ایک وقتی راہ حل اور امان کی خاطر) آپ نے ان کو سمجھایا کہ، ملک حبشہ ہجرت کرجائیں اور فرمایا کہ "وہاں کا بادشاہ انصاف پسند اور وہاں کی سرزمین سچی اور با امن ہے۔[3]

---

(۱) بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: ڈاکٹر محمد حمیداللہ (قاہرہ: دار المعارف، ط۳)، ج۱، ص۱۹۷؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص۶۶۔

(۲) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۱۹۶۔ ۱۵۶؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۷۰۔ ۶۶۔

(۳) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۱، ص۳۴۴؛ تاریخ الامم والملوک، ج۲، ص۲۲۲؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۷۶۔

اس زمانہ میں صرف حبشہ مسلمانوں کے ہجرت کے لئے مناسب جگہ تھی ۔ ایران و روم یا اس کے زیر اثر دوسرے علاقے جیسے شام اوریمن ہر ایک کے لئے ممکن تھا کہ کسی نہ کسی وجہ سے (قریش کے ورغلانے یا اپنی سیاست کی بنا پر) مسلمانوں کو قبول نہ کریں یا ہجرت کے بعد ان کے لئے مشکلات اور پریشانیاں کھڑی کردیں۔ اس کے علاوہ حبشہ مسلمانوں کے لئے ایک جانی پہچانی جگہ تھی۔ کیونکہ اہل مکہ تجارت کی غرض سے وہاں آیا جایا کرتے تھے۔[۱]

اس کے علاوہ حبشہ کے لوگ مسیحی تھے۔ خدا پرستی کے عقیدہ میں وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حبشہ کے مسیحی "یعقوبی" فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور یہ فرقہ خدا کو اکیلی ماہیت (یک اقنوم) جانتا تھا اور تثلیث (یعنی تین خداؤں کا عقیدہ) نہیں رکھتا تھا اور اس لحاظ سے ان کا عقیدہ توحید اسلامی سے قریب تھا۔[۲]

بہرحال پیغمبر ﷺ کے کہنے پر بعثت کے پانچویں سال[۳]، مسلمانوں کا ایک ۱۵ نفری[٤] گروہ خفیہ طریقے سے مکہ چھوڑ کر، بندر شعیبہ کے راستے سے، بحر احمر کو عبور کرتا ہوا حبشہ پہنچا۔ یہ گروہ دو تین مہینے حبشہ میں رہنے کے بعد قریش کے اسلام لانے کی افواہ اور مسلمانوں پر سے اذیتوں او ردباؤ کے ختم ہونے کی خبر سن کر دوبارہ مکہ پلٹ آیا۔[٥]

---

(۱) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۱۔

(۲) عمر فروخ، تاریخ صدر الاسلام و الدولۃ الامویہ (بیروت: دار العلم، للملایین، ط ۳، ۱۹۷٦ئ)، ص ٥٤؛ ڈاکٹر عباس زریاب، سیرۂ رسول اللہ، تہران؛ سروش، ط ۱، ۱۳۷۰)، ص ۱٦۹۔

(۳) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۰٤؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج ۱، ص ۲۲۸؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ص ۷۷۔

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰٤؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۳٤٤؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۲۔ ۲۲۱۔

(٥) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۷۔

لیکن چونکہ زور و زبردستی اور سزائیں ویسے ہی برقرار تھیں لہٰذا پھر مسلمانوں کا ایک دوسرا گروہ اسی راستے سے حبشہ پہنچا۔ اس مرتبہ ان کی تعداد (عورت و مرد ملا کر) ایک سو ایک افراد پر مشتمل تھی(۱) اور ان کی سرپرستی جعفر ابن ابی طالب کے ذمہ تھی جب مہاجرین، حبشہ میں امن و سلامتی کے ساتھ رہنے لگے تو ایک مدت کے بعد قریش کو خطرے کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنا نمائندہ، نجاشی کے دربار میں بھیجا تاکہ وہ بادشاہ سے مطالبہ کرے کہ مہاجرین کو ان کے شہر واپس بھیج دیا جائے۔ ادھر جناب ابوطالب اس سازش سے آگاہ ہوگئے اور انھوں نے ایک خط نجاشی کے پاس لکھا اور اس سے مہاجرین کی حمایت کی درخواست کی۔(۲)

نجاشی کے دربار میں قریش کے نمائندوں کے دعوے کے بعد، جناب جعفر ابن ابی طالب نے مفصل طریقے سے سنجیدہ الفاظ میں موقع کے لحاظ سے گفتگو فرمائی۔ اور بہت اچھے انداز میں اپنے موقف کا دفاع کیا اور نجاشی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی نجاشی نے پناہ گزینوں کو قریش کے

---

(۱) ابن سعد، سابق، ص ۲۰۷۔ مہاجرین کی تعداد اس سے بھی کم لکھی گئی ہے لیکن مہاجرین کے ناموں کی تعداد جو کہ تاریخ میں درج ہے وہ پہلی تعداد کی تصدیق کرتی ہے۔ مراجعہ کریں: ابن ہشام، سابق، ص ۳۵۳۔ ۳۴۶؛ ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی، تاریخ، (انتشارات تہران یونیورسٹی، ط ۲، ۱۳۶۱)، ص ۱۳۲۔ ۱۲۲۔

(۲) ابن ہشام، سابق، ج ۱، ص ۳۵۷؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۴۱۸؛ نقل طبرسی کے مطابق جناب ابوطالب نے اپنے خط میں یہ اشعار لکھے تھے:

تعلم ملیک الحبش ان محمداً

نبی کموسی والمسیح بن مریم

اتی بالهدی مثل الذی اتیابه

و کل بأمر الله یهدی ویعصم

وانکم تتلونه فی کتابکم

یصدق حدیث لاحدیث مرجم

فلاتجعلوا لله ندّاً و اسلموا

فان طریق الحق لیس بمظلم

(اعلام الوریٰ، ص۴۵)

نمائندوں کے سپرد کرنے سے انکار کردیا اور ان کو اپنی حمایت میں رکھا۔[۱]

البتہ تمام مہاجرین کو سزائیں نہیں ملی تھیں ان میں سے کچھ طاقت ور قبیلے کے لوگ بھی تھے اور مشرکین کی مجال نہیں تھی کہ ان کو اذیتیں یا سزائیں دیتے۔ لیکن بہرحال مکہ کا ماحول بہت پرآشوب اور تکلیف دہ ہوگیا تھا اور شاید پیغمبر اسلا ﷺ م کا مقصد یہ بھی رہا ہو کہ مسلمانوں کو ایسے ماحول سے دور رکھ کر حبشہ میں اسلام کی حمایت اور اس کے دین کے مخالفوں کے خلاف ایک مرکز وجود میں آئے۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ حبشہ میں مہاجرین کا بسنا تبلیغی اثرات کے لحاظ سے خالی نہ تھا جیسے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اسلا ﷺ م سے روابط برقرار کئے۔[۲] گویا قریش نے اس اندیشے کے پیش نظر اپنے نمائندے کو بھیجا تھا۔ کچھ ایسے شواہد اور ثبوت ملتے ہیں کہ پیغمبر اسلا ﷺ م مسلسل مہاجرین کے حالات کی خبرگیری فرماتے تھے جیسا کہ بعض کے ارتداد اور عبد اللہ بن جحش (ایک مہاجر) کے مرنے کی خبر آپ کو ملی۔[۳]

اس مرتبہ حبشہ میں مہاجروں کا قیام زیادہ رہا اور اس عرصے میں گیارہ لوگ وہاں فوت ہوگئے، ۳۹۰، افراد رسول خدا ﷺ کی ہجرت سے پہلے مکہ پلٹ آئے، کچھ عورتیں اور ۲۶ مرد پیغمبر ﷺ کی ہجرت اور جنگ بدر کے بعد مدینہ پلٹ آئے اور آخری گروہ جعفر ابن ابی طالب کی سرپرستی میں ہجرت کے ساتویں سال واپس ہوا اور جنگ خیبر کے تمام ہو جانے کے بعد اس مقام پر پیغمبر اسلا ﷺ م کی خدمت میں پہنچا۔[٤]

---

(۱) طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٤۔ ٤٣؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص۳۶۰۔ ۳۵٦؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۸۱۔ ۷۹۔

(۲) بعض کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ حبشہ سے پلٹتے وقت جعفر ابن ابی طالب کے ہمراہ وہاں کے ستر افراد تھے۔ اور پیغمبر اسلا ﷺ م سے گفتگو کے بعد وہ سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ (مجمع البیان، ج۳، ص ۲۳٤)

(۳) ابن سعد، سابق، ص ۲۰۸

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۸، ص۹۷؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص۲۳۸؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبۃ المعارف، ط۱۹٦٦، ۱ئ)، ج٤، ص۱٤۳؛ آیتی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۲۔

حضرت فاطمہ زہرا * کی ولادت

شیعہ مورخین کے درمیان مشہور قول کی بنا پر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا بعثت کے پانچویں سال مکہ میں متولد ہوئیں۔[1] وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں اور آپ کی شریک حیات جناب خدیجہ کے بطن سے پیدا ہوئیں اور ہجرت کے بعد مدینہ میں ان کی شادی علی کے ساتھ ہوئی۔ شہزادی نے اسی کمسنی کے عالم میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مشرکوں سے جہاد کیا اور طاقت فرسا مشکلات کو برداشت کیا اور اس زمانہ کے مصائب و آلام کو ہمیشہ یاد رکھا۔

اسراء اور معراج

پیغمبر اسلا ﷺ م کا بطور اعجاز راتوں رات مکہ سے بیت المقدس کی طرف سفر کرنا (اسرائ) اور وہاں سے خداوند عالم کی قدرت کاملہ کے ذریعہ آسمانونکا سفر کرنا (معراج) کہلایا اور ان دونوں واقعات کو مکہ کے واقعات میں شامل کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں واقعات، مکی سوروں میں نقل ہوئے ہیں لیکن وقوع واقعہ کے سال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلا ﷺ م کے ان دونوں سفر کا مقصد یہ تھا کہ خداوند عالم کی عظمت کی نشانیوں کو اس وسیع و عریض کائنات اور آسمانوں میں آپ مشاہدہ کریں اور فرشتوں اور پیغمبروں کی روحوں سے ملاقات، بہشت و دوزخ کے اندر کا ماحول، اور اہل بہشت اور انکے درجات وغیرہ کا مشاہدہ فرمائیں جیسا کہ خداوند عالم نے سورۂ اسراء میں اس بات کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے۔

"پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصی تک لے

---

(۱) مجلسی، بحار الانوار، ج۴۳، ص۷ کے بعد۔ لیکن اہل سنت کے درمیان ان کی ولادت بعثت کے پانچ سال پہلے مشہور ہے۔ (سید جعفر شہدی، زندگی فاطمہ زہرا) (تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳۶۵، ط۷)، ص ۳۲۔ ۲۴۔

گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں بیشک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے"۔[۱]

پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس سفر میں جن مراحل کو طے کیا اس کو بیان کرنے کے بعد "معراج" کے بارے میں بھی فرمایا: "اس نے (پیغمبر ﷺ) اپنے پروردگار کی کچھ بڑی نشانیاں دیکھی ہیں"۔[۲]

ساتویں امام سے ایک شخص نے سوال کیا کہ جب خدا مکان نہیں رکھتا تو پیغمبر ﷺ کو آسمانوں پر کیوں لے گیا؛ تو آپ نے فرمایا: خداوند عالم زمان و مکان سے مبرا ہے اس نے چاہا کہ پیغمبر ﷺ کے ذریعے فرشتوں اور آسمانوں کے ساکنوں کو عزیز اور بزرگ قرار دے اور آپ ان کا مشاہدہ کریں اور یہ بھی چاہا کہ آپ کو اپنی عظمت کی نشانیوں کا نظارہ کرائے تاکہ آپ وہاں سے زمین پر آنے کے بعد لوگوں سے سارا ماجرا بیان کریں اور یہ فعل ہرگز اس معنی میں نہیں ہے جس کو فرقۂ مشبہ کہتے ہیں اور خداوند عالم، جسم، مادہ اور مکان سے منزہ ہے۔[۳]

روایات معراج کی تحلیل اور ان کا تجزیہ

پیغمبر اسلا ﷺ م کے آسمانی سفر کے بارے میں بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں جس کو طبرسی (مشہور و معروف مفسر) نے چار حصوں پر تقسیم کیا ہے:

۱۔ وہ روایات جو متواتر ہونے کی بنا پر قطعی اور مسلم ہیں جیسے اصل معراج۔

۲۔ وہ روایات جن میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہوا ہے جس کو قبول کرنا عقل کی رو سے قباحت نہیں

---

(۱) سورۂ اسرائ، آیت ۱۔

(۲) لقد رأى من آيات ربه الكبرى (سورۂ نجم، آیت ۱۸.)

(۳) بحرانی، تفسیر البرہان، (قم: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۳ھ)، ج۲، ص ۴۰۰.

رکھتا ہے اور جو کسی مسلّم دستور کے خلاف نہیں ہیں جیسے آسمانوں میں پیغمبر ﷺ کا سفر کرنا، پیغمبروں کی زیارت، بہشت و دوزخ وغیرہ کی زیارت۔

۳۔ ایسی حدیثیں جن کا ظاہر، ان مسلّم اصولوں کے خلاف نہیں ہے جو آیات یا اسلامی روایات سے ماخوذ ہیں لیکن اس کے باوجود وہ قابل تاویل و توجیہ ہیں اس طرح کی حدیثوں کی ایسی تاویل کرنا چاہیئے جو صحیح اعتقاد اور محکم دلیل کے موافق ہو جیسے وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے اہل بہشت کے ایک گروہ کو بہشت میں اور اہل دوزخ کے ایک گروہ کو دوزخ میں دیکھا ہے ان مناظر کے بارے میں کہا جائے کہ یہ ایک طرح سے بہشت اوردوزخ واقعی کی مثال اور صورت تھی۔

٤۔ ایسے مطالب جو ظاہراً قابل قبول نہیں ہیں اور قابل تاویل و توجیہ بھی نہیں ہیں۔ جیسے یہ کہ پیغمبر ﷺ نے اس سفر میں خدا کو چشم ظاہری سے دیکھا اور اس سے باتیں کیں اور تخت الٰہی پر اس کے بغل میں بیٹھے۔ اس طرح کی مطالب باطل اور بے بنیاد ہیں۔[1]

علمائے امامیہ کے عقیدہ کے مطابق پیغمبر اسلا ﷺ م کی معراج جسمانی تھی یعنی وہ اپنے "جسم" اور "روح" کے ساتھ سفر پر گئے تھے۔[2]

اسلامی روایات کی بنیاد پر روزانہ کی پنجگانہ نماز معراج کے سفر میں واجب ہوئی ہے۔[3] اگر

---

(۱) مجمع البیان، (تہران: شرکہ المعارف)، ج٦، ص ۳۹٥، تفسیر آیۂ سورۂ اسرائ.

(۲) مجلسی، سابق، ج۱۸، ص ۲۹۰؛ تفسیر نمونہ، ج۱۲، ص ۱۷ کے بعدآج کے علمی قوانین کے اعتبار سے واقعۂ معراج کا رونما ہونا ممکن ہے رجوع کیجئے: تفسیر نمونہ، ج۱۲، ص ۳۰۔ ۱۷؛ فروغ ابدیت ، ج۲، ص ۳۹٤.

(۳) کلینی، الفروع من الکافی، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ط۲، ۱۳٦۲)، ج۳، ص ٤۸۷۔ ٤۸۲؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۱، ص۲۱۳؛ صحیح بخاری، تحقیق: الشیخ قاسم الشماعی الرفاعی، (بیروت: دار القلم، ط۱، ۱٤۰۷ھ.ق)، ج٥، مناقب الانصار، باب ۱۰٤، ص۱۳٤۔ ۱۳۲؛ شیخ محمد بن حسن حر عاملی، وسایل الشیعہ، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط٤)، ج۳، کتاب الصلاة، ص۷، حدیث٥، ص۳٥، حدیث ۱٤، ص٦۰، حدیث٦؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۱۸، ص۳٤۸؛ سید ہاشم بحرانی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۹۳۳.

معراج سے قبل پیغمبر اسلا ﷺ م یا علی کو نماز پڑھتے دیکھا گیا یا ان سے نماز نقل ہوئی تو وہ نماز غیر واجب یا ایسی نماز تھی جو روزانہ کی پنجگانہ نماز کے شرائط اور خصوصیات کے مطابق نہیں تھی۔[۱]

بنی ہاشم کا سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ

جب قریش کے سرداروں کو جناب ابوطالب سے ملنے پر کوئی نتیجہ نہ نکلا اور حبشہ سے مہاجرین کے پلٹانے میں ناکام رہے اوردوسری طرف سے بڑی اور اہم شخصیتیں اسلام قبول کرنے لگیں اور مختلف قبائل سے اسلام کی پیروی کرنے والے افراد میں اضافہ ہونے لگا تو ناچار ہوکر یہ پلان بنایا کہ دباؤ کے نئے طریقوں کو اپنایا جائے اور وہ یہ کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خاندان کو اجتماعی اور اقتصادی طور پر دبائیں تاکہ رسول خدا ﷺ کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں اور ان کو ہمارے سپرد کردیں۔ اس مشورے کے بعد آپس میں ایک عہدنامہ لکھا گیا کہ بنی ہاشم سے نہ لڑکی لیں اور نہ ان کو لڑکی دیں اور نہ ہی ان سے خرید و فروخت او رمعاملہ کریں۔[۲]

اس سے قبل بیان کرچکے ہیں کہ مکہ کے لوگوں کا ذریعہ معاش صرف تجارت تھا اور اقتصاد و تجارت پر اختیار اور کنٹرول سارا قریش کا تھا۔ لہٰذا اگر وہ کسی شخص یا گروہ کا بائیکاٹ کردیتے تھے تو اس کا مطلب، اس کی مکمل محرومیت ہوتی تھی۔ اسی لئے ان کی نظر میں یہ بہت موثر حربہ تھا اور اس بات کی امید تھی کہ بنی ہاشم جلد ہی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔

شادی کا بائیکاٹ اور بنی ہاشم کے ساتھ قطع روابط، جس کا کہ بعض کتابوں میں قریش کے عہدنامہ

---

(۱) علامہ امینی، الغدیر، ج۳، ص۲۴۲۔

(۲) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۱، ص۳۷۵؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۲۲۵؛ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دارالمعارف، ط۳)، ج۱، ص۲۳٤.

کے ایک بند کے طور پر ذکر ہوا ہے[۱] زیادہ تر اجتماعی پہلو رکھتا تھا گویا وہ لوگ چاہتے تھے کہ بنی ہاشم اس لحاظ سے بھی سخت مشکلات اور دباؤ میں رہیں۔

اس عہدنامہ پر دستخط کے بعد جناب ابوطالب کے مشورے[۲] سے بنی ہاشم کے تمام افراد چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر[۳]، (سوائے ابولہب کے) "شعب ابوطالب[۴]" میں جمع ہوئے[۵] اور

---

(۱) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۳٤؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۰۹؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱٤، ص ۵۸.

(۲) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳۰؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ٦۳؛ ابن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: سہیل زکار (بیروت: دار الفکر، ط ۱، ۱۳۹۸ھ)، ص ۱۵۹؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۹، ص ۱۸.

(۳) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹٦۱ء)، ج ۱٤، ص ٦٤؛ فتال نیشاپوری، روضۃ الواعظین (بیروت: موسسۃ العلمی للمطبوعات، ط ۱، ۱٤۰٦ھ، ص ٦۳.

(٤) دو پہاڑوں کے بیچ کے درّہ اور شگاف کو "شعب" کہتے ہیں۔ "شعب ابوطالب" جو کہ بعد میں "ابویوسف" کے نام سے مشہور ہوا، عبد المطلب کی وجہ سے قرار پایا ہے۔ جب ان کی آنکھیں ضعیف ہوگئیں تو انھوں نے اس کو اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کردیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی اپنے والد بزرگوار جناب عبد اللہ کا حصہ ملا۔ اس درّہ میں بنی ہاشم کے گھر تھے (یاقوت حموی، معجم البلدان، ج۳، ص ۳٤۷) جدید تحقیقات کی روشنی میں شعب ابی طالب۔ بعض لوگوں کے تصور کے برخلاف، حجون میں جو کہ آج اہل مکہ کے درمیان "جنۃ المعلاۃ" کے نام سے اور ایرانیوں کے درمیان "قبرستان ابوطالب" کے نام سے معروف ہے، نہیں ہے۔ بلکہ مسجد الحرام کے قریب، صفا و مروہ پہاڑی کے بغل اور ابوقبیس پہاڑ کے شمالی حصہ میں واقع ہے۔ پیغمبر اسلا ﷺ م کی ولادت اور جناب خدیجہ کا گھر اسی درّہ میں تھا اور پیغمبر اسلا ﷺ م ہجرت کے وقت تک اسی درّہ میں رہتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے مدینہ ہجرت کرجانے کے بعد، عقیل ابن ابی طالب وہاں رہنے لگے اور ان کے بعد محمد بن یوسف ثقفی، (حجاج کے بھائی) نے اس کو عقیل کے لڑکوں سے خریدا اور اپنے گھر میں شامل کرلیا۔ گویا اس کے بعد اس کا نام شعب ابی یوسف پڑ گیا اور بعض قدیمی مورخ اس کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں، پیغمبر اسلا ﷺ م کی جائے ولادت اسی خاص جگہ پر ہے اور عبد العزیز کے زمانہ میں، مکہ کے میئر نے اسے لائبریری میں تبدیل کردیا اور ۱۳۹۹ھ میں عزہ سڑک کی توسیع میں اسے ختم کردیا گیا۔ (فصلنامۂ میقات حج، شمارہ ۳، ماہ بہار ۱۳۷۲، مقالہ سید علی قاضی عسکر، شعب ابی طالب کے بارے میں تحقیق، ص ۱۷۱۔ ۱٤۹.

(۵) پہلی محرم سات بعثت (ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۰۹).

تین سال(۱) تک جب تک بائیکاٹ جاری رہا) وہاں گزارے۔

اگر چہ قریش کا پیمان اجتماعی اور اقتصادی پہلو رکھتا تھا لیکن چونکہ قریش کو پیغمبر اسلا ﷺ م اور بنی ہاشم سے بہت زیادہ بغض و عناد تھا اور وہ اعلان کرچکے تھے کہ ہم میں اور بنی ہاشم میں حل کا واحد راستہ محمد ﷺ کا قتل ہے اسی وجہ سے جناب ابوطالب، حضرت رسول خدا ﷺ اور بنی ہاشم کی جان کے بارے میں بہت فکرمند تھے لہٰذا انھوں نے درّہ میں جا کر پناہ لی تاکہ ان کی حفاظت اور نگرانی کرنا آسان رہے۔ اور تاریخ میں بنی ہاشم کے مردوں کی تعداد چالیس افراد(۲) نقل ہوئی ہے جنھیں آپ نے شعب کی نگہبانی کے لئے مقرر کیا تھا اور آپ ہر شب پیغمبر ﷺ سے کہتے تھے کہ کچھ دیر استراحت کرنے کے بعد اپنی جگہ بدل دیں اور ان کی جگہ اپنے فرزند علی کو لٹادیتے تھے(۳) تاکہ اس طرح محمد ﷺ کی جان قریش کے حملہ اور سوء قصد سے محفوظ رہ سکے۔

اس دوران قریش نے شعب میں راشن غلہ کے پہنچنے میں رکاوٹ کھڑی کردی اور بنی ہاشم، ہر طرح کے لین دین سے محروم اور سخت مشکلات میں گرفتار ہوگئے صرف وہ محرم کے مہینہ میں (حج اور عمرہ کے موسم میں) آذوقہ کی فراہمی کے لئے شہر میں جاتے تھے۔(٤) اس وقت بھی، قریش مکہ کی طرف جانے والے تجارتی قافلوں کو خبردار کردیتے تھے کہ بنی ہاشم کو کوئی چیز فروخت نہ کریں ورنہ ان کے اموال غارت کردیئے جائیں گے۔(٥) اور اگر بنی ہاشم؛ قریش سے کوئی چیز خریدنا چاہتے

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۹؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳٤ ـ ۲۳۳؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲٥؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)؛ ج ۲، ص ۸۷؛ فتال نیشاپوری، گزشتہ حوالہ، ص ٦٤ ـ ٦۳.

(۲) ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ٦۳؛ طبرسی، اعلام الوری (تہران: دار الکتب الاسلامیہ: ط ۳)، ص ٤۹.

(۳) فتال نیشاپوری، روضۃ الواعظین، (بیروت: موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ط ۱، ۱٤۰٦ھ)، ص ٦۳؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص ٦٤؛ طبرسی گزشتہ حوالہ، ص ٥۰؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ۱٤، ص ٦٤؛ رجوع کریں: گزشتہ حوالہ، ص ۱٦۰.

(٤) ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص٦٥؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۹؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳٤؛ ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ٥۹.

(٥) طبرسی، گزشتہ حوالہ.

تھے تووہ اس کی قیمت بہت زیادہ بتاتے تھے تاکہ وہ خرید نہ سکیں۔[۱]

بعض اوقات ابو العاص بن ربیع[۲] اور کبھی حکیم بن حزام[۳] قریش کی نظروں سے بچا کر شعب کے اندر غلہ اور راشن پہنچاتے تھے بنی ہاشم سے حضرت علی راتونکو چھپ کر شعب سے نکلتے تھے اور کھانے کا سامان فراہم کرتے تھے۔[٤]

اس عرصہ میں جناب رسول خدا ﷺ ، جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ کی دولت تمام ہوگئی اور وہ تہی دست اور مشکلات میں گرفتار ہوگئے۔[٥] خاص طور سے جناب خدیجہ نے اپنی ساری دولت شعب میں پیغمبر اسلا ﷺ م کی راہ میں خرچ کردی۔[٦]

تین سال گرزنے کے بعد جب پیغمبر اسلا ﷺ م نے دیمکوں کے ذریعہ اس عہدنامہ کے کھا جانے کی اطلاع ابوطالب کے ذریعہ، قریش کودی۔[۷] اور دوسری طرف سے عہدنامہ پردستخط کرنے والے بعض افراد جو بنی ہاشم کی حالت زار پر رنجیدہ تھے۔[۸] وہ اس عہد سے، بیزار ہوگئے اور ان کی

---

(۱) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۱۹، ص ۱۹؛ ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۱۵۹.

(۲) ابن شہرآشوب، گزشتہ حوالہ، ص٦٥؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ٥١۔

(۳) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۱٦۱؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۷۹؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص۲۳٥؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص۱۹۔

(٤) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۳، ص ۲٥٤۔

(٥) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۲٥؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ٥۰

(٦)طبرسی، ابن شہرآشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ٦٤.

(۷) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۱٦۱؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۳٤؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۱۰؛ ابن شہرآشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص٦٥.

(۸) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۱٦۲، ۱٦٥، ۱٦٦؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳٤؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ١٤، ص ٥۹؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۸۸؛ مجلسی ، بحار الانوار، ج۱۹، ص ۱۹۔

پیش قدمی سے یہ عہد لغو ہوگیا۔[۱] اور اس طرح بنی ہاشم اپنے گھروں کی طرف پلٹ آئے۔[۲]

حضرت علی نے اپنے ایک خط میں معاویہ سے اس مشکل اور پُررنج دور کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے:

"...تو ہماری قوم نے ہمارے نبی ﷺ کو قتل کرنے اور ہماری جڑ اکھاڑ دینے کا ارادہ کرلیا اور ہمارے خلاف کتنے ہی ناپاک عزائم استوار کئے اور کون سی ناشائستہ حرکت ہوگی جس کا ہمیں نشانہ نہ بنایا ہو۔ ہمارا جینا حرام کردیا اور خوف و ہراس کو ہمارا اوڑھنا بچھونا بنادیا اور ہمیں ایک دشوار گزار پہاڑ (کی گھاٹی) میں سر چھپانے پر مجبور کردیا اور (آخرکار) ہمارے لئے جنگ کی آگ بھڑکادی (اس برے وقت میں) اللہ تعالیٰ نے ہم (بنی ہاشم) کو (ایسی) ہمت عطا فرمائی کہ ہم نے حریم رسالت کا بچاؤ کیا اور آپ کی شان حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ ہمارے مومن یہ خدمات ثواب کی خاطر بجالاتے تھے اور ہمارے کافر خونی قرابت کے پیش نظر حمایت کرتے تھے. قریش کے جو لوگ مسلمان ہوگئے تھے وہ ان مصائب سے بچے ہوئے تھے جن میں ہم گرفتار تھے کیونکہ کسی کی حفاظت تو باہمی معاہدہ کررہا تھا اور کسی کا قبیلہ اس کے بچاؤ کے لئے تیار کھڑا تھا اس لئے اسے قتل ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔[۳]

جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ کی وفات

بعثت کے دسویں سال شعب سے بنی ہاشم کے نکلنے کے کچھ ہی دن بعد پہلے جناب خدیجہ اور اس کے بعد ابوطالب کی وفات ہوگئی۔[٤]

---

(۱) بعثت کے دسویں سال میں (ابن سعد، گزشتہ)، ج ۱، ص ۲۱۰، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۳٦۔

(۲) طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ۵۲۔ ۵۱۔

(۳) نہج البلاغہ، تحقیق: صبحی صالح، مکتوب نمبر ۹.

(٤) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۳٦؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۹.

ان دو بڑی شخصیتوں کا اس دنیا سے اٹھ جانا جناب رسول خدا ﷺ کے لئے بہت بڑی اور جانگداز مصیبت تھی۔[۱] ان دو گھرے دوست اور وفادار ناصر کے رحلت کر جانے کے بعد آنحضرت ﷺ کے لئے مسلسل سخت او رناگوار واقعات پیش آئے۔[۲] اور زندگی آپ پر دشوار ہوگئی۔

جناب خدیجہ کا کارنامہ

ان دو بڑی شخصیتوں کے غیر متوقع فقدان کا اثر، فطری تھا اس لئے کہ اگرچہ جناب خدیجہ سطح شہر میں جناب ابوطالب جیسا دفاعی کردار نہیں ادا کر سکتی تھیں لیکن گھر کے اندر نہ تنہا پیغمبر ﷺ کے لئے مہربان جانثار اور دلسوز شریک حیات تھیں بلکہ اسلام کی سچی اور واقعی مددگار تھیں بلکہ مشکلات اور پریشانیوں میں رسول خدا ﷺ کی تسکین قلب اور سکون کا باعث تھیں۔[۳]

پیغمبر اسلا ﷺ م اپنی زندگی کے آخری لمحات تک جناب خدیجہ کو یاد کیا کرتے تھے۔[٤] اور اسلام کے سلسلے میں ان کی پیش قدمی، زحمات اور رنج و الم کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ آپ نے ایک دن عائشہ سے فرمایا: "خداوند عالم نے خدیجہ سے بہتر مجھے زوجہ نہیں دی جس وقت سب کافر تھے وہ ہم پر ایمان لائیں۔ جب سب نے مجھے جھٹلایا تو انھوں نے میری تصدیق کی اور جب دوسروں نے مجھے محروم کیا تو اس نے اپنی ساری دولت میرے لئے خرچ کردی۔ اور خداوند عالم نے مجھے اس سے فرزند عطا کیا ہے۔[۵]

---

(۱) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۲۹؛ پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس سال کا نام "عام الحزن" رکھا۔ (مجلسی، بحار الانوار، ج۱۹، ص ۲۵.)

(۲) ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۲٤۳؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۵۷؛ طبرسی، اعلام الوری، ص ۵۳.

(۳) وکا نت وزیرة صدق علی الاسلام و کان یسکن الیھا۔ (ابن اسحاق، گزشتہ حوالہ، ص ۲٤۳؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ.

(٤) امیرمھنا الخیامی، زوجات النبی واولاده، (بیروت موسسہ عز الدین، ط ۱، ۱٤۱۱ھ)، ص ٦۳۔ ٦۲.

(۵) ابن عبد البر، الاستیعاب (در حاشیہ الاصابہ)، ج ٤، ص ۲۸۷؛ دولابی، گزشتہ حوالہ، ص ۵۱.

جناب ابوطالب کا کارنامہ!

جیسا کہ ہم نے بیان کیاہے کہ جناب ابوطالب نہ صرف بچپنے اور نوجوانی میں محمد ﷺ کے سرپرست تھے بلکہ ان کی رسالت کے زمانہ میں بھی بے انتہا ان کے حامی اور پشت پناہ تھے۔ اور مشرکوںکی عداوتوں او رکارشکنیوں کے مقابل میں ایک عظیم دیوار تھے۔ ابوطالب کی حیات کے زمانے میں قریش بہت کم پیغمبر ﷺ کے جانی آزار و اذیت کی جرأت رکھتے تھے ایک دن بزرگان قریش میں سے کچھ لوگوں نے ایک شخص کو ورغلایا کہ مسجد الحرام میں جاکر پیغمبر ﷺ کے جسم پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا جب جناب ابوطالب کو واقعہ کی خبر ملی توآپ نے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور

"حمزہ" کے ہمراہ ان کو ڈھونڈنے کے لئے نکل پڑے اور رحمزہ سے کہا کہ یہی اوجھڑی ان میں سے ہر ایک کے جسم پر مل دیں۔[۱]

ابوطالب کی رحلت کے بعد قریش بہت گستاخ ہوگئے تھے۔ پیغمبر اسلا ﷺ م پر کوڑا پھینکتے تھے۔[۲] خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ "قریش مجھے ضرر نہیں پہنچا سکے یہاں تک کہ ابوطالب کی وفات ہوگئی۔[۳]

---

(۱) کلینی ، الاصول من الکافی، (تہران: دار الکتاب الاسلامیہ، ۱۳۸۱ھ)، ج ۱، ص ٤٤٩؛ علامہ امینی، الغدیر، ج۷، ص ۳۹۳؛ مجلسی ، بحار الانوار، ج۱۸، ص ۱۸۷؛ رجوع کریں: الغدیر، ج۷، ص ۳۵۹، ۳۸۸، ۳۹۳؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۰.

(۲) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۱۱؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک، ج ۲، ص ۲۲۹؛ بیہقی، دلائل النبوہ، ترجمہ، محمود مہدوی دامغانی، (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳۶۱)، ج ۲، ص ۸۰؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۹۱۔

(۳) ابن اسحاق، السیر و المغازی، ص۲۳۹؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۵۸؛ طبری ، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۹؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ۱، ص ٦۸؛ ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ص ۹۱؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۸۰، سبط ابن جوزی، تذکرۃ الخواص، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸۳ھ)، ص ۹.

ایمان ابوطالب

تمام شیعہ علماء کا عقیدہ ہے کہ ابوطالب مسلمان اور مومن تھے۔[۱] لیکن پیغمبر اسلا ﷺ م کی حمایت کی خاطر آپ نے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا اور چونکہ اس سماج میں خاندانی تعصب پایا جاتا تھا۔ لہٰذا ظاہری طور پر آپ نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی خاطر خاندان کا عنوان دیا تھا۔[۲]

"ابوطالب اصحاب کہف کے مانند تھے جو اپنے ایمان کو چھپائے رہے اور تظاہر بہ شرک کرتے تھے اور خدا نے ان کو دو اجر عطا کیا ہے"۔[۳]

اہل سنت کے ایک گروہ نے جناب ابوطالب کے ایمان کا انکار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مرتے دم تک ایمان نہیں لائے اور دنیا سے کفر کی حالت میں گئے۔ لیکن ان کے اس کے دعوے کے برخلاف بے شمار دلیلیں اور شواہد موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ آئین اسلام اور نبوت حضرت محمد ﷺ پر ایمان و اعتقاد رکھتے تھے۔ اختصار کے طور پر ہم صرف دو دلیل پیش کرتے ہیں:

۱۔ ان کے اشعار اور اقوال: جناب ابوطالب کے بے شمار اشعار و اقوال جو ہم تک پہنچے ہیں ان میں سے بعض میں آپ نے صراحت کے ساتھ پیغمبر اسلا ﷺ م کی نبوت اور ان کی حقانیت کا ذکر فرمایا

---

(۱) شیخ مفید، اوائل المقالات (قم: مکتبة الداوری،)، ص ۱۳؛ قتال نیشاپوری، گزشتہ حوالہ، ص ۱۵۵؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱٤، ص ٦٥؛ طبرسی، مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۸۷، تفسیر آیۂ ۲٦ سورۂ انعام؛ علی بن طاووس، الطرائف فی معرفة مذاہب الطوائف (قم: مطبعة الخیام، ۱٤۰۰ھ)، ص ۲۹۸.

(۲) طبرسی، گزشتہ حوالہ، ج ۷، ص ۳٦۰، تفسیر آیۂ ٥٦ سورۂ قصص.

(۳) کلینی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ٤٤۸؛ صدوق الامالی، (قم: المطبعة الحکمہ)، ص ۳٦٦؛ (مجلسی ۸۹)؛ قتال نیشاپوری، گزشتہ حوالہ، ص ۱٥٦؛ علامہ امینی، الغدیر، ج ۷، ص ۳۹۰؛ مفید، الاختصاص، (قم: منشورات جماعة المدرسین)، ص ۲٤۱.

ہے۔[1] اور یہ اشعار و اقوال اسلام کے سلسلہ میں ان کے ایمان اور عقیدہ کا واضح اور روشن ثبوت ہیں۔ ان کے چند اشعار نمونہ کے طور پر یہاں پیش ہیں:

تعلم ملیک الحبش ان محمداً نبی کموسیٰ و المسیح بن مریم

أتیٰ بالهدیٰ مثل الذی اتیابه و کل بامر الله یهدی و یعصم[2]

(اے حبشہ کے بادشاہ یہ جان لے کہ محمد ﷺ مانند موسیٰ اور مسیح پیغمبر ہیں وہی نور ہدایت جیسے وہ دونوں لے کر آئے تھے وہ بھی لیکر آئے ہیں اور تمام پیغمبران الٰہی خدا کے حکم سے لوگوں کی ہدایت کر کے گناہ سے روکتے ہیں)

الم تعلموا اَنَّا وَجَدنا محمداً رسولاً کموسیٰ خطّ فی اول الکتب[3]

---

(۱) ابوطالب کے شعر کا ایک دیوان ہے جس کو ابو نعیم علی بن حمزہ بصری تمیمی لغوی (م ۳۷۵ھ.ق سیسیل میں) نے جمع کیا ہے اور شیخ آغا بزرگ تہرانی نے اس کا ایک نسخہ بغداد میں آل سید عیسی عطار کی لائبریری میں دیکھا ہے۔ (الذریعہ، ج۹، قسم اول، ص ۴۳۔ ۴۲) اور اسی طرح قبیلۂ بنی مہرم سے ابو ھفان عبد اللہ بن احمد عبدی (جو کہ ایک شیعہ شاعر، مشہور ادیب اور بصرہ کے رہنے والے تھے) کے پاس ایک کتاب، شعر ابی طالب بن عبد المطلب و اخبارہ، کے نام سے تھی (رجال نجاشی، تحقیق: محمد جواد النائینی، بیروت، ط ۱، ۱۴۰۸ھ)، ج۲، ص ۱۶، نمبر ۵۶۸) مرحوم شیخ آغا بزرگ تہرانی نے اس کا ایک نسخہ بغداد میں آل سید عطار کی لائبریری میں دیکھا ہے جس میں پانچ سو (۵۰۰) سے زیادہ اشعار تھے اور ۱۳۵۶ھ میں نجف میں شائع ہوا۔ (الذریعہ، ج۱۴، ص ۱۹۵)، امیر المومنین علی چاہتے تھے کہ ابوطالب کے اشعار نقل اور جمع اوری ہوں اور آپ نے فرمایا: "ان کو یاد کرو اور اپنی اولاد کو بھی یاد کرواؤ، ابوطالب دین خدا کے پیرو تھے اور ان اشعار میں بے شمار علوم پائے جاتے ہیں"۔ (الغدیر، ج۷، ص ۳۹۳)۔

(۲) طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۴۵؛ مجمع البیان، ج۴، ص ۲۸۸؛ علامہ امینی، الغدیر، ج۷، ص ۳۳۱.

(۳) کلینی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۴۴۹؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۴، ص ۲۸۷؛ ابن ہشام، السیرة النبویہ، ج۱، ص ۳۷۷؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۴، ص ۱۸۱؛ شیخ ابو الفتح الکراجکی، کنز الفوائد، تحقیق: الشیخ عبداللہ نعمہ (قم: دار الذخائر، ط ۱، ۱۴۱۰ھ)، ج۱، ص ۱۸۱؛ امینی، الغدیر، ج۷، ص ۳۳۲۔

(کیا تمھیں نہیں معلوم کہ ہم نے محمد ﷺ کو مانند موسیٰ پیغمبر پایا ہے اور اس کا نام و نشان گزشتہ آسمانی کتابوں میں ذکر ہے)

و لقد علمت ان دین محمدٍ

من خیر ادیان البریه دیناً[1]

(مجھے یقینی طور پر معلوم ہے کہ دین محمد ﷺ ، دنیا کے بہترین ادیان میں سے ہے)

۲۔ پیغمبر اسلا ﷺ م سے ابو طالب کی حمایتیں: پیغمبر اسلا ﷺ م کے لئے جناب ابو طالب کی بے انتہا پشت پناہی اور حمایتیں جو تقریباً سات سال تک بغیر کسی وقفہ اور سستی کے جاری رہیں اور اس مدت میں قریش کے مقابل میں مقاومت اور بے شمار مصائب اور مشکلات کو برداشت کرنا آپ کے ایمان اور عقیدے کے سلسلے میں دوسرا واضح ثبوت ہے۔ آپ کے ایمان کے منکر یہ تصور کرتے ہیں کہ آپ نے یہ ساری مشکلات اور پریشانیاں خاندانی جذبہ کے تحت سہیں۔ جبکہ خاندانی روابط انسان کو اس طرح کی طاقت فرسا زحمتوں اور قربانیوں اور طرح طرح کے خطرات مول لینے پر ہرگز آمادہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی قربانیوں کے لئے ہمیشہ ایمانی اور اعتقادی جذبہ ضروری ہے۔ اگر جناب ابو طالب کا جذبہ صرف خاندانی روابط تھا تو حضرت محمد ﷺ کے دوسرے چچاؤں نے جیسے عباس اور ابو لہب نے ایسا کام کیوں نہیں کیا؟!۔[2]

محققین کے ایک گروہ کی نظر میں، بعض لوگوں نے جو کوشش کی ہے کہ جناب ابو طالب کے کفر کو ثابت کریں

---

(۱) ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ص ۵۵؛ امینی، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۴؛ عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ج ٤، ص ۱۱٦؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبۃ المعارف، ط ۲، ۱۹۷۷م)، ج ۳، ص ٤۲.

(۲) ایمان ابو طالب کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ جن میں سے کچھ کا تذکرہ شیخ آغا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب الذریعہ میں، ج ۲، ص ۵۱۰ سے ۵۱٤ پر کیا ہے۔ اور مرحوم علامہ امینی نے بھی کتاب الغدیر میں، ج ۷، ص ۳۳۰ سے ٤۰۳ تک تفصیلی طور پر بحث کی ہے اور انیس کتابیں جو کہ اسلام کے جید علماء کے ذریعہ ایمان ابو طالب کے اثبات اور ان کے حسن عاقبت کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اور چالیس حدیثیں ان کے ایمان کے اثبات میں نقل کی ہیں۔ اور جلد ہشتم کے آغاز میں بھی اس سلسلے میں مخالفوں کے اعتراضات اور شبہات کا جواب دیا ہے۔

یہ سیاسی جذبہ اور بعض تعصبات کی بنا پر ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ کے بڑے اصحاب (جوکہ بعد میں علی کے سیاسی رقیب بنے) عام طور پر پہلے بت پرست تھے۔ صرف علی تھے جو سابقۂ بت پرستی نہیں رکھتے تھے اور بچپنے سے پیغمبر ﷺ کے مکتب میں پرورش پائی۔ جو لوگ یہ چاہتے تھے کہ علی کے مقام اور مرتبہ کو کم کریں اور نیچہ دکھائیں تاکہ آئندہ ان کے برابر ہوسکیں، مجبوری کی بنا پر ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ ان کے والد بزرگوار کے کفر کو ثابت کریں تاکہ ان کا بت پرست ہونا ثابت ہو سکے۔ درحقیقت ابوطالب کا اس کے علاوہ کوئی جرم نہیں تھا کہ وہ علی کے باپ تھے اگر علی جیسے فرزند نہ رکھتے تو ایسے اتہامات ان پر نہ لگائے جاتے!۔

ان حق پامالیوں اور عباسی اور اموی کوششوں کو بھی، نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے جد، اس مرتبہ پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ اور اسلام میں پہل نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کے باپ کے کفر کو ثابت کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کے مقام اور مرتبہ کو کم کرسکیں!۔

جو اتہام جناب ابوطالب پر لگایا گیاوہ آپ کی بہ نسبت عباس بن عبد المطلب (پیغمبر اسلا ﷺ م اور حضرت علی کے چچا او رسلسلۂ خلفاء عباسی کے جد) سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا، کیونکہ عباس، فتح مکہ ۸ھ تک کفر کی حالت میں مکہ میںرہے اور جنگ بدر میں مشرکوں کے لشکر کے ساتھ اسیر ہوئے اور فدیہ دیکر آزاد ہوئے۔ فتح مکہ کے واقعہ پر مکہ کے راستے میں آپ لشکر اسلام تک گئے اور پھر مکہ واپس پلٹ آئے اور بہت ہی کوششوں کے بعد پیغمبر ﷺ سے ابوسفیان (مشرکوں کا سرغنہ) کے لئے امان لی! اس کے باوجود کسی نے نہیں کہا کہ عباس کافر تھے! کیا اس طرح کا فیصلہ ان دو لوگوں کے بارے میں فطری اور عقلی نظر آتا ہے؟! اس اعتبار سے محققین جناب ابوطالب کے کفر کے سلسلے میں پائی جانے والی حدیثوں کو جعلی سمجھتے ہیں۔[1]

---

(۱) ڈاکٹر عباس زریاب، سیرۂ رسول خدا ﷺ (تہران: سروش، ج۱، ۱۳۷۰)، ص ۱۷۸ و ۱۷۹.

ازواج پیغمبر اسلا ﷺ م

جب تک جناب خدیجہ زندہ رہیں پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی دوسری خاتون سے شادی نہیں کی[۱] ان کے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ نے دوسری خواتین سے شادی کی جن میں حضرت عائشہ کے علاوہ سب بیوہ تھیں۔ان میں سے پہلی سودہ اور ان کے شوہر سکران بن عمرو حبشہ کے مہاجروں میں سے تھے جو وہاں انتقال کرگئے تھے اور وہ بغیر سرپرست کے ہوگئی تھیں۔

بعض مستشرقین نے پیغمبر اسلا ﷺ م کی شادیوں کے بارے میں بزدلانہ تہمتوں کو دستاویز بنا کر اس کو ہوس بازی اور شہوت پرستی سے تفسیر کیا ہے۔[۲]

جبکہ مسئلہ کی منصفانہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شادیاں معمولاً عام جذبہ کے تحت نہیں ہوئیں تھیں بلکہ سیاسی، سماجی اور اسلام کی مصلحتوں کے پیش نظر ہوئی تھیں ان میں سے بعض خواتین بے سرپرست اور بیوہ تھیں اور پیغمبر ﷺ نے ان سے شادی کرکے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور بعض دوسرے بڑے خاندان یا قبائل سے تعلق رکھتی تھیں اور پیغمبر ﷺ کا مقصد ان قبائل یا خاندان کی حمایت حاصل کرنا تھا۔اور بعض وقت شادی کا مقصد جاہلی رسم و رواج کو مٹانے کی خاطر تھا۔اس مطالب کی وضاحت کے لئے کچھ قرائن اور شواہد پیش ہیں۔

۱۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے پچیس سال کی عمر میں یعنی مکمل جوانی کے عالم میں جناب خدیجہ کے ساتھ شادی کی جن کی عمر بربنائے مشہور آپ سے زیادہ تھی اور ان کے جوانی کا دور گزر چکا تھا۔ ۲۵ سال تک ان کے ساتھ زندگی گزاری۔

۲۔ جب تک جناب خدیجہ زندہ رہیں کسی دوسری خاتون سے شادی نہیں کی۔ جبکہ اس دور کے سماج میں متعدد ازواج کا ہونا ایک عام رسم تھی۔

---

(۱) ابن عبد البر، الاستیعاب، (حاشیہ الاصابہ میں)، ج ٤، ص ۲۸۲؛ صحیح مسلم؛ امام النووی کی شرح (بیروت: دار الفکر)، ج۱۵ھ ص ۲۰۱.

(۲) محمد حسین هیکل، حیات محمد ﷺ (قاهره: مکتبة النهضة المصریه، ط ۸، ۱۹٦۳.)، ص ۳۱۵و۳۱٦ و ۳۲۵.

٣۔ پیغمبر اسلا ﷺ م کی بعد کی شادیاں ٥٠ سال کے بعد (ہجرت سے پہلے کم ، اور ہجرت کے بعد زیادہ) ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے پیری کا زمانہ اور دوسری طرف سے سیاسی، سماجی اور نظامی مشکلات اور پریشانیوں کے عروج کا زمانہ تھا ایسے حالات میں کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی شہوت پرستی کی فکر میں لگا ہوگا؟ کیا اصولی طور پر پیغمبر ﷺ مدینہ میں اس طرح کے کاموں کی فرصت رکھتے تھے؟

٤۔ کیا ایسی عورتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا عیش و شہوت پرستی کی خاطر تھا جو مختلف طرح کے سلیقے اور اخلاق رکھتی ہوں اور ان میں سے بعض نے اپنے برے اخلاق او اطوار اور زنانہ حسادت کی وجہ سے پیغمبر ﷺ کو رنجیدہ اور ملول کیا ہو۔[1]

٥۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ازواج میں سے ہر ایک، الگ الگ قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں اوران میں آپس میں کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ کیاپیغمبر ﷺ کا مختلف قبائل سے تعلق رکھنا اتفاقی مسئلہ تھا؟

٦۔ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد اسلام وہاں تیزی سے پھیلنے لگا تھا اور لوگوں کے دلوں میں پیغمبر ﷺ کے معنوی نفوذ کے علاوہ آپ کی اجتماعی اور سیاسی قدرت بھی زیادہ ہوگئی تھی لہذا قبائل عرب کے رؤسا اپنے لئے افتخار سمجھتے تھے کہ پیغمبر ﷺ ان کی لڑکی سے شادی کریں لیکن آنحضرت ﷺ نے جن خواتین کو شادی کے لئے چنا تھا وہ عموماً ضعیف اور بیوہ اور لاوارث تھیں جبکہ خود آنحضرت ﷺ مردونکو کنواری لڑکیوں سے شادی کرنے کے لئے تشویق کرتے تھے۔ ہم یہاں پر پیغمبر ﷺ کی ازواج میں سے چند کا تذکرہ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

١ ام حبیبہ:

وہ اسلام کے کٹر دشمن ابوسفیان کی لڑکی تھیں وہ اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش (رسول خدا ﷺ کی پھوپھی کے لڑکے) کے ساتھ حبشہ چلی گئیں تھیں۔ عبید اللہ وہاں جاکر مرتد اور مسیحی ہوگئے اور شراب نوشی میں افراط کی وجہ سے کفر کی حالت میں دنیا سے گئے۔[2]

---

(١) اس بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے سورۂ تحریم کی آیت ١ سے ٥ تک مراجعہ کریں۔

(٢) محمد بن سعد، طبقات الکبریٰ، (بیروت: دار صادر)، ج٧، ص ٩٧؛ شیخ عباس قمی، سفینۃ البحار، ج ١، لفظ حب، ص ٢٠٤.

جب پیغمبر اسلا ﷺ م کواس واقعہ کی خبر ملی تو آپ نے ٦ھ میں[١] عمرو بن امیہ ضمیری کو حبشہ نجاشی کے پاس بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ ام حبیبہ کا عقد ان سے کردیا جائے۔ نجاشی نے ام حبیبہ کی شادی پیغمبر ﷺ سے کردی۔ اس کے بعد وہ ایک سال تک حبشہ میں رہیں اور ٨ھ میں مہاجروں کے آخری گروہ کے ساتھ مدینہ پلٹ آئیں۔[٢] اس وقت ان کی عمر ٣٠ سے ٤٠ سال کے بیچ تھی۔[٣]

ظاہرہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کا یہ اقدام اس نو مسلم خاتون سے دلجوئی کی خاطر تھا۔ کیونکہ وہ اپنے باپ اور خاندان والوں سے الگ ہوکر اپنے مسلمان شوہر کے ساتھ حبشہ چلی گئی تھیں اور پھر عالم غربت میں شوہر کا سایہ بھی اٹھ گیا تھا لہٰذا ان کے ساتھ اس سے بہتر کیا اقدام ہوسکتا تھا کہ انھیں پیغمبر ﷺ کی زوجہ ہونے کا شرف ملے؟

جن اسباب کا دعوا مسیحی مورخین نے کیا ہے اگر اس کو فرض کرلیا جائے تو یہ کس طرح سے معقول ہوگا کہ ایک شخص ایسی خاتون سے شادی کرے جو دوسرے ملک میں رہ رہی ہو اور اس کے پلٹنے کی کوئی امید نہ ہو؟!

٢۔ ام سلمہ:

ام سلمہ (ھند) ابی امیہ مخزومی کی لڑکی تھیں ان کے پہلے شوہر ابوسلمہ (عبد اللہ) مخزومی[٤] رسول خدا ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔[٥] ان سے چار لڑکے ہوئے جن میں سے ایک کا نام سلمہ تھا اسی کی مناسبت سے انھیں "ام سلمہ" اور "ابوسلمہ" کہا جانے لگا۔[٦]

---

(١) ابن اثیر، اسد الغابہ، ج٥، ص ٤٥٨؛ مسعودی، مروج الذہب، (بیروت: دار الاندلس)، ج٢، ص ٢٨٩، حمد اللہ متوفی، تاریخ خلاصۂ تاریخ، بہ اہتمام عبد الحسین نوالی)تہران: امیر کبیر، ١٣٦٢)، ص ١٦١.

(٢) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج٤، ص ١٤٤، حمد اللہ مستوفی، گزشتہ حوالہ، ص ١٦١.

(٣) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ٩٩؛ شیخ عباس قمی، گزشتہ حوالہ، ص ٢٠٤.

(٤) عسقلانی، الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ج٤، ص ٤٥٨، ابن اثیر، اسد الغابہ، ج٥، ص ٥٨٨.

(٥) ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ص ٢١٨.

(٦) گزشتہ حوالہ، ص ٥٨٨؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص ٢٩٤؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج٥، ص ٥٨٨.

ابو سلمہ جنگ احد میں زخمی ہوئے اور اسی زخم کے اثر سے جمادی الثانی ۳ھ میں شہادت کے درجے پر فائز ہوئے[۱] گویا ام سلمہ اور ان کے شوہر (بنی مخزوم) کے قبیلہ اور خاندان سے مدینہ میں کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے کہ وہ کہتی ہیں کہ جس وقت ابو سلمہ کا انتقال ہوا تو میں بہت غمگین ہوئی اور اپنے آپ سے کہا: عالم غربت میں! میں اس طرح سے گریہ کرونگی کہ ہر جگہ میرے گریہ کا تذکرہ ہوگا۔[۲]

پیغمبر اسلام ﷺ نے ٤ھ میں ان سے شادی کی[۳] اس وقت وہ بڑھاپے اور ضعیفی کی منزلوں میں قدم رکھ چکی تھیں۔[٤] اور ان کا سب سے چھوٹا بچہ شیر خوار تھا۔[٥]

واضح رہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کا اس شادی سے مقصد یہ تھا کہ اس کی اور اس کے یتیم بچوں کی سرپرستی کر سکیں۔ کیا ایک بیوہ اور سن رسیدہ خاتون سے شادی کرنا اور اس کے چار یتیم بچوں کی کفالت اور نگہداشت کرنا اپنی جگہ پر ایک ریاضت نہ تھی؟!

ام سلمہ زہد و تقویٰ اور فضیلت کے لحاظ سے حضرت خدیجہ کے بعد رسول خدا ﷺ کی ازواج میں سے سرفہرست تھیں[٦] انھیں خاندان امامت سے خاص تعلق اور انسیت تھی اور وہ بارہا خاندان اہل بیت کی طرف سے علوم و اسرار ولایت کی امانتونکی محافظ رہی ہیں۔[۷]

---

(۱) ابن عبد البر، الاستیعاب، ج٤، ص ۸۲.

(۲) امیر مهنا الخیامی، زوجات النبی او اولاده (بیروت: موسسه عز الدین، ط ۱، ۱٤۱۱ھ)، ص ۱۹۹.

(۳) ابن حجر، گزشتہ حوالہ، ص ٤٥۸؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۸، ص ۸۷.

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۹۰، ۹۱؛ محمد بن حبیب، المحبر (بیروت: دار الافاق الجدیده)، ص ۸٤

(٥) ابن حجر، گزشتہ حوالہ، ص ٤٥۸؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۹۱.

(٦) مامقانی، تنقیح المقال، ج۳، (فصل النسائ)، ص ۷۲.

(۷) مامقانی، گزشتہ حوالہ، شیخ محمد تقی التستری، قاموس الرجال (تہران: مرکز نشر الکتاب، ۱۳۷۹ھ)، ج۱۰، ص ۳۹۶.

۳۔ زینب بنت جحش:

زینب، رسول خدا ﷺ کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور اس سے قبل (پیغمبر ﷺ کے منھ بولے بیٹے) زید بن حارثہ کی زوجہ تھیں۔[۱] اور زید سے جدائی کے بعد پیغمبر ﷺ کے عقد میں آگئیں۔

زید پہلے حضرت خدیجہ کے غلام تھے انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد زید کو اپنے شوہر حضرت محمد ﷺ کے حوالے کردیا۔ آنحضرت ﷺ نے بعثت سے قبل اس کو آزاد کردیا اور پھر اپنا منھ بولا بیٹا قرار دیا۔ اس دن سے اس کو "زید بن محمد ﷺ " کہا جانے لگا۔[۲]

بعثت کے بعد خداوند عالم نے منھ بولے بیٹے کی رسم کو باطل اور بے اعتبار قرار دیا۔

"اللہ نے نہ تمہاری منھ بولی اولاد کو اولاد قرار نہیں دیا یہ سب تمہاری زبانی باتیں ہیں اور اللہ تو صرف حق کی بات کہتا ہے اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے"۔

ان بچوں کو ان کے باپ کے نام سے پکارو کہ یہی خدا کی نظر میں انصاف سے قریب تر ہے اور اگر ان کے باپ کو نہیں جانتے ہو تو یہ دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں اور تمہارے لئے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے جو تم سے غلطی ہوگئی ہے۔ البتہ تم اس بات کے ضرور ذمہ دار ہو جو تمہارے دلوں نے قصداً انجام دیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔[۳]

پیغمبر اسلام ﷺ نے ان آیات کے نزول کے بعد زید سے فرمایا: تم زید بن حارثہ ہو اور اس دن سے وہ پیغمبر ﷺ کا آزاد کردہ (مولیٰ رسول اللہ) کہا جانے لگا۔[٤]

رسول خدا ﷺ نے اس سے زینب کی شادی کرنا چاہی۔ زینب جو کہ عبد المطلب کی نواسی اور جن کا تعلق قریش کے مشہور قبیلہ سے تھا پہلے راضی نہیں ہوئیں کیونکہ زید نہ صرف قریش سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ایک آزاد

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۸، ص ۱۰۱؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج۲، ص ۲۲٦؛ ابن حجر، الاصابہ، ج٤، ص ٥٦٤.

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۲٤؛ ابن حجر، گزشتہ حوالہ، ص ٥٦۳.

(۳) سورۂ احزاب، آیت ٤، ٥.

(٤) آلوسی، تفسیر روح المعانی، (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ج ۲۱، ص ۱٤۷.

شدہ غلام تھے لیکن چونکہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس کی شادی کے بارے میں زیادہ تاکید فرمائی لہذا زینب راضی ہوگئیں یہ شادی نسلی اور طبقاتی امتیازات کے خاتمہ کا ایک نمونہ تھی اور پیغمبر ﷺ کے اصرار کا راز بھی یہی تھا۔

طرفین میں بدسلوکی اور بد خلقی کی وجہ سے کچھ دن میں اس جوڑے کی مشترک زندگی کی بنیادیں ہلنے لگیں اور جدائی کے قریب پہنچ گئیں۔ چند مرتبہ زید نے چاہا کہ اس کو طلاق دیدیں لیکن پیغمبر ﷺ نے اس سے مصالحت کرنے کے لئے کہا اور فرمایا: اپنی زوجہ کو رکھو!۔(۱)

آخر کار زید نے اس کو طلاق دیدی، جدائی کے بعد پیغمبر اسلا ﷺ م خدا کی طرف سے مامور ہوئے کہ زینب کے ساتھ شادی کریں تاکہ منھ بولے بیٹے کی مطلقہ کے ساتھ شادی کرنا مسلمانوں کے لئے دشوار نہ ہو اور غلط رسم و رواج جو کہ زمانۂ جاہلیت سے لوگوں کے درمیان رائج تھا۔ عملی طور سے اسے ختم کردیں۔ کیونکہ عرب منھ بولے بیٹے کو ہر لحاظ سے اپنا واقعی بیٹا سمجھتے تھے۔ لہذا اس کی زوجہ کے ساتھ شادی کرنا جائز نہیں جانتے تھے قرآن مجید نے اس شادی کے مقصد اور سبب کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

"اور اس وقت کو یاد کرو جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے بھی نعمت نازل کی اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی زوجہ کو روک کر رکھو، اور اللہ سے ڈرو اور تم اپنے دل میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جسے خدا ظاہر کرنے والا تھا(۲) اور تمھیں لوگوںکے طعنوں کا خوف تھا حالانکہ خدا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے اس کے بعد جب زید نے اپنی حاجت پوری کرلی تو ہم نے

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۸، ص ۱۰۳.

(۲) مفسروں کے عقیدہ کے مطابق جو کچھ پیغمبر ﷺ کے دل میں تھا وہ یہ تھا کہ خداوند عالم نے ان کو باخبر کردیا تھا کہ زید اپنی زوجہ کو طلاق دے گا اور وہ اس کے ساتھ شادی کریں گے تاکہ اس جاہلانہ رسم کو توڑیں لیکن پیغمبر اسلا ﷺ م نے لوگوںکے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ یہ مطلب چوتھے امام سے نقل ہوا ہے (آلوسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۲، ص ۲٤؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۸، ص ۳٦۰.)

اس عورت کا عقد تم سے کردیا تاکہ مومنین کے لئے منھ بولے بیٹوںکی بیویوں سے عقد کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جب وہ لوگ اپنی ضرورت پوری کرچکیں اور اللہ کا حکم بہرحال نافذ ہو کر رہتا ہے"۔[۱]

منافقوں نے پیغمبر ﷺ پر تہمت اور بدگوئی کے لئے اس شادی کو دلیل اور بہانہ بنایا کہ محمد ﷺ نے اپنے لڑکے کی زوجہ (بہو) کے ساتھ شادی کی ہے۔[۲]

خداوند عالم ان کے جواب میں فرماتا ہے:

"محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں اور اللہ ہر شی کو خوب جاننے والا ہے"۔[۳]

بعض مسیحی مورخین نے اس شادی کوایک عشقیہ داستان کی صورت میں پیش کیا ہے اور اس کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔[٤]

---

(۱) سورۂ احزاب، آیت ۳۷.

(۲) ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج۷، ص ٤٩٤؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۸، ص ۳۳۸؛ قسطلانی، المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ، تحقیق: صالح احمد الشامی، (بیروت: المکتب السلامی ط۱، ١٤١٢ھ)، ج۲، ص ۸۷.

(۳) سورۂ احزاب، آیت ٤٠.

(٤) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، عربی ترجمہ احمد السنتناوی (اور اس کے معاونین)، ج ۱۱، ص ۲۹، کلمۂ زینب؛ محمد حسین ھیکل، حیات محمد ﷺ، ص ۳۲۳۔ ۳۱٦۔ مغربی مورخین کے کہنے کے مطابق پیغمبر اسلا ﷺ م ایک دن زید کے گھر گئے اور وہاں اچانک ان کی نظر زینب پرپڑی اور وہ اس کے حسن و خوبصورتی کے عاشق ہو گئے جب زید کو اس بات کی خبر لگی تو اس نے زینب کو طلاق دیدی! اور....جبکہ زینب پیغمبر ﷺ کے رشتہ داروں میں سے تھی اور حجاب اس زمانہ میں معمول نہیں تھا اور وہ پیغمبر ﷺ کے لئے کوئی نئی فرد نہیں تھیں۔ عام طور سے ایک خاندان کے لوگ ایک دوسرے سے آگاہ رہتے ہیں۔ ہمیں یہ یاددہانی کرانی چاہئے کہ اس طرح کے کچھ واقعات جو مغربی مورخین کے سوء استفادہ کا باعث بنے ہیں وہ غیر معتبر اور بے بنیاد روایتوں سے ماخوذ ہیںجو بعض تاریخ اسلام (جیسے تاریخ طبری، ج۲، ص ٤۲، طبقات الکبریٰ، ج ۸، ص ۱۰۱)، میں نقل ہوئے ہیں اور دوسرے مؤلفین نے بھی بغیر توجہ کے ان سے نقل کیا ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ قرآن نے بھی اس واقعہ کو وضاحت کے ساتھ دوسرے انداز میں بیان کیا ہے اور علمائے اسلام نے بھی ان روایات کو غیر قابل قبول قرار دیا ہے ان میں سے سید مرتضی علم الہدی، شیعوں کے نامور عالم دین (م: ٤۳٦ھ)، نے اس روایت کو "روایت خبیثہ" کہا ہے۔ (تنزیہ الانبیائ، ص ۱۱٤) اور آلوسی بغدادی نے اس کو واقعہ نگاروںکی ناقابل قبول بات کہی اور شارح مواقف سے نقل ہوا ہے اس نے کہا ہے کہ پیغمبر ﷺ کو اس ناروا نسبت سے مبرا سمجھنا چاہئے (روح المعانی، ج ۲۲، ص ۲۵۔ ۲٤)

لیکن ان کا یہ دعوا، پیغمبر اسلا ﷺ م کی نبوت اور عصمت کی شان کے مطابق نہیں ہے اور اس کے علاوہ ہم نے دیکھا کہ مسئلہ کچھ اور تھا جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے اور قرآن نے بھی اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کی ازواج میں سے ان چند کا تذکرہ آنحضرت ﷺ کے متعدد ازواج کے ہونے کے مقصد کو واضح کردیتا ہے اور بقیہ کے حالات بھی تقریباً انھیں کے مثل ہیں لہذا ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

قرآن کی جاذبیت

پیغمبر اسلا ﷺ م لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے میں بہت کم اپنی طرف سے کچھ کہتے تھے. ان کی دعوت کا بہترین وسیلہ قرآن کی آیات ہوا کرتی تھیں جو عربوں کی سماعتوں کو سحر انگیز کشش میں بدل دیتی تھیں۔

حضرت محمد ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جو فصاحت و بلاغت، الفاظ و کلمات، جملوں کی ترکیب، انتخاب الفاظ اور آیات قرآن کی ایک خاص صدا کے لحاظ سے معجزہ ہے جس میں بے انتہا زیبائی، دلکشی اور جذابیت پائی جاتی ہے کہ جس کا مثل پیش کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید "چیلنج" کرتا ہے اور منکروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تمھیں ا س میں کوئی شک ہے تو اس کے ایک سورہ کا جواب لے آؤ۔[۱]

حجاز کے عرب، شاعر اور شعر شناس تھے، قرآن کی آیات کی فصاحت و بلاغت اور زیبائی کو دیکھ کر وہ اس کے شیدائی اور اس میں مجذوب ہوجاتے تھے۔ وحی کے کلمات، ان کی سماعتوں میں دلکش نغموں اور دلنشین صداؤں سے زیادہ، لذت بخش محسوس ہوتے تھے اور کبھی تو شدت تاثیر سے قرآن کی

---

(۱)سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۔

آیات ان کے وجود کی تہوں تک اس قدر نفوذ کرجاتی تھیں کہ کافی دیر تک اپنی جگہ پر لذت و کشش میں غرق کھڑے رہتے تھے!۔
ایک شب قریش کے کچھ سردار جیسے ابوسفیان اورابوجہل ایک دوسرے سے بے خبر حضرت محمد ﷺ کے گھر کے اطراف میں چھپ گئے اور صبح تک قرآن کی آیات کو سنتے رہے جو آپ نماز شب میں تلاوت فرماتے تھے اور صبح سویرے پلٹتے وقت جب ایک نے دوسرے کو دیکھا تو ایک دوسرے کی ملامت کرنے لگے اور کہا: پھر ایسی حرکت نہیں کریں گے کیونکہ اگر احمقوں نے ہمیں دیکھ لیا تو ہمارے بارے میں کچھ اور سوچیں گے (سوچیں گے کہ ہم مسلمان ہوگئے) لیکن اس کے باوجود یہ حرکت کئی دوسری راتوں میں پھر انجام دی اور ہر مرتبہ یہ طے کرتے تھے کہ دوبارہ اس طرح کی بے احتیاطیاں نہیں کریں گے۔[۱]

جادوگری کا الزام

حج کا موسم پیغمبر اسلام ﷺ کی تبلیغ او ردعوت کے لئے مناسب موقع ہوا کرتا تھا کیونکہ عرب کے مختلف قبیلوں کے لوگ اعمال حج بجالانے کے لئے مکہ میں آیا کرتے تھے، لہٰذا اس موقع پر حضرت محمد ﷺ کے لئے صدائے توحید کو جزیرۃ العرب کے تمام رہنے والوں تک پہنچانا آسان کام تھا۔ لہٰذا اس لحاظ سے حج کا موسم سرداران قریش کے لئے خطرناک بن گیا تھا اور وہ اس سے خوف زدہ رہتے تھے لہٰذا موسم حج کے شروع ہوتے ہی بزرگان قریش کا ایک گروہ، ولیدبن مغیرہ (جوکہ ایک سن رسیدہ شخص اور قبیلہ بنی مخزوم کا سردار تھا) کے پاس جمع ہوا، اس نے کہا کہ حج کا موسم آگیا ہے لوگ ہر طرف سے تمہارے شہر میں آرہے ہیں اور انھوں نے محمد ﷺ کے بارے میں سن رکھا ہے۔ لہٰذا تم سب اس کے بارے میں ایک

---

(۱) ابن ہشام، السّیرۃ النّبویہ، ج۱، ص ۳۳۷.

ہی بات کہو، مختلف باتیں کہہ کر ایک دوسرے کو جھٹلاؤ نہیں۔

ان لوگوں نے کہا: جو کچھ تم کہو وہی ہم بھی کہیں گے۔

اس نے کہا: تم لوگ کہو، میں سنتا ہوں۔

ہم اسے کاہن کہیں گے۔

نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہے ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے وہ نہ کاہنوں کی طرح پڑھتا ہے اور نہ مسجع کلام کرتا ہے۔

ہم اسے دیوانہ کہیں گے۔

نہیں وہ دیوانہ بھی نہیں ہے۔ ہم نے دیوانگی کو دیکھا ہے اور اس کے آثار کو بھی جانتے ہیں نہ اس کا جسم غیر ارادی طور پر لرزتا ہے اور نہ ہی دیو اس میں وسوسہ کرتا ہے۔

ہم اسے شاعر کہیں!

شاعر بھی نہیں ہے۔ ہم شعر کی قسموں کو پہچانتے ہیں جو وہ کہتا ہے وہ شعر نہیں ہے۔

ہم اسے ساحر اور جادوگر کہیں۔

نہیں وہ ساحر بھی نہیں ہے۔ ہم نے ساحروں کے سحر کو دیکھا ہے کہ کس طرح وہ رسیوں کو پھونکتے اور ان کو گرہ لگاتے ہیں۔! اس کا کام سحر نہیں ہے۔

پھر ہم اسے کیا کہیں؟

خدا کی قسم اس کا کلام شیرین اور دلنشین ہے اور اس کا درخت شاداب اور اس کی ٹہنیاں پر ثمر ہیں اس طرح کی جتنی باتیں اس کے بارے میں کہوگے، اس کا غلط ہونا واضح ہو جائے گا۔ لہذا تمام چیزوں سے بہتر ہے کہ ہم اسے جادوگر کہیں۔ کیونکہ وہ اپنے سحر آمیز کلمات کے ذریعہ باپ بیٹے، بھائی بھائی، عورت مرد اور ایک قبیلہ کے افراد میں جدائی ڈال دیتا ہے۔!

لہٰذا قریش کے سردار، اس ارادہ سے متفرق ہوگئے اوراس دن سے حاجیوں کے راستے میں بیٹھتے تھے اور ان کو ہوشیار کرتے تھے کہ رسولخدا ﷺ سے ملاقات نہ کریں۔[۱]

قریش کی اعلی کمیٹی نے رسول ﷺ کے جس کلام کو "جادو" کہا وہ قرآن مجید کی دلنشین آیات تھیں کہ جس کو سننے کے بعد ہر شخص متاثر ہو جاتا تھا اور اس کو قرآن کا گرویدہ اور عاشق بنا دیتا تھا۔قرآن کی آیات سننے پر پابندی اس حدتک لگائی کہ قریش کے سردار، بڑی شخصیتوں سے جیسے اسعد بن زرارہ جو کہ مدینہ سے مکہ آیا ہوا تھا اس سے جاکر کہا کہ طواف کے وقت اپنے کان میں روئی لگالیں تاکہ محمد ﷺ کے سحر کے خطرہ سے محفوظ رہیں!![۲]

طائف کا تبلیغی سفر

طائف مکہ سے ۱۲ فرسخ (تقریباً ۷۲ کلومیٹر) کے فاصلہ پر واقع ہے یہ علاقہ اوریہاں کی آب و ہوا بہترین اور موسم خوش گوار ہے۔ اس زمانہ میں طائف کے باغوں کے انگور مشہور تھے۔[۳]

قریش کے بعض ثروتمندوں کے باغ اور زمینیں وہاں تھیں۔ خود طائف کے لوگ بھی دولت مند تھے اور رباخوری میں مشہور تھے اور طائف میں اس وقت ایک قدرت مند قبیلہ "ثقیف" رہا کرتا تھا۔

جناب خدیجہ اور جناب ابوطالب کی رحلت کے بعد قریش کی جانب سے حضرت محمد ﷺ پر دباؤ اور اذیتیں بڑھ گئیں اور مکہ میں تبلیغی کام دشوار ہوگیا اور دوسری طرف سے یہ بھی ضروری تھا کہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام نہ رکے، لہٰذا پیغمبر ﷺ نے ارادہ کیا کہ طائف جائیں اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں، شاید وہاں پر ان کا کوئی ناصر و مددگار پیدا ہوجائے اس سفر میں

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۲۸۹ - ۲۸۸.

(۲) طبرسی، اعلام الوری، ص ٥٦.

(۳) یاقوت حموی، معجم البلدان، ج ٤، ص ۹.

زید ابن حارثہ[١] اور حضرت علی[٢] آپ کے ساتھ تھے۔

آنحضرت ﷺ نے طائف میں قبیلۂ ثقیب کے تین افراد سے، جن میں ایک کی زوجہ، قبیلۂ قریش "خاندان بنی جمع"[٣] سے تھی ملاقات کی اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور ان سے مدد چاہی۔ لیکن انھوں نے آپ کی بات قبول نہیں کی اور آپ کے ساتھ بد سلوکی سے پیش آئے۔ پیغمبر ﷺ نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس بات کو چھپالیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چیز مکہ تک پہنچ جائے اور قریش کی دشمنیاں اور گستاخیاں ہم سے زیادہ نہ بڑھ جائیں۔ لیکن ان لوگوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

رسول خدا ﷺ دوسرے بزرگان طائف کے پاس بھی گئے لیکن ان لوگوں نے بھی آپ کی بات قبول نہیں کی اور اپنے جوانوں کے بارے میں ڈرے کہ کہیں وہ نئے دین کے گرویدہ نہ ہوجائیں۔[٤]

طائف کے بزرگوں نے، اوباشوں کمینوں پست لوگوں اور غلاموں کو ورغلایا اور ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کا ہلّڑ، ہنگامہ اور گالم گلوج کرتے ہوئے پیچھا کیا اور آنحضرت ﷺ پر پتھر برسائے جس سے پیغمبر ﷺ کے دونوں پیر اور زید کا سر زخمی ہوگیا۔

پیغمبر ﷺ ایک انگور کے باغ میں جو عتبہ اور شیبہ (قریش کے سرمایہ دار) کا تھا وہاں چلے گئے اور ایک

---

(١) طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج ٢، ص ٢٣٠؛ بلاذری، انساب الاشراف۔ تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف)، ج ١، ص ٢٣٧.

(٢) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمدابوالفضل ابراہیم، (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ١٩٦١ئ)، ج ١٤، ص ٩٧ و ج ٤، ص ١٢٨ ـ ١٢٧؛ مدائنی کی نقل کے مطابق۔

(٣) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ٢٣٠؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ٢، ص ٦٠.

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ٢١٢.

انگور کے درخت کے سایہ میں پناہ لی اور وہاں بیٹھ کر خدا سے مناجات کی۔

عتبہ اور شیبہ جو انگور کے باغ کے اندر سے آنحضرت ﷺ کے تعاقب اور اذیت کا منظر دیکھ رہے تھے ان کو آنحضرت ﷺ کی حالت زار پر ترس آیا۔ لہٰذا کچھ انگور اپنے مسیحی غلام "عدّاس" (جو کہ نینوا کا رہنے والا تھا) کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کے پاس بھیجا۔

پیغمبر ﷺ نے اس کو نوش فرماتے وقت "بسم اللہ" کہی یہ دیکھ کر "عداس" کے اندر تحقیق و جستجو کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ اور پھر اس نے آنحضرت ﷺ سے مختصر گفتگو کے بعد کہ جس میں آپ نے اپنی رسالت کا تذکرہ کیا۔ آپ کے قدموں پر گر پڑا اور آپ کے ہاتھ پیر اور سر کا بوسہ لینے لگا[۱] اور مسلمان ہوگیا۔[۲]

پیغمبر اسلا ﷺ م دس دن طائف میں[۳] رہنے کے بعد ثقیف کی عدم حمایت اور ان کے اسلام نہ قبول کرنے پر مایوس ہو کر دوبارہ مکہ واپس آگئے۔

کیا پیغمبر ﷺ نے کسی سے پناہ مانگی؟

کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مکہ میں دوبارہ پلٹنے کے بعد مطعم بن عدی سے پناہ مانگی اور اس کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوئے لیکن اس سلسلے میں جو قرائن اور شواہد ملتے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل بعید نظر آتی ہے. ان میں سے کچھ شواہد یہ ہیں:

۱۔ یہ بات کس طرح سے قبول کی جاسکتی ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے دس سال تبلیغ و دعوت اور بت

---

(۱) طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۳۰؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۶۲.

(۲) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۳۰.

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۱۲؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۴، ص ۹۱؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۹، ص ۲۲؛ طائف میں پیغمبر ﷺ کے قیام کی مدت اس سے بھی زیادہ لکھی گئی ہے۔

پرستوں سے مقابلہ کرنے کے بعد، پناہندگی کی ذلت و خواری کو قبول کیا ہو؟ جبکہ اپنی ساری عمر میں کسی کے احسان مند نہیں ہوئے۔

۲۔ اگرچہ جناب ابوطالب، اس وقت دنیا سے رحلت فرماگئے تھے لیکن بقیہ بنی ہاشم وہاں موجود تھے اور ان کے درمیان بہادر افراد جیسے جناب حمزہ موجود تھے جن سے قریش کو ڈر تھا کہ کہیں وہ انتقام نہ لیں جیسا کہ شب ہجرت کے واقعہ میں بھی سردار ان قریش نے پیغمبر ﷺ کے قتل کی سازش میں بنی ہاشم کے خون خواہی اور انتقام کے خوف سے چند قبیلوں کو اپنے ساتھ کرلیا تھا۔

۳۔ بعض تاریخی کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ زید آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تھے اور بعض مورخین کی نقل کے مطابق حضرت علی بھی آپ کے ہمراہ تھے (اصولی طور پر یہ بعید ہے کہ حضرت علی ایسے سفر میں پیغمبر ﷺ کے ہمراہ نہ رہے ہوں) لہٰذا تین افراد کا ایک گروہ موجود تھا جو اپنا دفاع کرسکتا تھا۔ لہٰذا پناہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

٤۔ پیغمبر اسلا ﷺ م عرب کے بہادروں میں سے تھے لہٰذا ان کو ایک کمزور اور ضعیف انسان نہیں سمجھنا چاہئے کہ جو بھی چاہے انھیں ضرر پہنچا دے۔ جیسا کہ حضرت علی نے میدان جنگ میں ان کی شجاعت کی تعریف اس طرح کی ہے:

"جس وقت جنگ کی آگ شدید شعلہ ور ہوتی تھی تو ہم رسول خدا ﷺ کے پاس پناہ مانگتے تھے اور اس وقت ہم میں سے کوئی بھی ان سے زیادہ دشمن سے نزدیک نہیں ہوتا تھا"۔[1]

۵۔ پیغمبر اسلا ﷺ م نے قبیلہ جاتی نظام سے جو کہ بہت ساری مشکلات اور پریشانیونکی جڑ تھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت ﷺ ، پناہندگی کی رسم جو کہ قبیلہ جاتی نظام کا ایک حصہ تھی اس کا سہارا لیتے اور اس کی تائید فرماتے۔

---

(۱) کنا اذا احمر البأس اتقینا برسول اللہ ﷺ فلم یکن احد منا اقرب الی العدو منہ (نہج البلاغہ، تحقیق: صبحی صالح، ص۵۳۰؛ غریب کلامہ، نمبر ۹۰).

٦۔ بلاذری[١] اور ابن سعد[٢] کی خبریں بیان ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا طائف کی طرف سفر شوال کے آخری دنوں میں ہوا تھا اگر اس خبر کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا طائف میں قیام اور پھر مکہ واپسی، حرام مہینے میں ہوئی تھی اور حرام مہینوں میں عام طور سے لڑائی جھگڑا اور خون ریزی بند ہو جاتی تھی اسی بنا پر آنحضر ﷺ ت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا تاکہ پناھندگی کا مسئلہ پیدا ہوتا۔

ان قرائن کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ طائف سے واپس ہونے کے بعد (کہتے ہیں کہ ایک شب آپ نے "نخلہ"[٣] میں قیام کیا اور وہاں جنّات کے ایک گروہ نے، قرآن کی آیات کو سنا)،[٤] وادی نخلہ کے راستے سے مکہ آ گئے۔[٥]

عرب قبائل کو اسلام کی دعوت

پیغمبر اسلا ﷺ م نے مکہ اور اس کے اطراف میں رہنے والے قبائل عرب کو اسلام کی طرف دعوت دی جیسا کہ آپ کِندَہ، کَلب، بَنی حنیفہ اور بنی عامربن صعصعہ، قبیلے کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ابو لہب بھی آپ کے پیچھے گیا اور لوگوں کو آپ کی پیروی کرنے سے منع کیا۔[٦]

---

(١) انساب الاشراف، ج ١، ص ٢٣٧.

(٢) طبقات الکبریٰ، ج ١، ص ٢١٠.

(٣) طائف اور مکہ کے درمیان ایک محلہ ہے جس کی دوری ایک رات میں طے ہوتی ہے۔ (السیرة النبویہ، ج ٢، ص ٦٣)

(٤) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ٢٣١؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٦٣.

(٥) مراجعہ کریں: الصحیح من سیرة النبی الاعظم، ج ٢، ص ١٦٨ ۔ ١٦٧.

(٦) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ٢، ص ٦٦ ۔ ٦٥؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج ٢، ص ٢٣٣؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج ١، ص ٢٣٨ ۔ ٢٣٧؛ ابن اسحاق، السیر و المغازی، تحقیق: سہیل زکار، ص ٢٣٢؛ نیز قبائل: بنی فزارہ، غسان، بنی مرہ، بنی سلیم، بنی عبس، بنی حارث، بنی عذرہ، حضارمہ، بنی نضر اور بنی بکاء میں سے ہر ایک کو دعوت دی لیکن کسی نے قبول نہیں کیا۔ (ابن سعد، طبقات الکبریٰ)، (بیروت: دار صادر، ج ١، ص ٢١٧ ۔ ٢١٦)

جس وقت پیغمبر اسلا ﷺ م نے بنی عامر سے گفتگو کی، ان کے بزرگوں میں سے ایک شخص جس کا نام بحیرہ بن فراس تھا، اس نے کہا: "اگر ہم آپ کی بیعت کریں اور دعوت کو قبول کریں او رخدا آپ کو آپ کے دشمنوں پر کامیاب کرے تو کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کا جانشین ہم میں سے ہوگا؟"

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ کام خدا سے مربوط ہے وہ اس امر کو جہاں چاہے گا وہاں قرار دے گا"[۱]

اس نے تعجب اور انکار کے عالم میں جواب دیا: ہم آپ کی راہ میں قبائل عرب سے مقابلہ کریں اور آپ سینہ سپر بنیں اور جب خدا آپ کو کامیاب کردے تو مسئلہ دوسرے کے ہاتھ میں چلا جائے؟ ہم کو آپ کے دین کی ضرورت نہیں ہے۔[۲]

منقول ہے کہ ایسی پیش کش قبیلۂ کندہ کی طرف سے بھی ہوئی اور پیغمبر ﷺ کا جواب بھی وہی تھا۔[۳]

پیغمبر ﷺ کا یہ جواب اور رد عمل دو اعتبار سے قابل توجہ ہے:

اول: یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا تاکید فرمانا کہ ان کی جانشینی کا مسئلہ خدا سے مربوط ہے، خود آنحضرت ﷺ کی جانشینی کے انتصابی ہونے پر گواہ ہے یعنی یہ منصب ایک الٰہی منصب ہے اور اس سلسلے میں انتخاب، خدا کی طرف سے انجام پاتا ہے نہ لوگوں کی طرف سے۔

دوسرا: سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے انسانی حکمرانوں کے برخلاف جو کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کی چال چلتے تھے اور اس کی توجیہ و تاویل کرتے تھے، امر تبلیغ میں غیر

---

(۱) الأمر لله {الی الله} یضعہ حیث یشائ۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٦؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (بیروت: دار المعرفہ)، ج۲، ص ۱٥٤؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ والآثار المحمدیہ، (بیروت: دار المعرفہ، ط۲)، ج۱، ص ۱٤۷؛ سید جعفر مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی، ج ۲، ص ۱۷٦ ۔ ۱۷٥

(۳) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبہ المعارف، ط ۱، ۱۹٦٦.)، ج۳، ص ۱٤٠

اخلاقی روش اختیار نہیں کی ۔ جبکہ اس زمانہ میں ایک بہت بڑے قبیلہ کا مسلمان ہو جانا بہت اہمیت رکھتا تھا لیکن (اس کے باوجود بھی آپ تیار نہیں ہوئے کہ لوگوں سے ایسے وعدے کریں جس کا پورا کرنا آپ کے بس سے باہر ہو)۔

بہر حال حج و عمرہ کے موسم میں، اور حرام مہینوں کے احترام میں، امنیت پیدا ہوئی اور بہت سے گروہ مختلف علاقوںسے مکہ اور منی یا مکہ کے اطراف میں لگنے والی بازاروں جیسے موسمی بازار عکاظ، مجنّہ اورذی المجاز میں جاتے تھے[1] اور پیغمبر ﷺ وہاں پر اپنے تبلیغی مشن کو جاری رکھتے اور اس کو اور توسیع دیتے تھے ۔

آپ بزرگان قبائل کے پاس جاتے تھے اور ان کو تبلیغ کرتے اور اگر مکہ کے مسافر اور زائر خود مسلمان نہیں ہوتے تھے تو کم از کم آپ کے بعثت کی خبر اپنے علاقہ میں پھیلاتے تھے اور یہ کام آپ کی کامیابی کی راہ میں ایک قدم تھا۔

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۱٦.

چوتھا حصہ

ہجرت سے عالمی تبلیغ تک

پہلی فصل: مدینہ کی طرف ہجرت

دوسری فصل: مدینہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کے بنیادی اقدامات

تیسری فصل: یہودیوں کی سازشیں

چوتھی فصل: اسلامی فوج کی تشکیل

پہلی فصل

مدینہ کی طرف ہجرت

مدینہ میں اسلام کے نفوذ کا ماحول

وادی القریٰ ایک بڑا درّہ ہے جہاں سے، یمن کے تاجروں کا شام جانے کا راستہ مکہ کے اطراف سے ہوتا ہوا گزرتا ہے اس درّے کی لمبائی شمال سے جنوب تک ہے اور اس میں چند ایسی زمینیں بھی تھیں جو آب و گیاہ سے مالا مال اور کھیتی باڑی کے لائق تھیں۔[1] اور وہاں سے قافلے گزرتے وقت اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکہ کے شمال میں ۵۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر انھیں زمینوں میں سے ایک زمین میں قدیمی شہر "مدینہ" پڑتا تھا جو ہجرت رسول خد ﷺ ا کے بعد "مدینۃ الرسول" اور پھر "مدینہ" کہا جانے لگا۔

اس شہر کے لوگوں کا پیشہ اہل مکہ کے برخلاف کھیتی باڑی اور باغبانی تھا۔ مدینہ کے اجتماعی حالات اور آبادی کا تناسب بھی مکہ سے بالکل الگ تھا۔ اس شہر میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے "بنی نضیر"، "بنی قینقاع" اور "بنی قریظہ" رہتے تھے۔ دو مشہور قبیلہ "اوس اور خزرج" بھی جن کی اصالت یمنی (قحطانی) تھی مأرب بند ٹوٹنے کے بعد[2] جنوب سے ہجرت کر کے اس شہر میں یہودیوں کے بغل

---

(۱) یاقوت حموی، معجم البلدان، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۹۹ھ) ج ٤، ص ۳۳۸.

[2] وہی مصنف، ج۵، ص ۳٦، مأرب بند ٹوٹنے کا تذکرہ ہم اس کتاب کے پہلے حصہ میں کر چکے ہیں.

میں آکر رہنے لگے تھے۔

جس زمانے میں پیغمبر اسلا ﷺ م مکہ میں تبلیغ الٰہی میں سرگرم تھے مدینہ میں ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جن سے ہجرت پیغمبر ﷺ کا ماحول ہموار ہو رہا تھا اور پھر یہ شہر اسلام کے پیغام اور تبلیغی مرکز میں تبدیل ہوگیا ان واقعات میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔یہودیوں کے پاس شہر کے اطراف میں زرخیز زمینیں تھیں اور ان میں انھوں نے کھجور کے باغات لگا رکھے تھے جن سے ان کی مالی حالت اچھی ہوگئی تھی[۱] کبھی کبھار ان کے اور اوس و خزرج کے درمیان نوک جھوک ہوجایا کرتی تھی۔یہودی ان سے کہتے تھے کہ عنقریب ایک پیغمبر ﷺ آنے والا ہے ہم اس کی پیروی کریں گے اور اس کی مدد سے تم کو قوم عاد وارم کی طرح نابود کردیں گے۔[۲]

---

(۱) مونٹگری واٹ، محمد ﷺ فی المدینہ، تعریف: شعبان برکات (بیروت: منشورات المکتبة العصریہ)، ص ۲۹۴ پر کہتے ہیں کہ اوس و خزرج کے مدینہ آنے سے قبل، قبائل عرب ۱۳ قلعوں اور کالونیوں کے مقابلے میںیہودیوں کے پاس ۵۹ قلعہ تھے (گزشتہ حوالہ، ۲۹۳؛ وفاء الوفاء، ج ۱، ص ۱۶۵.) اس سے دونوں کی زندگی کے معیار اور فاصلہ کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۷۰؛ طبری، ج ۲، ص ۲۳٤؛ بیہقی، دلائل، ترجمہ محمود مہدوی دامغانی (تہران، مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳۶۱) ج ۲، ص ۱۲۸۔ مراجعہ کریں: ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ۱، ص ۵۱؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۵۶، جویہودی بعثت پیغمبر اسلا ﷺ م کے بارے میں اس طرح پیشین گوئی کرتے تھے، وہی بعثت پیغمبر ﷺ کے بعد ان سے دشمنی کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اس وجہ سے قرآن ان سے اس طرح سے معترض ہوا "اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی ہے جو ان کی توریت وغیرہ کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور اس کے پہلے وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اسی کے ذریعہ طلب فتح بھی کرتے تھے لیکن اس کے آتے ہی منکر ہوگئے حالانکہ اسے پہچانتے بھی تھے تو اب ان کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

چونکہ یہودیوں کے کلچر کا معیار بلند تھا اور بت پرست انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ لہٰذا اس سلسلے میں ان کی باتوں کو باور کرتے تھے اور چونکہ یہ دھمکیاں کئی بار دی گئیں تھیں لہذا مسئلہ مکمل طور سے اوس و خزرج کے ذھن میں جاگزیں ہوگیا تھا اور ذہنی طور پر مدینہ والے ظہور پیغمبر اسلا ﷺ م کے لئے آمادہ ہوگئے تھے۔

٢۔ برسوں پہلے سے اوس و خزرج کے درمیان کئی مرتبہ جنگ و خونریزی ہوچکی تھی ان میں سے آخری جنگ "بغاث" تھی جس کے نتیجہ میں بے انتہا جانی نقصانات او ربربادیاںدونوں طرف ہوئی تھیں اور دونوں گروہ نادم و پشیمان ہوکر صلح کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی معتبر اور بے طرف شخص نہیں مل رہا تھا جو ان کے درمیان صلح کرا سکے۔ عبد اللہ بن ابی جو خزرج کے بزرگوں میں سے تھاجنگ بعاث میں بے طرف ہوگیا اورچاہتا تھا کہ دونوں گروہ میں صلح کرا کے ان پر حکومت کرے اور اس کی تاج پوشی کے اسباب بھی مہیا ہو چکے تھے۔[۱] لیکن مکہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م سے اوس و خزرج کی ملاقاتوں نے (جن کا عنقریب ذکر کریں گے) واقعات کا رخ یکسر بدل دیا۔ اور عبد اللہ بن ابی اپنا مقام کھو بیٹھا۔

مدینہ کے مسلمانوں کا پہلا گروہ

مکہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کے ظاہری پیغام کے ابتدائی سالوں میں مدینہ کے لوگ مکہ کے مسافروں اور زائروں کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے آگاہ ہوگئے تھے اور ان میں سے کچھ آنحضرت ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوکر مسلمان ہوگئے لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ رحلت کرگئے یا قتل کر دیئے گئے تھے۔[۲] بہرحال وہ، لوگوں کو اسلام کی طرف نہیں بلا سکے تھے۔

---

(۱) طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ۵۸۰.

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۷۰۔ ۶۷؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۳۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج ۱، ص ۲۳۸؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۱۱۸.

بعثت کے گیارہویں سال پیغمبر ﷺ نے بزرگان خزرج میں سے چھ لوگوں کو حج کے موسم میں منیٰ میں دیکھا اور ان کو اسلام کی طرف دعوت دی ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: جان لو! یہ وہی پیغمبر ﷺ ہے جس کی بعثت سے یہودی ہمیں ڈراتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے پہلے اس کے دین کو قبول کرلیں۔ لہٰذا وہ سب اسلام لے آئے اور پیغمبر ﷺ سے کہا: ہم اپنی قوم کو دشمنی اور ٹکراؤ کی بدترین حالت میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ خداوند متعال آپ کے ذریعہ ان میں الفت ڈال دے گا۔ اب ہم مدینہ واپس جارہے ہیں اور ان کو اس دین کی طرف بلائیں گے۔ اگر ان لوگوں نے بھی اس دین کو قبول کرلیا تو کوئی بھی ہماری نظروں میں اپ سے زیادہ عزیز و محترم نہ ہوگا۔

اس گروہ نے مدینہ واپس جانے کے بعد لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نغمۂ اسلام پورے یثرب میں پھیل گیا اور کوئی گھر ایسا نہیں بچا جہاں پیغمبر اسلا ﷺ م کی باتیں نہ ہوتی ہوں۔[۱]

عقبہ کا پہلا معاہدہ

بعثت کے بارہویں سال مدینہ کے بارہ لوگوں نے حج کے موسم میں "عقبۂ منیٰ"[۲] کے کنارے رسول خدا ﷺ کی بیعت کی۔[۳] اس گروہ میں دس خزرجی اور دو اوسی تھے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں قبیلے گزشتہ کدورتوں کو بھول کر ایک دوسرے کے دوش بدوش اسلام کے پرچم تلے جمع ہوگئے تھے۔

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۷۳۔ ۷۰؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۳۵۔ ۲۳۴؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۱۲۸؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۹، ص ۲۵.

(۲) "عقبہ"

(۳) گزشتہ سال، بیعت کرنے والے ۵ افراد تھے جن میں ۷ افراد کا اور اضافہ ہوا

اور بیعت کی تھی کہ کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری اور زنا نہیں کریں گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، ایک دوسرے پر تہمت (زنا کا الزام) نہیں لگائیں گے نیک کاموں میں پیغمبر ﷺ کے حکم کی مخالفت نہیں کریں گے۔[۱]

پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس عہد کی پابندی کرنے والوں سے، اس کے عوض میں بہشت کا وعدہ کیا۔[۲]

وہ موسم حج کے بعد مدینہ آگئے اور پیغمبر ﷺ سے تقاضا کیا کہ ایک شخص کو ان کے شہر میں بھیجیں تاکہ وہ مدینہ کے لوگوں کو اسلام اور قرآن کی تعلیم دے۔ رسول خدا نے مصعب بن عمیر کو بھیجا۔[۳]

مصعب کی تبلیغ اور کوششوں سے مسلمانوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ مکہ کے اہم اور خاص لوگ اسلام کی مخالفت کے لئے کمر بستہ ہوگئے تھے مگر جوانوں اور مستضعفوں نے آپ کا استقبال کیا۔ لیکن مدینہ میں تقریباً اس کے بالکل برعکس ماحول تھا یعنی اہم اور خاص لوگ پیش قدم اور آگے تھے اور عوام ان کے پیچھے چل رہی تھی یہ ایک ایسا سبب تھا جس کی وجہ سے اسلام تیزی کے ساتھ اس شہر میں پھیلا۔

---

(۱) چونکہ اس عہد میں جنگ و جہاد کی بات نہیں ہوئی۔ لہذا اس کو "بیعۃ النساءٔ" کہا گیا جیسا کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس کے بعد فتح مکہ میں اس شہر کی مسلمان عورتوں سے اسی طرح کا عہدو پیمان کیا جس کا ذکر سورۂ ممتحنہ کی آیت ۱۲ میں ہوا ہے.

(۲) وہی حوالہ؛ ابن طبقات الکبریٰ ج ۱، ص ۲۲۰

(۳) مصعب، قریش کے ایک جوان اور قبیلہ بنی عبددار کے ایک ثروتمند اور مالدار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اوران کے والدین ان سے بہت محبت کرتے تھے لیکن مسلمان ہو جانے کی وجہ سے انھیں گھر سے نکال دیا اور مال و ثروت سے محروم کردیا، وہ ایک حقیقی اور انقلابی مسلمان تھے اوردوبار حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے (ابن اثیر، اسد الغابہ، ج ٤، ص ۳۷۰-۳٦۸)

عقبہ کا دوسرا معاہدہ

بعثت کے تیرہویں سال حج کے موسم میں ۷۵ افراد جن میں سے گیارہ افراد اوسی (اور بقیہ خزرجی) اور دو خاتون تھیں قافلۂ حج کے ساتھ مدینہ سے مکہ آئے اور ۱۲ ذی الحجہ کو "عقبۂ منیٰ" کے کنارے دوسرا عہد شب کی تاریکی میں (مخفی صورت میں) پیغمبر ﷺ کے ساتھ کیا۔ اس عہد میں انھوں عہد کیا کہ اگر پیغمبر ﷺ نے ان کے شہر کی طرف ہجرت کی تو وہ اسی طرح ان کی حمایت کریں گے جیسے وہ اپنی ناموس اور اولاد کی حمایت کرتے ہیں اور جن لوگوں سے پیغمبر ﷺ جنگ کریں گے ان سے وہ لڑیں گے۔ اس اعتبار سے اس بیعت کو "بیت الحرب" بھی کہا گیا ہے۔

عہد کے بعد پیغمبر ﷺ کے حکم سے بارہ افراد نمائندے کے طور پر (نقیب) انتخاب ہوئے (مرکزی کمیٹی) تاکہ مدینہ پلٹنے کے بعد ہجرت رسول خدا ﷺ کے زمانے تک ان کے امور کی سرپرستی کرسکیں۔[1]

اور یہ پیغمبر اسلا ﷺ م کی کارکردگی کا ایک طریقہ تھا اور موجودہ افراد کو منظم کرنے میں آپ کی سعی و کوشش تھی۔

عہد نامہ کے تمام ممبران کے نام تاریخ اسلام کی مفصل کتابوں میں تحریر ہیں۔

مدینہ کی طرف ہجرت کا آغاز

تمام مخفیانہ امور کے باوجود جو کہ پیغمبر ﷺ اور مدینہ والوں کے درمیان انجام پائے تھے، قریش اس بیعت سے آگاہ ہوکر بیعت کرنے والوں کی گرفتاری میں لگ گئے۔ مگر انھوں نے اتنی تیزی سے کام کیا کہ فوراً مکہ کو ترک کردیا اور صرف ایک شخص کے علاوہ کوئی گرفتار نہ ہوا۔

---

(۱) بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۴۰ ـ ۱۳۲؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ۹۰ ـ ۸۱؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۵۴ ـ ۲۴۰؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۳ ـ ۲۲۱؛ گزشتہ حوالہ، ص ۲۳۷؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۶۰ ـ ۵۹؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۱۹، ص ۲۶ ـ ۲۵.

اہل مدینہ کے کوچ کر جانے کے بعد قریش سمجھ گئے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے لوگوں کو اپنا حامی اور مدینہ میں اپنا ایک مرکز بنا لیا ہے لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ اور زیادہ سختی کرنا شروع کردی۔ اور حد سے زیادہ انھیں برا بھلا کہنے لگے اور اس قدر انھیں تکلیفیں پہنچائیں کہ ایک بار پھر (حبشہ کی ہجرت سے پہلے کی طرح) مکہ میں زندگی گزارنا دشوار ہوگیا۔[١]

اس بنا پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی اور فرمایا: مدینہ کی طرف کوچ کرو خداوند متعال نے انھیں تمہارا بھائی اور جائے امن قرار دیا ہے۔[٢] مسلمانوں نے ڈھائی مہینے کے اندر (نصف ذی الحجہ سے آخری صفر تک) آہستہ آہستہ ان تمام مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود جو قریش نے سرراہ کھڑی کر رکھی تھیں، مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اور مکہ میں پیغمبر ﷺ ، علی، ابوبکر اور چند افراد کے علاوہ کوئی مسلمان باقی نہ بچا۔

انصار کی تاریخ میں جو افراد مکہ سے مدینہ گئے "مہاجرین" او رمدینہ کے مسلمان جنھوں نے پیغمبر ﷺ کی مدد کی "انصار" کہلائے۔

پیغمبر ﷺ کے قتل کی سازش

مکہ کے مسلمانوں نے ہجرت کے بعد مدینہ میں قیام کیا ، ادھر قریش کے سردار سمجھ گئے کہ مدینہ رسول خدا ﷺ اوران کے چاہنے والوں کے لئے ایک مرکز اورپناہ گاہ بن چکا ہے اور وہاں کے لوگ رسول ﷺ کے

---

(١) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٢٥٧؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ٢، ص ٢٤١۔ ٢٤٠؛ ابن سعد گزشتہ حوالہ، ج ١، ص ٢٢٦؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ٢٦.

(٢) ان اللہ عزوجل قد جعل لکم اخواناًو داراً تأمنون بھا (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ٢، ص ١١١؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ١، ص ١٨٢؛ ابن کثیر، البدایہ و النہایہ، ج ٣، ص ١٦٩.

(٤) حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (انسان العیون) بیروت: دار المعرفہ) ج ٢، ص ١٨٩.

دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں اس وجہ سے وہ پیغمبر ﷺ کی ہجرت سے ڈرے کیونکہ اس چیز نے قریش کو چند خطرات سے روبرو کردیا تھا۔

۱۔ مسلمان ان کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے نئی صورت حال کے پیش نظر، حالات کے بارے میں پیش بینی اور حوادث کی راہ میں تاثیر گزاری قریش کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

۲۔ چونکہ اہل مدینہ پیغمبر ﷺ سے جنگ میں حمایت کا عہد کرچکے تھے لہٰذا اس بات کا امکان تھا کہ آنحضرت ﷺ انتقام کی خاطر ان کی مدد سے کہیں مکہ پر حملہ نہ کردیں۔(۱)

۳۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ جنگ نہیں ہوئی پھر بھی ان کے لئے ایک بڑا خطرہ لاحق تھا۔ کیونکہ مدینہ، قریش کے تاجروں کے لئے مناسب بازار تھا اور اس شہر سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد، بہت بڑا اقتصادی نقصان ان کو ہونے والا تھا۔

٤۔ مدینہ، مکہ سے شام کے تجارتی راستہ کے کنارے پر پڑتا تھا اور مسلمان اس راستے کو ناامن بنا کر کاروبار تجارت میں خلل ڈال سکتے تھے۔

یہ فکریں اور الجھنیں باعث بنیں کہ سرداران قریش "دار الندوہ" (قریش کے سازشوں کا اڈہ اور قصی کی نشانی) میں اکٹھا ہوئے اور چارہ جوئی میں لگ گئے۔

کچھ نے مشورہ دیا کہ حضرت محمد ﷺ کو شہر بدر یا قید کرلیا جائے لیکن یہ دو مشورے بعض دلیلوں کی بنیاد پر رد ہوگئے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ محمد ﷺ کو قتل کردیا جائے لیکن ان کو قتل کرنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ اس کے بعد بنی ہاشم سکون سے نہ بیٹھتے اور خون خواہی کے لئے کھڑے ہو جاتے اس بنا پر طے کیا کہ ہر قبیلہ سے ایک جوان تیار ہو، تاکہ راتوں رات سب ملکر محمد ﷺ پر حملہ کردیں اور ان کو بستر خواب پر ہی قتل کردیں۔ ایسی صورت میں قاتل ایک شخص نہیں ہوگا اور بنی ہاشم بھی خون خواہی کے لئے کھڑے نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے لئے ان تمام قبیلوں سے جو اس قتل میںشریک تھے، جنگ کرنی ناممکن ہوگی، لہٰذا

---

(۱) گزشتہ حوالہ.

وہ مجبور ہوکر خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ماجرا اسی پر تمام ہو جائے گا۔ قریش نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ربیع الاول کی پہلی شب کا انتخاب کیا ۔ خداوند عالم ان کی سازش کو اس طرح سے بیان کرتا ہے:

"اور پیغمبر آپ اس وقت کو یاد کریں جب کفار تدبیریں کرتے تھے کہ آپ کو قید کرلیں یا شہربدر کردیں یا قتل کردیں اور ان کی تدبیروں کے ساتھ ساتھ خدا بھی اس کے خلاف انتظام کر رہا تھا اور وہ بہترین انتظام کرنے والا ہے"۔[1]

پیغمبر اسلا ﷺ م کی ہجرت

پیغمبر اسلام ﷺ وحی کے ذریعہ "دار الندوہ" کی سازش سے آگاہ ہوئے اور حکم خدا ہوا کہ مکہ سے باہر چلے جائیں۔ رسول خدا ﷺ نے اپنی ماموریت سے علی کو آگاہ کیا اور فرمایا: "آج کی شب میرے بستر پر سوجاؤ اور میری سبزچادر اوڑھ لو"علی نے بے خوف و خطر اس ذمہ داری کو قبول کیا۔

پیغمبر ﷺ اس شب ابوبکر کے ساتھ "غار ثور" میں چلے گئے جو مکہ کے جنوبی علاقے (مدینہ کے مخالف سمت) میں واقع تھا۔ اور تین روز غار میں رہے تاکہ قریش ان کو پانے سے ناامید ہوجائیں اور راستہ پرامن ہو جائے اور آپ ہجرت کو جاری رکھ سکیں، خداوند عالم نے قرآن مجید میں پیغمبر ﷺ کی تنہائی اور بے یاوری کا ذکر فرمایا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک نصر کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا اور وہ بھی اضطراب و پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔ لیکن قریش اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود خدا کی قدرت سے پیغمبر ﷺ تک نہیں پہنچ سکے۔

---

(۱)"و اذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک و یمکرون و یمکر اللہ و اللہ خیر الماکرین" سورۂ انفال، آیت ۳۰.

"اگر تم پیغمبر ﷺ کی مدد نہ کرو گے تو ان کی مدد خدا نے کی ہے اس وقت جب کفار نے انھیں وطن سے باہر نکال دیا اور وہ ایک شخص کے ساتھ نکلے اور دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے پھر خدا نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر پر سکون نازل کردیا اور ان کی تائید ان لشکروں سے کردی جنھیں تم نہ دیکھ سکے اور اللہ ہی نے کفار کے کلمہ کو پست بنایا ہے اور اللہ کا کلمہ در حقیقت بہت بلند ہے۔ کہ وہ صاحب عزت و غلبہ بھی ہے اور صاحب حکمت بھی ہے"۔[۱]

عظیم قربانی

حضرت علی اس شب پیغمبر ﷺ کے بستر پر سوئے اور قریش کے مسلح افراد نے رات کی تاریکی میں پیغمبر ﷺ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور صبح سویرے ننگی تلواروں کے ساتھ گھر کے اندر گھس گئے، اسی عالم میں علی بستر سے اٹھ گئے اس وقت تک وہ لوگ اپنے منصوبے کو سو فیصد درست اور کامیاب سمجھ رہے تھے لیکن علی کو دیکھتے ہی انھیں سخت حیرت ہوئی اور وہ ان کی طرف لپکے، یہ دیکھ کر علی نے اپنی تلوار کھینچ لی اور مقابلہ کے لئے تیار ہوگئے جب انھوں نے پیغمبر ﷺ کے مخفی ہونے کی جگہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے بتانے سے انکار کردیا۔[۲]

---

(۱) سورۂ توبہ، آیت ٤٠.

(۲) دارالندوہ اور لیلۃ المبیت کا واقعہ الفاظ اور عبارتوں کے فرق کے ساتھ اختصار و تفصیل سے مندرجہ ذیل کتابوں میں نقل ہوا ہے۔

تاریخ الامم و الملوک، ج۲، ص۲٤٥۔ ۲٤۲؛ السیرۃ النبویہ، ج۲، ص۱۲۸۔ ۱۲٤؛ طبقات الکبریٰ، ج۱، ص۲۲۸۔ ۲۲۷؛ دلائل النبوۃ، ج۲، ص۱٤۹۔ ۱٤۷؛ انساب الاشراف، ج۱، ص۲٦۰۔ ۲٥۹؛ الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۱۰۳۔ ۱۰۱؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۳۲؛ اعلام الوریٰ، ص٦۱؛ امالی شیخ طوسی، ص٤٤۷۔ ٤٤٥ و ص٤۷۱۔ ٤٦۳؛ مناقب ابن شہر آشوب، ج۱، ص۱۸۳۔ ۱۸۲؛ مناقب خوارزمی، ص۷۳؛ کنز الفوائد کراجکی، ج۲، ص٥٥؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج۳، ص۱۸۰۔ ۱۷٥؛ السیرۃ النبویہ، ج۲، ص۲۰٦۔ ۱۸۹؛ تاریخ بغداد، ج۱۳، ص۱۹۲۔ ۱۹۱؛ بحار الانوار، ج۱۹، ص٦٥۔ ٤۷۔

اس رات جو شخص بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوتا اس کے بچنے کی امید نہیں تھی لیکن حضرت علی شعب ابوطالب میں بھی اکثر راتوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ سوتے تھے اور اپنے کو سپر قرار دیتے تھے اور خطرہ مول لیتے تھے تاکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان محفوظ رہ سکے خداوند عالم نے ان کی اس قربانی کو اس طرح بیان کیا ہے:

"اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے"۔[1]

مفسرین اور محدثین کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کی عظیم قربانی کے سلسلے میں "لیلۃ المبیت" میں نازل ہوئی۔[2]

حضرت علی نے اپنے ایک بیان میں قریش کی سازش کو ذکر کرنے کے بعد اس خطرناک رات میں اپنی حالت کو اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

"...پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ ان کے بستر پر سو جاؤں اور اپنی جان کو ان کے لئے سپر قرار دوں۔ بے خوف اس ماموریت کو میں نے قبول کیا، میں خوش تھا کہ آپ کی راہ میں قتل کیا جاؤں ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۲۰۷۔

(۲) فتال نیشاپوری، روضۃ الواعظین (بیروت: موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ط ۱، ۱۴۰۶ھ.ق)، ص ۱۱۷؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، ج۴، ص ۲۵؛ مومن شبلنجی، نور الابصار (قاہرہ: مکتبۃ المشھد الحسینی)، ص ۸۶؛ طبرسی، مجمع البیان، ج ۱، ص ۳۰۱؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابوالفضل ابراہیم (قاہرہ: داراحیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۱.)، ج۱۳، ص ۲۶۲؛ سبط ابن الجوزی، تذکرۃ الخواص (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸۳ھ.ق)، ص ۳۵؛ تقی الدین ابوبکر حموی، ثمرات الاوراق (حاشیہ المستطرف میں)، ص ۲۰؛ عبد الحسین امینی، الغدیر، ج ۲، ص ۸۰؛ مرحوم مظفر نے اہل سنت کے نامور علماء اور مفسرین جیسے ثعلبی، قندوزی، حاکم نیشاپوری، احمد ابن حنبل، ابو السعادات، غزالی، فخر رازی، اور ذہبی سے نقل کیا ہے کہ سبھی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

ہجرت کر گئے اور میں ان کے بستر پر لیٹا رہا۔ قریش کے مسلح افراد کو اس بات کا یقین تھا کہ پیغمبر ﷺ کو قتل کردیں گے لہٰذا وہ گھر میں گھس گئے اور جب وہاں پہنچے جہاں میں لیٹا تھا تو میں نے یہ دیکھ کر اور تلوار ہاتھ میں لے لی اور اپنا اس طرح دفاع کیا کہ خدا جانتا ہے اور لوگ بھی اس سے آگاہ ہیں"۔[۱]

قبا میں پیغمبر ﷺ کا داخلہ

رسول خدا ﷺ نے علی سے فرمایا کہ میری ہجرت کے بعد اپنے مکہ ترک کرنے سے پہلے، لوگوں کی جو امانتیں ان کے پاس ہیں اسے لوگونکو واپس کردیں۔[۲] اور ان کی دختر فاطمہ اور بنی ہاشم کے دوسرے چند افراد جو اس وقت تک ہجرت نہیں کرسکے تھے ان کی ہجرت کے مقدمات فراہم کریں۔[۳]

حضرت محمد ﷺ نے چوتھی ربیع الاول (بعثت کے چودھویں سال) غار کو مدینہ کے ارادہ سے ترک کیا[٤] اور اسی مہینے کی بارہویں تاریخ کو مدینہ کے باہر محلہ "قبا" میں قبیلۂ بنی عمرو بن عوف کے رہنے کی جگہ پہنچے[٥] اور چند روز علی کے انتظار میں وہاں ٹھہرے رہے* اور اس دوران ایک مسجد

---

(۱) صدوق، الخصال (قم: منشورات جامعہ المدرسین)، ج۲، ص ٣٦٧، باب السبعہ؛ مفید، الاختصاص (قم: منشورات جماعة المدرسین)، ص ١٦٥.

(۲) ابن ہشام، السیرة النبویہ، ج۲، ص ١٢٩؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٢٤٧؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج۱، ص ٢٦١؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص ١٨٣.

(۳) شیخ طوسی، الامالی (قم: دار الثقافہ، ط ۱، ١٤١٤ھ.ق)، ص٤٦٨؛ رجوع کریں: مفید، الاختصاص، ص١٤٧؛ تاریخ الخلفائ، ص ١٦٦؛ مجلسی، بحار الانوار، ج١٩، ص ٦٢۔

(٤) محمد بن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۱، ص ٢٣٢؛ مجلسی، بحار الانوار، ج١٩، ص٨٧۔

(٥) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ١٣٧؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ٢٤٨؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ٦٤؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص٢٦٣؛ بیہقی، دلائل النبوة، ترجمہ: محمود مہدوی دامغانی (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ١٣٦١)، ج۲، ١٧٢۔

* رسول اسلام ﷺ کے ٹھہرنے کی مدت میں اختلاف ہے۔

وہاں پر تعمیر کی۔[۱]

پیغمبر ﷺ کی ہجرت کے بعد علی تین دن مکہ میں ٹھہرے رہے اور اپنے فریضے کو بہ حسن و خوبی انجام دیا[۲] پھر اپنی والدۂ گرامی فاطمہ بنت اسد، فاطمہ زہرا دختر پیغمبر ﷺ اور فاطمہ دختر زبیر بن عبد المطلب کو دو دوسرے افراد کے ہمراہ لے کر قبا میں پیغمبر ﷺ سے جا ملے۔[۳]

پیغمبر ﷺ کا مدینہ میں داخلہ

حضرت علی کے قبا میں پہنچنے کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ بنی نجار (عبد المطلب کے مادری رشتہ دار) کے ایک گروہ کے ساتھ مدینہ گئے۔ راستہ میں قبیلہ بنی سالم بن عوف کے محلہ میں پہلی نماز جمعہ پڑھی۔ شہر میں داخل ہوتے وقت لوگوں نے بہت ہی پر جوش انداز میں آپ کا استقبال کیا۔ قبائل کے سرداروں اور بڑی شخصیتوں نے ناقۂ پیغمبر اکرم ﷺ کی زمام کو پکڑ کر آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے محلہ میں تشریف لے چلیں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: ناقہ کے راستہ کو خالی کردو اسے خدا کی جانب سے حکم ملا ہے وہ جہاں بیٹھے گا میں وہیں اتر جاؤں گا"

گویا رسول خدا ﷺ اپنی تدبیر اور حکمت عملی کے ذریعہ چاہتے تھے کہ (حجر اسود کے نصب کے فیصلہ کی طرح) ان کی میزبانی کا شرف و افتخار کسی خاص قبیلہ یا خاندان کو حاصل نہ ہو اور آئندہ سماج میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

آخر کار آنحضرت ﷺ کا اونٹ محلہ بنی نجار میں ابو ایوب انصاری خالد بن خزرجی کے گھر کے قریب بیٹھ گیا اس وقت (ایسی جگہ پر بیٹھا جو دو یتیموں کی تھی جہاں بعد میں مسجد النبی ﷺ بنی)۔

---

(۱) ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۸۵؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ص ۱٦٦ و ۱۷۲؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲٤۹۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۸؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۲٤۹۔

(۳) ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص ۱۸۳؛ رجوع کریں: اعلام الوریٰ، ص ٦٦؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳٤۔

پیغمبر اکرم ﷺ کے چاروں طرف بے شمار لوگ اکٹھا ہوگئے ہر ایک کی آرزو تھی کہ آنحضرت ﷺ کے میزبان ہم بنیں۔ ابوایوب انصاری آنحضرت ﷺ کے سامان سفر کو اپنے گھر لے گئے اور ساتھ میں آنحضرت ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ اور اس وقت تک وہاں آپ نے قیام کیا جب تک مسجد النبی اور اس کے ساتھ ہی آپ کی رہائش کے لئے حجرہ نہ بن گیا۔[۱]

ہجری تاریخ کا آغاز

ہجرت بڑی تبدیلیوں کی شروعات اور اسلام کی پیش رفت میں ایک اہم موڑ کا نام ہے کیونکہ اسی کے سایہ میں مسلمانوں نے گھٹن اور دشواریوں کے ماحول سے نکل کر آزاد ماحول میں قدم رکھا اور آزادی کے ساتھ ایک نقطہ پر متمرکز ہوگئے اور ایسے حالات میں یہ چیز ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اگر ہجرت انجام نہ پاتی تو مکہ میں اسلام گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتا اور ہرگز اسے ترقی نہ ملتی۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے سیاسی اور نظامی سرگرمیاں شروع کردیں اور اسلام جزیرۃ العرب میں پھیل گیا۔

اس بنا پر ہجرت، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا آغاز قرار پائی لیکن کس شخص نے پہلی مرتبہ اس تاریخ کی بنیاد ڈالی؟ اور کس وقت سے یہ تاریخ رائج ہوئی؟ مورخین اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ کام عمر بن خطاب کے زمانہ میں، اس کے ذریعہ سے اصحاب پیغمبر ﷺ کے مشورہ سے انجام پایا۔[۲]

---

(۱) گزشتہ حوالہ.

(۲) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج ۲، ص ۱۳۵؛ مسعودی، التنبیہ و الاشراف (قاہرہ: دار الصاوی للطبع والنشر، ص ۲۵۲؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۱۰؛ الشیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق (تالیف حافظ ابن عساکر) (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۳، ۱٤۰۷ھ.ق)، ج ۱، ص ۲٤۔ ۲۳۔

لیکن محققین اورتاریخ اسلام کے تجزیہ نگاروں کی تحقیقات سے پتہ چلتاہے کہ اس امر کے بانی خود پیغمبر اسلا ﷺ م تھے۔ اسلام کے بڑے مورخین کے ایک گروہ نے لکھا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ماہ ربیع الاول میں حکم دیا کہ اسی مہینہ سے تاریخ لکھی جائے۔[۱]

اس مطلب کے گواہ پیغمبر ﷺ کے کچھ خطوط، مکاتبات اور تاریخی دستاویزات ہیں جو تاریخی کتابوں سے ہم تک پہنچی ہیں اور ان کی تاریخ نگارش آغاز ہجرت سے ذکر ہوئی ہے اس کے دو نمونہ یہاں پیش ہیں:

۱۔ پیغمبر اسلا ﷺ م نے مُقنا کے یہودیوں سے ایک عہدو پیمان کیا اور اس پر آپ نے دستخط فرمائی اس کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ اس عہد نامہ کو علی بن ابی طالب نے ۹ھ میں تحریر کیا ہے۔[۲]

۲۔ پیغمبر اسلا ﷺ م نے نجران کے مسیحیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا اس میں بھی یہ ذکر ہوا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے علی کو حکم دیا کہ اس میں لکھو کہ یہ پیمان ۵ھ میں لکھا گیا ہے۔[۳]

بعض قرائن اور شواہد کی بنا پر ۵ھ تک ہجرت کو اصل اور بنیاد بنا کر واقعات اور روداد و حوادث کو مہینوںکی تعدا کے لحاظ سے لکھا جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں: "ماہ رمضان کا روزہ تغییر قبلہ کے ایک ماہ بعد، ہجرت کے

---

(۱)طبری، تاریخ الامم و الملوک، (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۲، ص۲۵۲؛ نور الدین السمہودی، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط۳، ۱٤۰۱ھ.ق)، ج۱، ص۲٤۸؛ مجلسی، بحار الانوار، ج٤۰، ص۲۱۸، ابن شہر آشوب کی نقل کے مطابق۔

(۲) بلاذری، فتوح البلدان (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۸ھ.ق)، ص ۷۲۔ ۷۱؛ اس سند کے اصل متن یںعلی بن ابی طالب (واؤ کے ساتھ) لکھا ہوا ہے جس کی وجہ تاریخ کی کتابوں میں بتائی گئی ہیں۔ رجوع کریں: الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج۳، ص ٤۸۔ ٤٦.

(۳)الشیخ عبدالحی الکتانی، الترتیب الاداریہ (بیروت: دار احیاء التراث العربی)، ج۱، ص۱۸۱۔

اٹھارویں مہینہ میں واجب ہوا ہے۔(۱)

۲۔ سفیان بن خالد سے جنگ کے لئے بھیجے ہوئے لشکر کا کمانڈر عبد اللہ بن اُنَیس کہتا ہے کہ میں پیر کے دن پانچ محرم کو ہجرت کے پچاسویں مہینے میں مدینے سے نکلا۔(۲)

۳۔ محمد بن مسلمہ قبیلۂ قرطا(۳) سے جنگ کے بارے میں لکھتا ہے: میں دس محرم کو مدینہ سے باہر گیا اور انیس دن کے بعد محرم کی آخری رات ، ہجرت کے ۵۵ویں مہینے میں، مدینہ واپس آیا۔(۴)

اس بنا پر ہجری، تاریخ کے بانی پیغمبر اسلا ﷺ م ہی تھے۔ لیکن شاید خلافت عمر کے دور تک ا سے بہت زیادہ شدت اور عمومیت نہیں مل سکی تھی۔(۵) اور چونکہ عمر کے دور میں زمان حوادث اور بعض دستاویزات اور مطالبات کی تاریخ میں اختلاف کی کچھ صورتیں پیش آئیں۔(۶) لہذا انھوں نے اس مسئلے کو ۱۶ ھ میں قانونی شکل دی اور ربیع الاول (مدینے میں پیغمبر کے داخلے کا مہینہ)کے بجائے ماہ محرم کو ہجری سال کا آغاز قرار دیا۔(۷)

---

(۱) الشیخ حسن الدیار بکری، تاریخ الخمیس، (بیروت: مؤسسة شعبان)، ج ۱، ص ۳۶۸۔

(۲) واقدی، المغازی، تحقیق: مارسڈن جانس (بیروت: مؤسسة الاعلمی للمطبوعات)، ج ۲، ص ۵۳۱۔

(۳) بنی بکر کا ایک خاندان ہے۔

(۴) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۵۳۴۔

(۵) سید جعفر مرتضی عاملی، الصحیح من سیرة النبی الاعظم، ج ۳، ص ۵۵.

(٦) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۵۲؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (بیروت: مکتبة المعارف ط ۲، ۱۳۹٤ھ.ق)، ج ۷، ص ۷٤۔ ۷۳؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹٦۱م)، ج ۱۲، ص ۷٤؛ ابن کثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۱، ص ۱۱۔۱۰.

(۷) ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب ، ج ۱، ص ۱۷۵؛ الصحیح من سیرة النبی الاعظم، ج ۳، ص ۳۵؛ مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: الصحیح من سیرة النبی الاعظم، ج ۳، ص ٥٦۔ ۳۲.

دوسری فصل

مدینہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کے سیاسی اقدامات

مسجد کی تعمیر

پیغمبر اسلا ﷺ م نے مدینہ میں[۱] قیام کے بعد یہ ضرورت محسوس کی کہ ایک مسجد بنائی جائے جو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا سینٹر اور نماز جمعہ اور جماعت کے وقت جمع ہونے کی جگہ قرار پائے۔ اس وجہ سے آپ ﷺ نے اس زمین کو جہاں پہلے دن آپ کا اونٹ بیٹھا تھا اور وہ دو یتیموں کی تھی ان کے اولیاء سے خریدی اور مسلمانوں کی مدد سے وہاں ایک مسجد تعمیر کی[۲] جو آپ کے نام یعنی "مسجد النبی" کے نام

---

(۱) یاقوت حموی، معجم البلدان (بیروت: داراحیاء التراث العربی، ۱۳۹۹ھ.ق)، ج۵، ص ۴۳۰، (لغت: یثرب)

(۲) محمد بن سعد، طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج۱، ص ۲۳۹؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۲، ص ۲۵۶؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ترجمہ محمود مہدی دامغانی (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳۶۱)، ج۲، ص ۱۸۷؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج۱، ص ۱۸۵؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبۃ المعارف، ط ۲، ۱۹۷۷.)، ج۳، ص ۲۱۵؛ الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیہ، (انسان العیون)، (بیروت: دار المعرفہ، ج۲، ص ۲۵۲؛ مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ج۱۹، ص ۱۲۴.

سے مشہور ہوئی۔ ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ کا یہ پہلا اجتماعی اقدام تھا۔ مسجد کی تکمیل کے بعد، اس کے پہلو میںدو کمرے آنحضرت ﷺ اور آپ کی ازواج کے رہنے کے لئے بنائے گئے۔[۱] اس کے بعد آنحضرت ﷺ ابوایوب کے گھر سے وہاں چلے گئے۔[۲] اور آخری عمر تک اسی کمرے میں زندگی بسر کی۔

اصحاب صُفّہ

مسلمانوں کے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد، انصار نے مہاجر مسلمانوں کو جہاں تک ہوسکا اپنے گھروں میں ٹھہرایا اور ان کے لئے زندگی کی سہولتیں فراہم کیں۔[۳]

لیکن اصحاب صفہ جوایک فقیر، مسافر بے گھر اور ہر لحاظ سے محروم طبقہ تھا ان کے رہنے کے لئے مسجد کے آخر میں وقتی طور پر ایک سائبان بنادیا گیا تھا۔

پیغمبر اسلا ﷺ م ان کی خبرگیری فرماتے تھے اور جہاں تک ہوسکتا، ان کے لئے کھانے کی چیزیں فراہم کرتے تھے اور انصار کے سرمایہ داروں کو ان کی مدد کے لئے تشویق کرتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ جو انقلابی، مومن اور خوبیوں کا مالک تھا "اصحاب الصفہ" کے نام سے معروف ہوا۔[٤]

---

(۱) ایک کمرہ سودہ اور ایک کمرہ عائشہ کے لئے بنایا گیا (محمد بن سعد، سابق، ص ۲٤۰؛ حلبی، سابق، ص ۲۷۳)

(۲)ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، (قاہرہ: مطبعۃ المصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج۲، ص۱٤۳؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص۱۸٦۔

(۳)ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج۲، ص۳٤۔

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۲۵۵؛ نور الدین السمہودی، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی (بیروت: داراحیاء التراث العربی، ط۳، ۱٤۰۱ھ.ق)، ج۲، ص٤۵۸۔ ٤۵۳؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۷، ص۸۱؛ ج۲۲، ص٦٦، ۱۱۸، ۳۱۰، ج۷۰، ص۱۲۹۔ ۱۲۸، ج۷۲، ص۳۸؛ رجوع کریں: مجمع البیان، ج۲، ص۳۸٦، تفسیر آیۂ: "للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لایستطیعون ضربًا فی الارض..." (سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۳) و عبدالحی الکتانی، التراتیب الاداریہ، ج۱، ص٤۸۰۔ ٤۷۳۔

اس گروہ کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ جن کے رہنے کا انتظام ہو جاتا تھا وہ وہاں سے چلے جاتے تھے اور دوسرے نئے افراد آکر ان میں شامل ہو جاتے تھے۔[۱]

عام معاہدہ

پیغمبر اسلا ﷺ م نے مدینہ میں قیام کے بعد ضرورت محسوس کی کہ لوگوں کی اجتماعی حالت کو منظم کریں؛ کیونکہ آپ کے بلند اہداف کی تکمیل کے لئے شہر کی تنظیم ضروری تھی جبکہ اس وقت مدینہ کی آبادی کی ترکیب غیر مناسب تھی۔ عرب کے متعدد گروہ اس شہر میں رہتے تھے اور ان میں سے ہر فرد دو بڑے قبیلہ اوس و خزرج میں سے کسی ایک سے تعلق رکھتا تھا۔ یہودی بھی اسی شہر میں ان کے اطراف میں بسے ہوئے تھے اور ان سے تعلقات رکھتے تھے اور اب مکہ کے مسلمان بھی ان میں اکثر بڑھ گئے تھے اس عالم میں ممکن تھا کہ کوئی حادثہ پیش آجائے اسی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کی تدبیر سے ایک پیمان نامہ لکھا گیا جسے اسلام میں "پہلا اساسی قانون" یا سب سے بڑی قرارداد اور تاریخی دستاویز کہا گیا۔

اس قرارداد نے مدینہ میں رہنے والے مختلف گروہوں کے حقوق معین کئے اور یہ قانون شہری آبادی میں مسالمت آمیز زندگی اور ان کے درمیان نظم و عدالت کو برقرار رکھنے کا ضامن بنا اور ہر طرح کے ہنگامے اور اختلاف کے جنم لینے سے مانع بنا۔ اس عہدنامہ کے چند اہم بند یہ تھے:

---

(۱) ابو نعیم اصفہانی، حلیۃ الاولیاء (بیروت: دار الکتاب العربی، ط ۲، ۱۳۸۷ھ.ق)، ج ۱، ص ۳۴۰- ۳۳۹؛ ابو نعیم نے اصحاب صفہ کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (حلیۃ الاولیائ، ج ۱، ص ۳۸۵- ۳۴۷)، اس نے اس گروہ کی تعداد ۵۱ افراد بتائی ہے اور ان میں سے ہر ایک کا ذکر کیا ہے۔ (ان میں کچھ عورتوں کے نام بھی ملتے ہیں)۔ لیکن ان میں سے کچھ کو اصحاب صفہ میں شمار نہیں کیا ہے۔ جن افراد کو ابو نعیم نے اس گروہ میں شمار کیا ہے ۔ وہ یہ ہیں: بلال، براء بن مالک، جندب بن جنادہ، حذیفہ بن یمان، جناب بن الارت... ذوالبجاین، (عبد اللہ) سلمان، سعید بن ابی وقاص، سعد بن مالک، (ابو سعید خدری)، سالم (مولا ابی حذیفہ) اور عبد اللہ بن مسعود۔

۱۔ مسلمان اوریہودی[۱] ایک امت ہیں۔

۲۔ مسلمان اوریہودی اپنے دین کی پیروی میں آزادہیں۔

۳۔ قریش کے مہاجرین، اسلام سے قبل اپنی سابق رسم (یعنی خون بہا دینے) پر باقی رہیں گے اگر ان کا کوئی فرد کسی کو قتل کرے یا اسیر ہو تو عدالت اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت سب مل کر اس کا خون بہا دیں اور فدیہ دے کر اسے آزاد کرائیں۔

٤۔ بنی عمرو بن عوف (انصار کا ایک قبیلہ) اور تمام دوسرے قبیلہ بھی خون بہا اور فدیہ کے سلسلہ میں اسی طرح عمل کریں۔

٥۔ کوئی یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ کسی کے غلام، فرزند یا خاندان کے کسی دوسرے فرد کو بغیر اس کی اجازت کے پناہ دے۔

٦۔ اس عہدنامہ پر دستخط کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ سب مل کر شہر مدینہ کا دفاع کریں۔

۷۔ مدینہ ایک مقدس شہر ہے اس میں ہر طرح کا خون خرابہ حرام ہوگا۔

۸۔ اس عہدنامہ پر دستخط کرنے والوں میں اگر کبھی اختلاف پیدا ہوا تو اس اختلاف کو دور کرنے والے محمد ﷺ ہوں گے۔[۲]

سلسلۂ حوادث کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پیمان (جو پیغمبر ﷺ کے مدینہ آنے کے ابتدائی مہینوں میں انجام پایا تھا)،[۳] شہر کے امن و سکون میں موثر ثابت ہوا؛ کیونکہ ۲ھ تک یعنی جنگ بدر کے بعد تک "بنی قینقاع" کی فتنہ پردازیوں کی بنا پر اس قبیلہ سے جو جنگ ہوئی، کوئی کشیدگی اہل مدینہ کے درمیان نقل نہیں ہوئی ہے۔

---

(۱) یہاں پر یہودی سے مراد، بنی عمرو بن عوف اور مدینہ کے تمام مقامی یہودی ہیں لیکن یہودیوں کے تین قبیلے، بنی قینقاع، بنی نضیر، اور بنی قریظہ سے پیغمبر اسلا ﷺ م نے الگ پیمان کیا تھا جس کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔

(۲) ابن ہشام، سابق، ج۲، ص ۱۵۰ ۔ ۱٤۷؛ اس عہدنامہ کے بندوں سے تفصیلی آگاہی کے لئے، رجوع کریں: فروغ ابدیت ، ج ۱، ص ٤٦٥۔ ١٦٢

(۳) اسلامی مورخین نے اس عہد و پیمان کی تنظیم مدینہ میں پیغمبر اکرم ﷺ کے پہلے خطبہ کے بعد نقل کی ہے لہٰذا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کا مدینہ میں اس عہد و پیمان کا منعقد کرنا، آپ کے ابتدائی اقدامات کا جزتھا۔

مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارگی کا معاہدہ

ہجرت کے پہلے سال[۱] پیغمبر اکرم ﷺ نے دوسرا اہم اجتماعی اقدام یہ کیا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان رشتہ اخوت و برادری برقرار کیا۔ ماضی میں مسلمانوں کے ان دو گروہوں میں پیشہ اور نسل کے لحاظ سے تفاوت اور کشمش پائی جاتی تھی؛ کیونکہ انصار، جنوب (یمن) سے ہجرت کر کے آئے تھے اور انکا تعلق "قحطانی" نسل سے تھا۔ اور مہاجرین، عرب کے شمالی حصہ سے آئے اور ران کا تعلق "عدنانی" نسل سے تھا اوردور جاہلیت میں، ان دونوں کے درمیان نسلی کشمش پائی جاتی تھی۔

دوسری طرف سے انصار کا مشغلہ کاشتکاری اور باغ بانی تھا۔ جبکہ مکہ کے عرب، تاجر تھے اور کاشتکاری کو ایک پست مشغلہ سمجھتے تھے۔ اس سے قطع نظریہ دونوں گروہ دو الگ ماحول کے پروردہ تھے اور اب نور اسلام کے سبب آپس میں دینی بھائی ہو گئے تھے۔[۲] اور ایک ساتھ مدینہ میں رہتے تھے۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں قدیمی عصبیت نہ بھڑک اٹھے کیونکہ مسلمانوں کے ان دو گروہوں میں گزشتہ افکار و خیالات اور کلچر کے اثرات ابھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں باقی رہ گئے تھے۔ لہٰذا پیغمبر اسلا ﷺ م نے ان دو گرہوں کے درمیان رشتہ اخوت و برادری برقرار کیا اور ہر مہاجر کو، انصار میں سے کسی ایک کا بھائی[۳]

---

(۱) ہجرت کے پانچ یا آٹھ مہینے بعد (سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۶۸؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۹، ص ۱۳۰، حاشیہ مقریزی کے نقل کے مطابق)

(۲) "انما المومنون اخوۃ" سورۂ حجرات، آیت ۱۰۔

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۱۵۰؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۳۸؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۹۲؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۱۹، ص ۱۳۰؛ یہ دینی برادری اور دینی تعاون کی بنیاد پر تھی جیسا کہ روایت میں بیان ہوا ہے کہ اخی رسول اللہ بین الانصار و المہاجرین، اخوۃ الدین (طوسی، امالی، (قم: دار الثقافہ، ۱٤۱٤ھ.ق)، ص ۵۸۷.

بنایا اور علی کو اپنا بھائی بنایا۔[1]

البتہ مہاجرین و انصار کے درمیان رشتۂ اخوت و برادری برقرار کرنے میں ایمان و فضیلت کے لحاظ سے ایک طرح کے تناسب اور برابری کا لحاظ رکھا گیا[2] اور پیغمبر اسلام ﷺ کا رشتۂ اخوت علی سے قائم ہوا جبکہ دونوں مہاجر تھے لہٰذا اس زاویۂ نظر سے یہ بات قابل توجیہ و تاویل ہے۔

یہ عہد و پیمان مہاجروں اور انصار کے درمیان مزید اتحاد و اتفاق کا باعث بنا جیسا کہ انصار نے پہلے سے زیادہ، مہاجروں کی مالی امداد کے لئے تیار ہوگئے۔ اور مال غنیمت کی تقسم کے موقع پر "بنی نضیر"

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۱۵۰؛ عسقلانی، الاصابہ تمیز الصحابہ (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط۱، ۱۳۲۸ھ.ق)، ج۲، ص۵۰۷؛ الشیخ سلیمان القندوزی الحنفی، ینابیع المودۃ (بیروت: مؤسسۃ الاعلی للمطبوعات)، ج۱، باب۹، ص۵۵؛ سبط ابن الجوزی، تذکرۃ الخواص (نجف: المطبعۃ الحیدریہ، ۱۳۸۳ھ.ق)، ص۲۰، ۲۲، اور ۲۳ کتاب فضال میں احمد ابن حنبل کی نقل کے مطابق؛ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، (الاصابہ کے حاشیہ)، ج۳، ص۳۵؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۲۹۲؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۲۶۸؛ المظفر، دلائل الصدق (قم: مکتبہ بصیرتی)، ج۲، ص۲۷۱ ـ ۲۶۸۔

(۲) شیخ سلیمان قندوزی، گزشتہ حوالہ، ج۱، باب۹، ص۵۵ احمد حنبل کے نقل کے مطابق؛ امینی، الغدیر، ج۳، ص۱۱۲؛ مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ۱۴۰۳ھ.ق)، ج۳، ص۶۰؛ طوسی، الامالی، ص۵۸۷۔

وہ حدیثیں جو یہ بیان کرتی ہیں کہ اس عہد و پیمان میں حضرت علی کی اخوت رسول خدا ﷺ کے ساتھ برقرار ہوئی ہے وہ، حدیث شناسی کے معیار کے مطابق قابل انکار نہیں ہیں۔ اس بنا پر ابن تیمیہ اور ابن کثیر کی باتیں اس سلسلہ میں ان کے خاص جذبہ اور فکر کی دین ہے اور علمی حیثیت نہیں رکھتی ہیں ۔ رجوع کریں: الغدیر، ج۳، ص ۱۲۵ ـ ۱۱۲، ۱۷۴ ـ ۲۲۷، و ج۷، ص ۳۳۶.

نے مہاجروں کی خاطر اپنے حق کو نظر انداز کردیا۔[۱] اور بارگاہ پیغمبر ﷺ میں مہاجروں کی طرف سے ان کی کوششوں کا شکریہ، پیغمبر ﷺ کے لئے حیرت آور تھا۔[۲] خداوند عالم نے اس موقع پر انصار کی ایثارگری کو اس طرح سراہا ہے۔

"یہ مال ان مہاجر فقراء کے لئے بھی ہے جنھیں ان کے اموال سے محروم اور گھروں سے نکال باہر کردیا گیا ہے اور وہ صرف خدا کے فضل اور اس کی مرضی کے طلبگار ہیں اور خدا و رسول کی مدد کرنے والے ہیں کہ یہی لوگ دعوئے ایمان میں سچے ہیں۔ اور جن لوگوں نے دارالہجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انھیں دیا گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں اور اپنے نفوس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں، چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ اور جسے بھی اس کے نفس کی حرص سے بچالیا جائے وہی لوگ نجات پانے والے ہیں"۔[۳]

صحرا نشینوں کا مزاج دو طریقے کا تھا ایک طریقہ ان کا یہ تھا کہ وہ اپنے قبیلہ کے اندر اپنے اعزاء و اقرباء کی مدد و نصرت کرتے تھے۔ پیغمبر اسلا ﷺ م نے ان کی اس خصوصیت کو اسلامی وحدت اور اتفاق کی راہ میں استعمال کیا (کہ مہاجروں کے ساتھ انصار کی ایثار و قربانی اس کا ایک جلوہ ہے) اور ان کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ان کے مزاج میں، بیگانہ افراد سے جنگ و جدال کرنا تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان کے اس جذبہ

---

(۱) واقدی، المغازی، تحقیق: مارسڈن جانس، (بیروت: مؤسسة الاعلی للمطبوعات)، ج ۱، ص ۳۷۹؛ ابن شبہ، تاریخ المدینة المنورة، تحقیق: فہیم محمد شلتوت (قم: دار الفکر، ۱٤۱۰ھ.ق)، ج ۲، ص ۲۸۹۔

(۲) مسند احمد، ج ۳، ص ۲۰٤؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۹۲؛ ابن کثیر، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۲۲۸؛ ابن شبہ، گزشتہ حوالہ، ص ٤۹۰۔

(۳) سورۂ حشر، آیت ۹ ۔ ۸۔

کو دشمنان اسلام سے جنگ کرنے میں اور ان کے حملوں کا دفاع کرنے میں استعمال کیا۔[1]

---

(۱) "محمد رسول اللہ و الذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم" (سورۂ فتح، آیت ۲۹.)

یہودیوں کے ان تین قبیلوں کے اصلی وطن اور نسب کے بارے میں مورخین کے درمیان اتفاق نظر نہیں پایاجاتا اس سلسلہ میں تاریخی اخبار و اسناد کی آشفتگی اور تناقض کے باعث، حقیقت کی تعیین بہت مشکل و دشوار ہوگئی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ جب شام میں یہودیوں کے اوپر، شہنشاہ روم کی جانب سے سختی اور دباؤ بڑھا تو وہ جزیرۃ العرب کی سمت مدینہ میں چلے گئے اور وہاں جاکر بس گئے۔ (معجم البلدان، ج۵، ص ۸۴، لغت مدینہ، وفاء الوفاء، ج ۱، ص ۱۶۰)، قحطانی (اوس و خزرج) مارب بند ٹوٹنے کے بعد وہاں گئے اور اس کے کنارے جاکر بس گئے۔ (معجم البلدان، ج ۱، ص ۳۶؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، (بیروت: دار صادر، ج ۱، ص ۶۵۶) اور جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کرچکے ہیں کہ ان دو گروہوں کے درمیان آپس میں کشمکش پائی جاتی تھی۔ لیکن کچھ مورخین کا عقیدہ ہے کہ وہ جزیرۃ العرب کے مقامی عرب تھے اور یہودیوں کی تبلیغات کے نتیجہ میں اس دین کو انھوں نے اپنالیا تھا۔ (احمد سوسہ، مفصل العرب والیھود فی التاریخ، (وزارۃ الثقافہ و الاعلام العراقیہ، ط ۵، ۱۹۸۱ عیسوی)، ص ۶۲۹۔ ۶۲۹)، اور بعض دوسرے مورخین کا کہنا ہے کہ مدینہ میں یہودیوں کے بسنے کی تاریخ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بتائی گئی ہے جو ایک افسانہ اور من گڑھت قصہ ہے (معجم البلدان، ج۵، ص ۸۴؛ وفاء الوفاء، ج ۱، ص ۱۵۷) اور بعض تاریخی کتابوں و نیز کچھ روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ ان کو پیغمبر ﷺ کی نشانیوں کے سلسلہ میں جو آگاہی تھی اس کی بنا پر وہ آپ کے محل ہجرت کی تلاش میں، فدک، خیبر، تیماء اور یثرب (مدینہ) گئے اور وہاں جاکر بس گئے۔ (معجم البلدان، ج۵، ص ۸۴؛ وفاء الوفائ، ج ۱، ص ۱۶۰؛ کلینی، الروضہ من الکافی، ص ۳۰۹؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۵، ص ۲۲۶) یہ مفہوم، پہلے نظریہ کے مطابق اور اس کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ وہ لوگ روم کے دباؤ کے بعد، پیغمبر اسلا ﷺ م کے عنقریب مبعوث ہونے کے سلسلہ میں جو خبریں رکھتے تھے) اس کی بنا پر وہ اس علاقہ کی طرف چلے گئے ہوں اور روایتیں بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں۔ (عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، تالیف ابن عساکر، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۳، ۱۴۰۷ ھ.ق)، ج ۱، ص ۳۵۱؛ وفاء الوفاء، ج ۱، ص ۱۶۰)، یہودیوں کے ان تین قبیلوں کے نسب کے بارے میں بھی (گزشتہ حاشیہ کا بقیہ)۔ اختلاف نظر پایا جاتا ہے کہ کیا یہ بنی اسرائیل کے یہودیوں میں سے تھے یا عرب نسل کے تھے؟ کچھ لوگ دوسرے نظریہ پر زور دیتے ہیں۔ (احمد سوسہ، گزشتہ حوالہ، ص ۶۲۷)۔ یعقوبی بھی قبیلۂ بنی نضیر اور بنی قریظہ کو، نسل عرب سے قرار دیتا ہے۔ (تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۴۲۔ ۴۰؛ رجوع کریں: وفاء الوفائ، ج ۱، ص ۱۶۲) شاید یہ کہا جاسکتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہودیوں کو "بنی اسرائیل" کے عنوان سے خطاب کیا گیا ہے جو کہ جزیرۃ العرب کے یہودیوں پر بھی صادق آتا تھا اور نیز پیغمبر اسلا ﷺ م سے یہودیوں کی مخالفت اس نسلی جذبہ کے تحت کہ وہ بنی اسرائیل سے نہیں ہیں اور اسی طرح عرب کے علمائے نساب کی جانب سے ان کے نسب کو بیان نہ کیا جانا (جبکہ ان کا سارا دارومدار قبائل عرب کے نسب کی حفاظت پر تھا) ایسا قرینہ ہے جو پہلے نظریہ کے درست ہونے کو بتاتا ہے۔ بہرحال چونکہ اس سلسلہ میں مزید تنقید و تحقیق اس کتاب کے دائرہ سے باہر ہے لہٰذا اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں.

یہودیوں کے تین قبیلوں کے ساتھ امن معاہدہ

پیغمبر اسلا ﷺ م نے عمومی عہد و پیمان کے علاوہ، (جس میں اوس و خزرج کے علاوہ یہودیوں کے یہ دو قبیلے بھی شریک تھے) یہودیوں کے تینوں قبیلوں بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ میں سے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ عہد و پیمان کیا کہ جس کو "پیمان عدم تجاوز" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان کرچکے ہیں کہ یہ تینوں قبیلے مدینہ اور اس کے اطراف میں زندگی بسر کرتے تھے اور یہ لوگ اس پیمان میں پابند ہوئے تھے کہ مندرجہ ذیل چیزوں پر عمل کریں گے:

۱۔ مسلمانوں کے دشمن کی مدد نہیں کریں گے اور ان کو اسلحہ، سواری اور جنگی وسائل نہیں دیں گے۔

۲۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے ضرر میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ اور علی الاعلان اور چھپ کر کسی طرح سے انھیں ضرر نہیں پہچائیں گے۔

۳۔ اگر اس معاہدہ کے برخلاف انھوں نے عمل کیا تو پیغمبر اسلام ﷺ کو ہر طرح کی سزا دینے کا حق ہے چاہے وہ، ان کو قتل کریںیا ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کریں یا ان کی جائیداد ضبط کرلیں۔

اس معاہدہ پر ترتیب وار تینوں قبیلوں کے سرداروں نے یعنی "مخیریق، حی بن اخطب، اور کعب ابن اسد" نے دستخط کئے۔[1]

گویا اس وقت یہودیوں کو مسلمانوں کی طرف سے خطرے کا احساس نہیں تھا۔ یا اپنے لئے بے طرفی بہتر سمجھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اسلام کے دوسرے دشمن، مسلمانوں کی شکست کے لئے کافی ہیں۔ لہٰذا اس طرح کے عہد و پیمان کے کرنے میں وہ پیش قدم تھے۔[2]

---

(۱) طبری، اعلام الوری باعلام الهدیٰ (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط۳)، ص۶۹؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۹، ص ۱۱۱-۱۱۰؛ رجوع کریں: واقدی، مغازی، ج ۱، ص۱۷۶، ۳۶۵، ۳۶۷ و ج ۲، ص۴۵٤؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص ۲۳۱؛ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص۴۳۔ بعد میں پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس عہدنامہ کی رو سے انہیں سزائیدیں۔

(۲) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ۶۹ اور ۱۱۰.

ان اقدامات کی وجہ سے مدینہ اوراس کے اطراف کا ماحول پرامن ہوگیا تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ فتنہ و آشوب سے بے فکر ہوگئے تھے۔ اور وقت اس بات کا آگیا تھا کہ قریش کے خطرے سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی چارہ اور تدبیر اپنائیں اور ایک نئے معاشرے کی بنیاد کے مقدمات فراہم کریں۔

منافقین

یہودیوں کے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ بھی پیغمبر ﷺ کی ہجرت کے بعد مدینہ میں وجود میں آئے کہ قرآن نے ان کو "منافقین" کہا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بظاہر اپنے کو مسلمان کہتے تھے لیکن در حقیقت یہ بت پرست(۲) اور ان میں بعض یہودی(۳) تھے۔

ان لوگوں نے جب اسلام کی روز بروز بڑھتی ہوئی قدرت کو دیکھا اور علی الاعلان مقابلہ کرنے سے عاجز ہوگئے تو بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر خود کو مسلمانوں کی صفوں میں داخل کردیا۔

منافقین، یہودیوں سے راز و نیاز رکھتے تھے اور چھپ کر مسلمانوں کے خلاف ساز شینکرتے تھے۔ ان کا سرغنہ اور لیڈر عبد اللہ ابن ابی تھا جس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ مدینہ میں اس کی رہبری کے مقدمات فراہم ہوچکے تھے لیکن پیغمبر اسلا ﷺ م کے تشریف لانے سے مدینہ کے سیاسی حالات بدل گئے اور وہ اس مقام پر پہنچنے سے محروم ہوگیا۔ اور اس کے دل میں پیغمبر ﷺ کے لئے

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۶۰ اور ۱۶۶؛ نویری، نہایۃ الارب، ترجمہ: محمود مہدی دامغانی (تہران انتشاراتا میر کبیر، ط ۱، ۱۳۶٤)، ج ۱، ص ۳۳۲.

(۲) حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (انسان العیون)، (بیروت: دار المعارفہ)، ج ۱، ص ۳۳۷؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۹؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷٤.

کینہ و حسد پیدا ہوگیا۔[1]

منافقین کی تخریب کاریاں اس قدر زیادہ تھیں کہ قرآن نے مختلف سوروں میں جیسے، بقرہ، آل عمران، توبہ، نسائ، مائدہ، انفال، عنکبوت، احزاب، فتح، حدید، منافقون، حشر و تحریم میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے، لہٰذا پیغمبر ﷺ کی لڑائی اس گروہ سے، مشرکوں اور یہودیوں سے زیادہ مشکل اور سخت تھی۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے سامنے، اپنے کو مسلمان بتاتے تھے لہٰذا پیغمبر اکرم ﷺ اسلام کے ظاہری حکم کے تحت ان سے جنگ نہیں کرسکتے تھے۔ اسلام کے خلاف اس گروہ کی خراب کاریاں، منظم طریقے سے ایک گروپ کی شکل میں، عبد اللہ ابن ابی کی موت (۹ ھ)،[2] تک اسی طرح جاری رہیں۔ لیکن اس کے بعد سست اور بہت کم ہوگئیں۔

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۳۸۔ ۲۳۷؛ بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۱۶۵؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۳۸؛ ابن شبہ، تاریخ المدینۃ المنورۃ، تحقیق: فہیم محمد شلتوت (قم: دار الفکر، ۱۴۱۰ھ.ق)، ج ۱، ص ۳۵۷؛ احمد زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ (بیروت: دار المعرفہ، ط ۲)، ج ۱، ص ۱۸۴۔

(۲) مسعودی، التنبیہ والاشراف (قاہرہ: دار الصاوی للطبع و النشر)، ص ۲۳۷.

تیسری فصل

یہودیوں کی سازشیں

یہودیوں کی طرف سے معاہدے کی خلاف ورزیاں

یہودی (مسیحیوں کی طرح) پیغمبر ﷺ کے عنقریب، مبعوث ہونے سے آگاہ تھے۔ قرآن مجید کے بقول "اہل کتاب" پیغمبر اسلا ﷺ م کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے[۱] اور انھوں نے جن اوصاف اور نشانیوں کو توریت اور انجیل میں پڑھ رکھا تھا، ان کو آنحضرت ﷺ کے اندر منطبق پاتے تھے۔[۲]

اس بنا پر امید یہ تھی کہ یہ لوگ اوس و خزرج سے پہلے مسلمان ہو جائیں گے کیونکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اسلام کی طرف ان دو قبیلوں کے رجحانات کا ایک سبب یہ تھا کہ یہودیوں نے پیغمبر اسلا ﷺ م کی بعثت کے بارے میں جو پیشین گوئیاں کر رکھی تھیں وہ "وارننگ" کی صورت میں تھیں۔ لیکن ان میں سے صرف چند افراد نے اسلام قبول کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دین پر قائم تھے، ہجرت کے ابتدائی سالوں میں ان کے روابط مسلمانوں سے ٹھیک تھے اور اس چیز پر شاہد؛ ان کا وہ معاہدہ ہے

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۱٤٦؛ سورۂ انعام، آیت ۲۰.

(۲) سورۂ اعراف، آیت ۱٥۷؛ سورۂ آل عمران، آیت ۸۱؛ سورۂ انعام، آیت ۱۱٤؛ سورۂ قصص، آیت ٥۲.

جو"عدم تجاوز" کے عنوان سے پیغمبر اسلا ﷺ م کے ساتھ کیا گیا تھا۔ لیکن ابھی کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ انھوں نے اپنا رویہ بدل دیا اور مخالفت پر اتر آئے ان کی ایک شرارت یہ تھی کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کے صفات کو چھپاتے یا بدل دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں پیغمبر ﷺ کے صفات اپنی کتابوں میں نہیں ملے ہیں اور اس کے صفات، اس پیغمبر ﷺ کے صفات نہیں ہیں جو آنے والا ہے۔[۱]

قرآن نے ان کے اس رویہ اور طرز عمل کی مذمت کی ہے:

"اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی جوان کے توریت وغیرہ کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور اس کے پہلے وہ دشمنونکے مقابلے میں اسی کے ذریعہ طلب فتح بھی کرتے تھے لیکن اس کے آتے ہی منکر ہوگئے حالانکہ اسے پہچانتے بھی تھے تو اب کافروں پر خدا کی لعنت ہے"۔[۲]

یہودی مختلف طریقے سے مخالفت اور شرارتیں کرتے تھے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ نامعقول اور غیر منطقی چیزوں کی فرمائش کرتے تھے جیسے وہ مطالبہ کرتے تھے کہ ان کیلئے آسمان سے کوئی کتاب یا (نامہ) نازل ہو۔[۳]

۲۔ الٹے سیدھے اور پیچیدہ دینی سوالات کرتے تھے تاکہ مسلمانوں کے[٤] ذہن پریشان اور چکرا جائیں۔ اگرچہ تمام جگہوں پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے متقن اور واضح جوابات دیئے لیکن اس کا نتیجہ وہ برعکس نکالتے تھے۔

---

(۱) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۲۰؛ بیہقی، ج۲، ص ۱۸٦؛ ابن شہرآشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج۱، ص ۵۱؛ واقدی، المغازی، ج۱، ص ۳٦۷.

(۲) سورۂ بقرہ، آیت ۸۹.

(۳) سورۂ نسائ، آیت ۱۵۳؛ سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۳.

(٤) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱٦۰؛ ابن شہرآشوب، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۵٤؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۲۲۔ ۳۲۱؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج۱، ص ۱۸۰۔ ۱۷۸.

۳۔ مسلمانوں کی ایمانی اور اعتقادی بنیادوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے: (جاؤ اور بظاہر) جو کچھ مومنوں پر نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو انکار کردو (اور پلٹ آؤ) شاید اس طرح وہ لوگ بھی پلٹ جائیں۔[۱]

٤۔ مسلمانوں کے درمیان اختلاف ڈالنے کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ ان میں سے ایک شخص جس کا نام شأس بن قیس تھا وہ چاہتا تھا کہ اوس و خزرج کے درمیان پرانے کینہ و حسد کو جگا کر لڑائی جھگڑے اور جنگ کی آگ کو شعلہ ور کردے لیکن پیغمبر اسلا ﷺ م کے بر وقت اقدام سے یہ سازش ناکام ہوگئی۔[۲]

یہودیوں کی مخالفت کے اسباب

یہودی دراصل ایک منافع پرست، لالچی[۳]، ہٹ دھرم اور بہانہ باز لوگ تھے۔ قرآن مجید نےیہودیوں اور مشرکوں کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔[٤] کیونکہ یہ دونوں گروہ، صاحب منطق اور استدلال نہیں تھے. اپنی کینہ توزی کے باعث ہر طرح کی مخالفت اور خلاف ورزی سے باز نہیں آتے تھےیہودیوں کی اسلام سے مخالفت کے اسباب و علل کو چند چیزوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔یہودیوں کی متعصب فکریں پیغمبر اسلام ﷺ پر رشک کرتی تھیں لہذا وہ کسی ایسے کی پیغمبری کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو ان کی نسل سے نہ ہو۔[٥]

---

(۱) سورۂ آل عمران، آیت ۷۲.

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۰٤، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۳۲۰۔ ۳۱۹.

(۳) "و لتجدنهم احرص الناس علی حیوٰة..." (سورۂ بقرہ، آیت ۹٦).

(٤) سورۂ مائدہ، آیت ۸۲.

(٥) سورۂ بقرہ، آیت ۹۰، ۱۰۹؛ سورۂ نسائ، آیت ٥٤؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱٦۰؛ زینی دحلان، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۱۷٦؛ واقدی، المغازی، ج۱، ص ۳٦٥.

۲۔ وہ لوگ (یہودی) نفوذ اسلام سے قبل مدینہ میں اقتصادی اور سماجی لحاظ سے اچھی پوزیشن رکھتے تھے کیونکہ وہ کاروبار، صنعت ، کاشتکاری[۱] اور رباخوری[۲] کے ذریعہ شہر کے اقتصاد کو اپنے کنٹرول میں لئے ہوئے تھے۔

دوسری طرف سے اوس و خزرج کے درمیان اختلافات ڈال کر ان کی قدرت و طاقت کو کمزور کردیا تھا۔ اور بنی قینقاع، خزرجیوں کے ساتھ رہ کر، اور بنی نضیر اور بنی قریظہ، اوسیوں کے ساتھ رہ کر اختلافات اور قبائلی جنگ کی آگ ان کے درمیان بھڑکا چکے تھے۔[۳]

ہجرت کے بعد اوس و خزرج پرچم اسلام کے زیر سایہ اکٹھا ہوگئے اور اسلام کی روز بروز بڑھتی ہوئی قدرت و طاقت کا وہ احساس کرنے لگے اور تصور کرتے تھے کہ بہت جلد علاقہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے گی اور وہ اپنا مقام کھو بیٹھیں گے اور یہ چیز ان کے تحمل سے باہر تھی۔

۳۔ علمائے یہود وہاں کے سماج میں اپنا ایک بڑا مقام اور درجہ رکھتے تھے اور عام لوگ بغیر قید و شرط کے ان کی پیروی اور اطاعت کرتے تھے۔ یہاں تک جو احکام وہ خدا کے حکم کے برخلاف کہتے تھے اسے بھی آنکھ بند کرکے وہ قبول کرلیتے تھے۔[٤]

---

(۱) بنی قینقاع زرگری (زیورات) کا کام کرتے تھے (مونٹ گری واٹ، محمد فی المدینہ، تعریب: شعبان برکات، بیروت: المکتبۃ العصریہ)، اور ایک بازار ان کے نام کا مدینہ میں موجود تھا (ابن شبہ، تاریخ المدینہ المنورہ، تحقیق: فہیم محمد شلتوت، قم: دار الفکر، ج ١، ص ٣٠٦، یاقوت حموی، معجم البلدان، ج ٤، ص ٤٢٤؛ اور بنی نضیر اور بنی قریظہ نے اطراف مدینہ میں قلعے اور کالونیاں بنا رکھی تھیں و کاشت کاری اور باغ داری کا کام کرتے تھے۔ (یاقوت حموی، گزشتہ حوالہ، ج ١، کلمہ بنی نضیر اور بطحان؛ نور الدین السمہودی، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ٣، ١٤٠١ھ.ق)، ج ١، ص ١٦١.)

(۲) سورۂ نسائ، آیت ١٦١.

(۳) سورۂ نسائ، آیت ١٦١.

(٤) سورۂ توبہ، آیت ٣١.

اور اس سے قطع نظر، ان کے آمدنی کا ذریعہ تحفے تحائف اور خیرات وغیرہ تھیں جسے عام یہودی توریت کی پاسداری اور محافظت کے عنوان سے دیتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ڈرتے تھے کہ اگر یہودیوں نے اسلام کو قبول کرلیا تو یہ آمدنی ختم ہو جائے گی۔(۱)

٤۔ وہ لوگ، جناب جبرئیل کے ساتھ (جو کہ خدا کا پیغام لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے) دشمنی کرتے تھے(۲) اور اس بات کو بہانہ قرار دیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے۔

٥۔ قرآن مجید یہودیوں کے بہت سارے عقائد و اعمال اور توریت کی تعلیمات کو باطل قرار دیتا ہے(۳) اور بہت سارے احکام اور پروگراموں میں یہودیوں کی مخالفت کرتا ہے۔(٤)

اس موضوع کا تعلق گزشتہ زمانہ سے ہے؛ ظہور اسلام سے قبل، اہل کتاب، ثقافتی لحاظ سے بت پرستوں کے مقابلے میں بلند درجہ رکھتے تھے اور مشرکین ان کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔(٥)

ظہور اسلام کے بعد بھی یہ ذہنیت کم و بیش باقی تھی۔ اس بنا پر مدینہ کے مسلمان کبھی دینی مسائل کے بارے میں ان سے سوالات کرلیتے تھے اور وہ توریت کی باتوں کو عربی میں مسلمانوں کے

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۷۹؛ سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۷؛ سورۂ توبہ، آیت ٣٤؛ بیہقی، دلائل النبوۃ، ترجمہ: محمود مہدوی دامغانی (تہران: مرکز انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۳٦۱)، ج ۲، ص ۱۸۷ ۔ ۱۸٦۔

(۲) سورۂ بقرہ، آیت ۹۸؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۱۷٥؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (انسان العیون) (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۱، ص ۳۲۹۔

(۳) سورۂ نسائ، آیت ٤٦، ۱٥۸ ۔ ۱٥٥؛ سورۂ توبہ، آیت ۳۰۔

(٤) مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ۱٤۰۳ھ.ق)، ج ۳، ص ۱۰٦؛ رجوع کریں: صحیح بخاری، شرح و تحقیق: الشیخ قاسم الشماعی الرفاعی (بیروت: دار القلم، ط ۱، ۱٤۰۷ھ.ق)، ط ۷، باب ٤۸٦، حدیث ۱۱۸۸؛ صحیح مسلم، بشرح النووی، ج ١٤، ص ۸۰۔

(٥) مرتضی العاملی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۷٦ ۔ ۱۷٥۔

لئے تفسیر کرتے تھے۔ جبکہ ان کی مذہبی معلومات زیادہ غلط اور تحریف شدہ ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے پیغمبر اسلا ﷺ م نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی کہ اہل کتاب کی باتوں کی تصدیق نہ کریں۔[۱]

آنحضرت ﷺ نے ایک دن عمر بن خطاب سے فرمایا: اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر خود حضرت موسیٰ زندہ ہوتے تو وہ میری پیروی کرتے[۲] اس طرح کے مسائل نے یہودیوں کی دشمنی کو بڑھا دیا تھا۔ لہٰذا وہ کہتے تھے کہ یہ شخص ہمارے تمام پروگراموں کی مخالفت کرنا چاہتا ہے۔[۳]

قبلہ کی تبدیلی

پیغمبر اسلام ﷺ ، مکہ میں اپنی مدت اقامت کے دوران اور ہجرت کے بعد کچھ عرصے تک حکم خدا سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہودیوں نے اپنی دشمنی کو آشکار کرنے کے بعد، اس موضوع کو پیغمبر ﷺ کے خلاف تبلیغ اور زہر چھڑکنے کے لئے دستاویز قرار دیا اور کہتے تھے: وہ اپنے دین میں استقلال نہیں رکھتا اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے وہ لوگ اس بات پر زیادہ زور دیتے تھے۔

پیغمبر اسلا ﷺ م اس صورت حال سے آسودہ خاطر تھے اور راتوں کو آسمان کی طرف نگاہ کر کے نزول وحی کے منتظر رہتے تھے تاکہ نئے فرمان کے پہنچنے کے ساتھ یہودیوں کی

---

(۱) صحیح بخاری، گزشتہ طبع، ج۹، باب ۱۱۹۰، ص۷۷۲۔

(۲) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳۷۲؛ رجوع کریں: ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص۵۲۔

(۳) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۳۳۲۔

تبلیغات ختم ہو جائیں۔[۱]

ہجرت کے سترہ مہینے کے بعد جس وقت پیغمبر اسلا ﷺ م مسلمانوں کے ساتھ ظہر کی دو رکعت نماز "بیت المقدس" کی طرف پڑھ چکے تھے فرشتۂ وحی نازل ہوا اور قبلہ کی تبدیلی کا حکم سنایا اور پیغمبر ﷺ کو کعبہ کی طرف موڑ دیا اور پیغمبر نے بعد کی دو رکعت نماز کعبہ[۲] کی جانب رخ کر کے پڑھی۔ خدا نے اس چیز

---

(۱) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج۲، ص۳٤؛ محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۲٤۲؛ الشیخ للحر العاملی، وسائل الشیعہ، ط٤، ۱۳۹۱ھ.ق)، ج۳، کتاب الصلوۃ، ابواب القبلہ، باب۲، حدیث۳، ص۲۱٦؛ طباطبائی، المیزان، (بیروت: مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ط۳، ۱۳۹۳ھ.ق)، ج۱، ص ۳۳۱۔ قبلہ کی تبدیلی کی تاریخ، ہجرت کے بعد سات مہینے سے سترہ مہینے نقل ہوئی ہے۔ (وفاء الوفائ، ج۱، ص۳٦٤۔ ۳٦۱؛ بحار الانوار، ج۱۹، ص ۱۱۳) لیکن علامہ طباطبائی ۱۷ مہینے کی تائید فرماتے ہیں۔ (وہی حوالہ).

(۲) مورخین کے ایک گروہ کے کہنے کے مطابق یہ واقعہ، قبیلۂ بنی سلمہ کی ایک مسجد میں رونما ہوا جو "مسجد القبلتین" سے مشہور ہوئی۔ (ابن واضح، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۳٤؛ محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲٤۲؛ سمہودی، وفاء الوفائ، ج۱، ص ۳٦۲۔ ۳٦۱؛ زمخشری، تفسیر الکشاف، (بیروت: دار المعرفہ)، ج۱، ص ۱۰۱؛ لیکن ایک دوسرے گروہ نے قبیلۂ بنی سالم بن عوف کی مسجد کو، جہاں پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے پہلی نماز جمعہ برگزار کی تھی واقعہ کی جگہ بتایا ہے (طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۷۱؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۹، ص ۱۲٤؛ علی بن ابراہیم سے نقل کے مطابق) اور کچھ تاریخی خبریں بتاتی ہیں کہ یہ واقعہ خود مسجد النبی میں رونما ہوا (ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲٤۱؛ سمہودی، وفاء الوفائ، ج۱، ص ۳٦۰؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۱۹، ص ۲۰۱۔ ۲۰۰) مسجد القبلتین محل وقوع کے لحاظ سے جس کی ہمارے زمانے میں تعمیر نو ہوئی ہے اور مدینہ کے شمال میں واقع ہے قبیلہ بنی سلمہ سے میل کھاتی ہے؛ کیونکہ قبیلہ بنی سالم، مدینہ کے جنوب میں بسا ہوا تھا بہرحال مورخین کے درمیان قبلہ کی تبدیلی کے مکان میں اختلاف نظر کا پایا جانا اس کی عظمت کو کم نہیں کرتا ہے۔

کا تذکرہ اس طرح سے فرمایا ہے:

"اے رسول! ہم آپ کی توجہ کو آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں تو ہم عنقریب آپ کو اس قبلہ کی طرف موڑ دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں لہٰذا آپ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف موڑ لیجئے اور جہاں بھی رہیئے اسی طرف رخ کیجئے ۔ اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ خدا کی طرف سے یہی برحق ہے اور اللہ ان لوگوںکے اعمال سے غافل نہیں ہے"۔(۱)

قبلہ کی تبدیلی سے مسلمانوں کا استقلال پورا ہوگیا اور یہ یہودیوں کے لئے بہت ہی گراں حادثہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے اب دوسرے طریقے سے کہنا شروع کردیا کہ کیوں مسلمانوں نے اپنے قدیمی قبلہ سے منھ پھیر لیا؟ خداوند عالم نے قبلہ کی تبدیلی سے پہلے ہی یہودیوں کی حرکت سے پیغمبر ﷺ کو آگاہ کردیا تھا اور اس کے جواب کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کردیا تھا۔ کہ مشرق و مغرب اور روئے زمین کا ہر حصہ خدا کا ہے وہ جدھر نماز پڑھنے کا حکم دے، ادھر نماز پڑھنا چاہئے اور زمین کا کوئی حصہ اپنی جگہ پر ذاتی کمال نہیں رکھتا"۔

"عنقریب احمق لوگ یہ کہیں گے کہ ان مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس نے موڑ دیا ہے جس پر پہلے قائم تھے تو اے پیغمبر ﷺ ! کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب سب خدا کے ہیں وہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت کردیتا ہے"۔(۲)

اس جواب کے بعد پھر یہودیوں کے پاس منفی تبلیغ کا کوئی بہانہ نہیں رہ گیا تھا اور قبلہ کی تبدیلی کے ساتھ دو نئے اور پرانے آئین کے پیرووں کے درمیان مشترک رابطہ ختم ہوگیا اور یہ دو گروہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے اور ان کے درمیان روابط میں خلل پڑ گیا۔

"آپ ان اہل کتاب کے لئے کوئی بھی آیت اور دلیل پیش کردیں یہ آپ کے قبلہ کو ہرگز نہ مانیں گے اور آپ بھی ان کے قبلہ کو نہ مانیں گے اور یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتے اور

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۱٤٤

(۲) سورۂ بقرہ، آیت ۱٤۲

اپنے اور اے پیغمبر! آپ علم کے آجانے کے بعد اگر ان کے خواہشات کا اتباع کرلیں گے تو آپ کا شمار ظالموں میں ہوجائے گا"۔[1]

قرآن مجید کی آیات سے اس طرح استفادہ ہوتا ہے کہ قبلہ کی تغییر میں خداوند عالم کی طرف سے یہودیوں پر انتقاد کے علاوہ مومنین کا امتحان بھی لیا گیا ہے کہ کس حد تک وہ ایمان و اخلاص رکھتے ہیں اور خدا کے حکم کے سامنے تسلیم ہیں۔

"اور ہم نے پہلے قبلہ کو صرف اس لئے قبلہ بنایا تھا کہ ہم یہ دیکھیں کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون پچھلے پاؤں پلٹ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ قبلہ ان لوگوں کے علاوہ سب پر گراں ہے جن کی اللہ نے ہدایت کردی ہے اور خدا تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا (سابق قبلہ کی طرف تمہاری نمازیں صحیح ہیں) کیونکہ خدا بندوں کے حال پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے"۔[2]

کچھ روایات میں، اس امتحان کی اس طرح تفسیر کی گئی ہے کہ مکہ کے لوگ کعبہ کے فدائی تھے۔ خداوند عالم نے مکہ میں وقتی طور پر، بیت المقدس کو اس لئے قبلہ قرار دیا تاکہ خدا کے نیک اور فرمانبردار بندے (جو اپنی خواہشات کے برخلاف صرف خدا اور پیغمبر ﷺ کے حکم کی پیروی میں اس کی طرف نماز پڑھتے ہیں) خدا کے نافرمان اور خود رائے بندوں سے الگ پہچانے جائیں۔ لیکن مدینہ میں، جہاں زیادہ تر لوگ بیت المقدس کے طرفدار تھے خداوند عالم نے ان کے لئے کعبہ کو قبلہ قرار دیا تاکہ وہاں بھی یہ دو دستے معین ہوسکیں۔[3]

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۱٤٥

(۲) سورۂ بقرہ، آیت ۱٤۳.

(۳) طباطبائی، المیزان (بیروت: موسسة الاعلمی، للمطبوعات، ط ۳، ۱۳۹۳ھ.ق)، ج ۱، ص ۳۳۳؛ بعض روایات و نیز کچھ تاریخی خبروں کی بنیاد پر پیغمبر اسلا ﷺ م مکہ میں بھی کعبہ کی طرف پشت نہیں کرتے تھے۔ (وسائل الشیعہ، ج۳، ص ۲۱٦، کتاب الصلاۃ، ابواب القبلہ، حدیث٤)، بلکہ اس کو بیت المقدس کے ساتھ ایک سمت میں قرار دیتے تھے اور دونوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ (حلی، السیرۃ الحلبیہ، ج ۲، ص ۳٥۷.)

چوتھی فصل

لشکر اسلام کی تشکیل

اسلامی فوج کا قیام

پیغمبر اسلا ﷺ م مکہ میں سکونت کے دوران فقط ایک مبلغ تھے اور لوگوں کے لئے عملی میدان میں ایک الٰہی راہنما تھے اور ان کی خدمات، لوگوں کی ہدایت و راہنمائی اور بت پرستوں اور مشرکوں سے فکری اوراعتقادی جنگ تک محدود تھیں۔ لیکن مدینہ میں آنے کے بعد، دینی رسالت کے ابلاغ و راہنمائی کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی رہبری بھی آپ کے ذمہ آگئی تھی؛ کیونکہ مدینہ میں نئی صورت حال پیش آگئی تھی اور آپ نے اسلامی تعلیمات کی بنیادپر ایک نئے معاشرے کے قیام کے سلسلہ میں ابتدائی قدم اٹھایا تھا۔ اس بنا پر آپ احتمالی خطرات اور دشواریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرکے ایک دور اندیش، شائستہ اور آگاہ سیاسی رہبر کی شکل میں اس کی چارہ جوئی کی فکر میں لگ گئے، مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیا ن رشتہ اخوت و برادری کی برقراری، عمومی عہد و پیمان کی تنظیم و اجراء و نیز یہودیوں کے ساتھ عدم تجاوز کے معاہدہ پر دستخط یہ وہ اقدامات تھے جنھیں آپ نے بطور احتیاط انجام دیئے تھے۔

جو سورے اور آیات مدینہ میں نازل ہوئیں وہ سیاسی اور سماجی احکام و دستورات پر مشتمل تھیں اور وہ پیغمبر ﷺ کیلئے سیاسی امور میں مفید اور راہ گشا تھیں۔ جیسے کہ خداوند عالم کی طرف سے جہاد اور دفاع کا حکم صادر ہوا[۱] اور اس کے بعد پیغمبر اسلا ﷺ م نے قصد کیا کہ ایک دفاعی فوج تشکیل دیں۔

اس فوج کا قیام عمل میں آنا اس لحاظ سے اہمیت رکھتا تھا کہ اس بات کا گمان تھا کہ مکہ کے مشرکین (جو ہجرت کے بعد مسلمانوں کو سزائیں اور تکلیف نہیںدے پا رہے تھے) اس مرتبہ مرکز اسلام (مدینہ) پر فوجی حملہ کردیں۔ اس بنا پر پیغمبر ﷺ نے اس طرح کے گمان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہجرت کے پہلے سال کے آخر میں ایک اسلامی فوج کی بنیاد ڈالی۔ یہ فوج شروع میں تعداد اور جنگی سازو سامان کے لحاظ سے محدود تھی ۔ لیکن بہت جلدی دونوں لحاظ سے اسے ترقی ملی۔یہاں تک کہ آغاز قیام میں جنگی ماموریت یا گشتی عملیات میں بھیجی جانے والی ٹولیاں ساٹھ افراد سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہوتی تھیں۔ اور ان کی سب سے زیادہ تعداد جو بہت کم دیکھنے میں ائی دو سو سے زیادہ نہیں پہنچی۔[۲]

ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر میں ان کی تعداد تین سو سے تھوڑا زیادہ تھی۔ لیکن فتح مکہ میں (ہجرت کے آٹھویں سال) سربازان اسلام کی تعداد دس ہزار افراد تک پہنچ گئی تھی۔ اور فوجی سازوسامان کے اعتبار سے بھی بہت اچھی حالت ہو گئی تھی۔

بہر حال یکے بعد دیگرے، واقعات کے رونما ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کی پیش بینی درست تھی۔ کیونکہ ہجرت کے دوسرے سال طرفین کے درمیان متعدد جھڑپیں ہوئیں اگر مسلمانوں کے پاس دفاعی طاقت نہ ہوتی تو ان جھڑپوں کے نتیجہ میں مسلمان، مشرکوں کے ہاتھوں بری طرح سے مارے جاتے۔[۳]

---

(۱) "اذن.... یقاتلون بانہم ظلموا و ان اللہ علیٰ نصرہم لقدیر، الذین اخرجوا من دیارہم بغیر حق" (سورۂ حج، آیت ۴۰ـ ۹۳)، اسی طرح سے رجوع کریں: المیزان، ج۱۴، ص ۳۸۳؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۳۶.

(۲) ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، (بیروت: دار صادر)، ج۲،ص ۱۱۲.

(۳) پیغمبر اسلا ﷺ م کے کل غزوات کی تعداد ۲۶ اور سریات کی تعداد ۳۶ نقل ہوئی ہے۔ (ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص ۱۸۶، طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۷۲)، کچھ مورخین نے سریات کی تعداد اس سے زیادہ نقل کی ہے (مسعودی، مروج الذھب، ج۲، ص ۲۸۲)، بخاری، ایک روایت میں ان کی تعداد ۱۹ ذکر ہوئی ہے (صحیح بخاری، ج۶، ص ۳۲۷.)

فوجی مشقیں

پیغمبر اسلام ﷺ نے انھیں تھوڑے سے سپاہیوں کے ذریعے ایک طرح کی چھوٹی فوجی نقل و حرکت شروع کردی جس کو درحقیقت ایک مکمل جنگ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اوران مشقوں میں سے کسی ایک میں دشمن سے نوک جھوک اورجنگ پیش نہیں آئی جیسے حمزہ بن عبد المطلب کا تیس افراد پر مشتمل سریہ (ہجرت کے آٹھویں مہینے میں) جس نے قریش کے قافلہ کو مکہ کی طرف پلٹتے وقت پیچھا کیا تھا۔ اور عبیدہ بن حارث کا ساٹھ افراد پر مشتمل سریہ جس نے (آٹھویں مہینے میں) ابوسفیان کے گروہ کا پیچھا کیا۔ اور سعید بن وقاص کا بیس افراد پر مشتمل سریہ جس نے (نویں مہینے میں) قریش کے قافلے کا پیچھا کیا۔ لیکن اس کو پا نہیں سکا۔[1]

اسی طرح سے خود پیغمبر اسلا ﷺ م نے (گیارہویں مہینے میں) مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ، قریش کے قافلے کا تعاقب کیا اور سرزمین "ابوائ" تک پہنچ گئے، لیکن کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔

آنحضرت ﷺ نے اس سفر میں قبیلۂ "بنی ضَمرۃ" سے عہد و پیمان کیا کہ وہ بے طرف رہیں اور دشمنان اسلام کا ساتھ نہ دیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ربیع الاول کے مہینے (بارہویں مہینے) میں، کرز بن جابر فہری، جس نے گلۂ (ریوڑ) مدینہ کو غارت کردیا تھا اس کا تعاقب، سرزمین بدر تک کیا لیکن وہ مل نہ سکا، جمادی الآخر

---

(۱) واقدی، المغازی، تحقیق: مارسڈن جونس، ج۱، ص ۱۱ - ۹؛ محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم والملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۲، ص ۲۵۹؛ رجوع کریں: ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۲، ص ۲۴۵ - ۲۵۱؛ ابن اسحاق نے ان سریات کو ۲ھ کے واقعات میں قرار دیا ہے۔ (طبری، گزشتہ حوالہ،) اگر بالفرض اس نقل کو ہم صحیح قرار دیں تو ہمیں قبول کرنا چاہیئے کہ اسلامی فوج کی تشکیل ۲ھ میں ہوئی ہے لیکن پھر بھی یہ مطلب موضوع کی اہمیت کو کم نہیں کرتا بلکہ اس سلسلہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کے عمل کی تیزی کو بتاتا ہے۔

میں ایک سو پچاس یا (دوسو) افراد کے ساتھ قریش کے تجارتی قافلہ کو جو کہ ابوسفیان کی سرپرستی میں (مکہ سے شام) جارہا تھا، اس کا تعاقب کیا (غزوہ ذات العشیرہ) اور اس بار بھی اس کے قافلہ تک نہ پہنچ سکے اور قبیلۂ "بنی مدلج" کے ساتھ عہد وپیمان کیا اور مدینہ پلٹ آئے[۱] لہٰذا اس طرح کی چھوٹی فوجی نقل و حرکت کو درحقیقت فوجی مشقیں یا قدرت نمائی کہنا چاہیئے نہ واقعی جنگ۔

فوجی مشقوں سے پیغمبر ﷺ کے مقاصد

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کا ان چھوٹے سرایا اور غزوات سے مقصد، نہ دشمنوں کو لوٹنا اور غارت کرنا تھا اور نہ ان سے جنگ اور ٹکراؤ کرنا تھا۔ کیونکہ (جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا ہے) ایک طرف سے اسلامی سپاہیوں کی تعداد کم تھی اور دشمن کے سپاہیوں کی تعداد ان کے دو برابر تھی۔ اور دوسری طرف ان سرایا میں سے کچھ میں انصار بھی شریک تھے اور ان لوگوں نے "عقبہ دوم" کے عہد و پیمان میں پیغمبر ﷺ کے ساتھ مدینہ کے اندر دفاع کا وعدہ کیا تھا نہ کہ مدینہ کے باہر دشمن سے جنگ کرنے کا۔ اس کے علاوہ مدینہ کے لوگ کاشتکار اور باغبان بھی تھے اور بادیہ نشین قبائل کی طرح غارت گری اور لوٹ مار کی عادت نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر اوس و خزرج آپس میں جنگ بھی کرتے تھے تو وہ مقامی پہلو رکھتا تھا۔ او رجنگ کی آگ بھڑکانے والے یہودی ہوتے تھے وہ کبھی قافلوں کے مال کو لوٹا نہیں کرتے تھے یا قبائل کے اموال کو ان کے علاقے سے ہڑپ کرلے نہیں جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر ان کا سامنا دشمن سے ہوتا تھا تو جنگ کی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ حمزہ نے ایک شخص کے ذریعہ جو بے طرف تھا، جنگ کرنے سے پرہیز کیا۔[۲]

ان قرائن و شواہد کے لحاظ سے گویا پیغمبر اسلا ﷺ م ان مشقوں سے خاص مقصد رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۔ ۱۱؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۲۶۱۔ ۲۵۹.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۹.

۱۔ شام کی طرف جانے والے قریش کے تجارتی راستے کو دھمکی اور وارننگ دینا: مکے کے تاجروں کے قافلے شہر مدینہ کے پاس سے بحر احمر کے درمیان سے ہو کر گزرتے تھے لہٰذا وہ شہر سے ۱۳۰ کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ نہیں رکھ سکتے تھے۔[۱]

پیغمبر اسلام ﷺ اپنی اس نقل و حرکت کے ذریعہ، قریش کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اگر وہ چاہیں کہ مدینہ میں بھی (مکہ کی طرح) مسلمانوں کے کاموں میں رخنہ ڈالیں، تو ان کا تجارتی راستہ خطرہ میں پڑجائے گا اور ان کا تجارتی مال مسلمانوں کے ذریعہ ضبط ہو سکتا ہے۔*

یہ وارننگ قہری طور سے مشرکین مکہ کو، کہ جن کے نزدیک تجارت ایک حیاتی مسئلہ تھا، روکنے کے لئے ایک قومی محرک تھا اور ایک واقعی دھمکی تھی تاکہ اپنے محاسبات میں، مسلمانوں کے ساتھ رویہ میں تجدید نظر کریں۔

البتہ یہ خیال رہے کہ مسلمانوں کو حق حاصل تھا کہ مشرکین مکہ کے اموال کو ضبط کرلیں؛ کیونکہ انھوں نے مہاجرین کو مکہ ترک کرنے کے لئے مجبور کیا تھا اور ان کی جائداد کو ہڑپ لیا تھا۔[۲]

---

(۱) مونٹ گری، محمد فی المدینہ، تعریب: شعبان برکات (بیروت: المکتبہ العصریہ)، ص۵.

* بعد میں دھمکی صحیح ثابت ہوئی اور (جیسا کہ ہم بیان کریں گے) قریش شام کے تجارتی راستہ کے مسدود ہونے سے سخت ناراض ہوئے اور شام جانے کے لئے دوسرے راستہ کی تلاش میں لگ گئے۔

(۲) پیغمبر اسلام ﷺ کی ہجرت کے بعد، عقیل نے مکہ میں خانہ آنحضرت ﷺ (شعب ابوطالب) اور بنی ہاشم نے مہاجروں کے گھروں پر قبضہ کرلیا۔ پیغمبر اسلا ﷺم نے فتح مکہ کے موقع پر حجون میں (مکہ کے باہر) خیمہ لگایا۔ لوگوں نے عرض کیا "کیوں اپ اپنے گھر تشریف نہیں لے جاتے؟" آپ نے فرمایا: مگر عقیل نے ہمارے لئے گھر چھوڑ رکھا ہے؟!! (واقدی، مغازی، ج۳، ص ۸۲۸؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج۱، ص ۱۳٦؛ قسطلانی، المواہب اللدنیہ والمنح المحمدیہ (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ط۱، ۱۳۱٦ھ-ق)، ج۱، ص ۲۱۸؛ بعد میں عقیل کے وارثوں نے اس گھر کو سو دینار میں حجاج بن یوسف کے بھائیوں کے ہاتھ بیچ دیا (حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۱، ص ۱۰۲-۱۰۱؛ اسی طرح خاندان بنی جحش بن رئاب کے ہجرت کرنے کے بعد، ان کے گھر مکہ میں خالی پڑے رہے۔ ابوسفیان نے یہ کہکر کہ ان کی لڑکی ان میں سے ایک کی زوجہ ہے، ان کے گھروں کو لے لیا۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۲، ص ۱٤۵)، اس کے علاوہ صہیب کے مدینہ ہجرت کرتے وقت، مشرکین نے ان کا پیچھا کیا اور مال و دولت کو چھین لیا لیکن اس کی جان بچ گئی (ابن ہشام، ج۲، ص ۱۲۱.)

لیکن یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ اسلام کا دائرہ کار، ذاتی انتقام اور فردی حساب چکانے کے مرحلہ سے آگے بڑھ کر درحقیقت دوبڑی قدرت کے ٹکراؤ میں بدل چکا تھا۔ اور طرفین ایک دوسرے کے سپاہیوں کو کمزور کرنے میں لگ گئے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی نظر میں، دشمن کو اقتصادی نقصان پہنچانا اور ان کے اندر رعب و وحشت کا ڈالنا۔ ان کے تجارتی مال، یامال غنیمت سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ جیسا کہ عبد اللہ بن جحش کے سریہ اور جنگ بدر تک مشرکوں کا کوئی مال مسلمانوں کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔

۲۔ یہ سرگرمیاں، ایک طرح سے مسلمانوں کی جنگی قدرت کی نمائش اور مشرکین مکہ کے لئے وارننگ تھیں کہ مدینہ پر فوجی حملہ کرنے کے بارے میں نہ سوچیں۔ کیونکہ مسلمانوں میں دفاعی طاقت پیدا ہوگئی ہے اور وہ ان کے حملوں کا دفاع کرسکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم قریش کی مخالفت کے اسباب و علل کے تجزیہ کی بحث میں پڑھ چکے ہیں کہ جس وقت پیغمبر اسلا ﷺ م مکہ میں رہ رہے تھے ا ور مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی تو قریش کے سرمایہ دار اپنے اقتصادی تسلط کا زوال دیکھ رہے تھے اور اب جبکہ شہر مدینہ کافی امکانات اور استعداد کے ساتھ ایک اسلامی مرکز میں تبدیل ہوگیا تھا کس طرح ممکن تھا کہ مکہ کے ثروت پرست اپنے کو امان میں سمجھیں، اس وجہ سے ضروری تھا کہ شروعات مسلمانوں کی طرف سے ہو، تاکہ مشرکین اس شہر پر قبضہ نہ کرسکیں۔

۳۔ شاید یہ فوجی سرگرمیاں ایک طرح سے مدینہ کے یہودیوں کے لئے بھی الٹی میٹم تھیں (جو اپنی دشمنی کو آشکار کرچکے تھے) تاکہ تخریب کاری سے ہاتھ اٹھالیں اور فوجی کاروائی کا ارادہ نہ کریں ورنہ مسلمان، فتنہ کی آگ کو سختی کے ساتھ خاموش کردیں گے۔[۱]

---

(۱) محمد حسین هیکل، حیات محمد ﷺ (قاهره: مکتبة النهضة المصریه، ط۸، ۱۹۶۳م)، ص ۲۴۸۔ ۲۴.

عبد اللہ بن جحش کا سریہ

ہجرت کے دوسرے سال رجب کے مہینہ میں پیغمبر ﷺ نے عبد اللہ بن جحش (اپنے پھوپھی کے لڑکے) کو مہاجرین میں سے آٹھ افراد کے ساتھ، خبر رسانی اور خفیہ اطلاعات کی مہم پر بھیجا اور ان کو مہر بند خط دیا اور فرمایا: "دو روز راستہ طے کرنے کے بعد اس خط کو کھولنا اور اس کے مطابق عمل کرنا اور اپنے ہمراہ لوگوں میں سے کسی کو ہمراہی پر مجبور نہ کرنا" اس نے دو دن راستہ طے کرنے کے بعد، خط کو کھولا تو حکم اس طرح سے تھا "جس وقت میرے خط کو پڑھنا اپنے راستہ کو جاری رکھنا اور جب سرزمین "نخلہ" میں (مکہ اور طائف کے درمیان) پہنچنا تو وہاں چھپ کر قریش کو دیکھنا اور ہم کو وہاں کی صورت حال سے آگاہ کرنا" عبد اللہ نے اعلان کیا کہ وہ پیغمبر ﷺ کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں اور ان لوگوں سے کہا "جو شخص بھی شہادت کے لئے تیار ہے آئے، ورنہ آزاد ہے اور پلٹ جائے۔ ان سب نے کہا کہ ہم تیار ہیں۔ یہ گروہ "نخلہ" میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ قریش کا ایک قافلہ عمر بن الحضرمی کی سرپرستی میں طائف سے مکہ پلٹ رہا تھا۔ عبد اللہ اور اس کے ساتھیوں نے چاہا کہ قافلہ پر حملہ کر دیں لیکن ماہ رجب کا آخری دن تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا: اگر یہ لوگ حرم میں داخل ہو گئے تو تقدس حرم کی خاطر ان سے جنگ نہیں ہو سکے گی اور اگر یہاں پر ہم ان سے جنگ کریں تو ماہ حرام کی حرمت کو پائمال کر دینگے۔

آخر کار قافلے پر حملہ کر دیا اور عمرو بن الحضرمی کو قتل کر ڈالا اور دو لوگوں کو اسیر کر لیا اور مال غنیمت اور اسیروں کے ساتھ مدینہ پلٹ آئے۔ پیغمبر ﷺ نے، ان کے اس خود سرانہ اقدام پر افسوس ظاہر کیا اور اسیروں اور مال غنیمت کو لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا: "میں نے نہیں کہا تھا کہ ماہ حرام میں جنگ نہ کرنا"

اس واقعہ کا بہت چرچہ ہوا، ایک طرف اس گروہ کی جنگ و خون ریزی حرام مہینہ میں مسلمانوں کے لئے دشوار بن گئی اور عبد اللہ کی سرزنش کی اور دوسری طرف سے قریش اس واقعہ کا غلط پروپیگنڈہ کر کے کہتے تھے۔ محمد ﷺ نے حرام مہینے کے تقدس اور احترام کو پائمال کر دیا ہے، اور اس مہینہ میں خون ریزی کی ہے! یہودی بھی اس پر زہر چھڑک کر کہہ رہے تھے: یہ کام مسلمانوں کے ضرر میں تمام ہوگا، اسی وقت فرشتۂ وحی نازل ہوا اور خدا کا فرمان سنایا:

"پیغمبر یہ آپ سے محترم مہینوں میں جہاد کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ ان میں جنگ کرنا گناہ کبیرہ ہے اور راہ خدا سے روکنا اور خدا اور مسجد الحرام کی حرمت کا انکار کرنا ہے اور اہل مسجد الحرام کو وہاں سے نکال دینا خدا کی نگاہ میں جنگ سے بھی بدتر گناہ ہے اور فتنہ و فساد برپا کرنا تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور یہ کفار و مشرکین برابر تم لوگوں سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کے امکان میں ہو تو تم کو تمہارے دین سے پلٹادیں..."۔(۱)

ان آیات کے نزول کے ذریعہ کہ جس میں عبد اللہ کے ضمنی تبرئہ کے ساتھ قریش کو فتنہ کا باعث اور ان کے گناہ کو ماہ حرام میں قتل سے بہت بڑا بتایا گیا ہے مسلمانوں کے خلاف جو فضا مکدر ہوگئی تھی وہ ختم ہوگئی اور پیغمبر ﷺ نے قریش کے نمائندوں کی درخواست پر اسیروں کو رہا کردیا، ان میں سے ایک مسلمان ہو کر مدینہ میں رہ گیا۔(۲)

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی افراد، یا پارٹیاں اپنے حسن نیت (لیکن سوء تدبیر کے ساتھ) کی بنا پر ایسے اقدامات انجام دیتی ہیں جس کے برے اثرات سماج میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حسن نیت، ان کے اقدامات کے خطرناک نتائج کا جبران نہیں کرسکتی ہے۔ عبد اللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کا اقدام بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔

جنگ بدر

یہ جنگ، پیغمبر ﷺ کی فوجی مشقوں، اور شام کی طرف قریش کے تجارتی راستہ کی دھمکی کے بعد ہوئی اور یہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان پہلی بڑی جنگ تھی جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے جمادی

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۷.

(۲) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، (مطبعہ مصطفی البابی، الحلبی، ۱۳۵۵ھ.ق)، ج۲، ص ۲۵۵۔ ۲۵۲؛....

الآخر کے مہینہ میں قریش کے قافلہ کا جو ابو سفیان کی سربراہی میں شام کی طرف جارہا تھا، سرزمین "ذات العُشَیرہ" تک تعاقب کیا لیکن ان تک پہنچ نہ سکے۔ اس وجہ سے شام کے علاقہ میں سراغ رساں سپاہیوں کو بھیجا جن کے ذریعہ کفار قریش کے قافلہ کے پلٹنے کی خبر ملی۔[1]

مال و اسباب کے لحاظ سے قافلہ بہت بڑا تھا۔ ان کے اونٹ کی تعداد ایک ہزار تھی اور ان کا سرمایہ ۵۰ ہزار دینار نقل ہوا ہے کہ جس میں تمام قریش شریک تھے۔[2]

قافلوں کا قدرتی راستہ، بدر کے علاقہ سے شروع ہوتا تھا۔[3] پیغمبر اسلام ﷺ نے قافلہ کو ضبط کرنے[4] کے لئے تین سو تیرہ افراد[5] اور بہت کم امکانات[6] کے ساتھ، بدر کی طرف گئے۔

ابو سفیان شام سے پلٹتے وقت پیغمبر ﷺ کے ارادہ سے آگاہ ہوگیا۔ لہٰذا ایک طرف مکہ میں اپنا تیز رفتار نمائندہ بھیج کر قریش سے مدد مانگی[7] اور دوسری جانب سے قافلہ کے راستہ کو داہنی طرف (بحر احمر

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۲۰.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۷؛ مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۵ھ.ق)، ج۱۹، ص ۲۴۸۔ ۲۴۵.

(۳) بدر، شہر مدینہ کے جنوب غربی میں پڑتا ہے جو آج ایک شہر کی شکل میں بدل گیا ہے اور علاقائی مرکز اسی نام پر ہے مدینہ کی شاہراہ، جدہ اور مکہ کی طرف اسی جگہ سے گزرتی ہے۔ اور یہاں سے مدینہ کا فاصلہ ۱۵۳ کلومیٹر اور مکہ کا فاصلہ ۳۴۳ کلومیٹر ہے۔ (محمد عبدہ یمانی، بدر الکبریٰ، جدہ: دار القبلہ للثقافہ الاسلامیہ، ط ۱، ۱٤۱۵ھ۔ق)، ص ۲۵۔ اور جس وقت سے مدینہ اور مکہ کے درمیان شاہراہ بنی ہے۔ حج کے زمانہ میں حاجیوں کا سفر اس راستہ سے نہیں ہوتا ہے.

(٤) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۲۵۸.

(٥) محمد بن سعد، طبقات الکبریٰ، (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۲۰، طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۷۲.

(٦) مسلمانوں کے پاس ستر (۷۰) اونٹ تھے اور چند افراد ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۲٦۳) اور صرف ایک گھوڑا (شیخ مفید، الارشاد، ص ۷۳؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص ۱۸۷؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۱۹، ص ۳۲۳؛ مسند احمد، ج ۱، ص ۱۲۵؛ اور بنا بر نقل دو گھوڑا رکھتے تھے (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲٦؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲٤۔ ۲۲؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۳۷)، اور چھ جنگی زرہ اور آٹھ تلوار رکھتے تھے۔ (ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص ۱۸۷؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۱۹، ص ۳۲۳.)

(۷) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۵۸؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۲۸.

کے ساحل کی طرف) موڑدیا اور قافلہ کو تیزی کے ساتھ، خطرے کے مقام سے دور کردیا۔[1]

ابوسفیان کی درخواست پر نوسو پچاس[2] جنگجو مکہ سے قافلہ کی نجات کے لئے مدینہ کی طرف گئے۔ جبکہ مشرکین راستے میں ہی قافلے کی نجات سے آگاہ ہوگئے تھے لیکن ابوجہل کی لجاجت اور ہٹ دھرمی نے ان کو ٹکراؤ پر مجبور کردیا۔ ابھی مسلمان قافلہ کی جستجو میں تھے کہ پیغمبر ﷺ کو خبر ملی کہ لشکر قریش بدر کے علاقہ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ایسے موقع پر کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ کیونکہ تھوڑے سے سپاہیوں اور اسلحوں کے ساتھ قافلہ کے افراد کو گرفتار کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے نہ کہ ایسی فوج سے جنگ کرنے کے لئے آئے تھے جن کے سپاہیوں کی تعدا، ان کے سپاہیوں کے تین برابر ہو۔ اگر (بالفرض) عقب نشینی بھی کرنا چاہتے تو فوجی مشقوں کے پروپیگنڈہ کا اثر ختم ہوجاتا اور ممکن تھا کہ دشمن ان کا پیچھا کر کے مدینہ پر حملہ کردیتے۔ لہٰذا فوراً ایک فوجی کمیٹی تشکیل پانے کے بعد، پیغمبر ﷺ نے مسلمانوں (خاص طور سے انصار) کی رائے اور مشورہ سے اور مقداد اور سعد بن عبادہ کی پرجوش تقریر کے بعد دشمن سے جنگ کا ارادہ کرلیا۔[3]

١٧ رمضان[4] کی صبح کو، جنگ کا آغاز ہوا۔ شروع میں حمزہ، عبیدہ اور علی نے شیبہ، عتبہ اور ولید بن عتبہ سے الگ الگ جنگ کی اور اپنے مدمقابل کو قتل کیا[5] اور یہ سرداران قریش کے حوصلہ پر سخت چوٹ تھی[6] لہٰذا سی وقت عمومی جنگ شروع ہوگئی۔ لشکر اسلام اتنی تیزی کے ساتھ کامیاب ہوا کہ ظہر

---

(١) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٢٧٠؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٤١.

(٢) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ٢٦٩؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ١٥؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج١، ص ١٨٧؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج١٩، ص ٢١٩.

(٣) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٢٦٨۔ ٢٦٦؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٩۔ ٤٨؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ١٤

(٤) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٢٧٨؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ١٩۔ ١٥ و ٢٠.

(٥) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٢٧٧؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ٢٣۔ ١٧ور ٢٤؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج١٩، ص ٢٧٩؛ ابن اثیر الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج٢، ص ١٢٥.

(٦) شیخ مفید، الارشاد، (قم: الموتمر العالمی الفیہ الشیخ المفید، ط ١، ١٤١٣ھ.ق)، ص ٦٩.

کے وقت[1] جنگ دشمن کی شکست اور عقب نشینی پر تمام ہوگئی۔ مشرکین میں ۷۰ افراد مارے گئے[2] اور ستر (۷۰) افراد اسیر ہوئے[3] اور مسلمانوں میں سے چودہ (۱٤) افراد شہید ہوئے۔[4]

پیغمبر اسلا ﷺ م کی موافقت سے قیدی خون بہا دے کر آزاد ہوگئے اور جن کے پاس پیسہ نہ تھا لیکن پڑھے لکھے تھے ان کے بارے میں رسول اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ انصار کے دس جوانوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں پھر آزاد ہوجائیں۔[5] اور بقیہ اسیر پیغمبر اکرم ﷺ کے احسان پر آزاد ہوئے۔[6]

مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

مسلمانوں کی درخشاں کامیابی، ان کے پہلے فوجی حملہ میں ہی، قریش کے رعب و حشمت کو توڑ دیا اور ان کو سرگرداں اور مبہوت کردیا، لشکر قریش کی شکست اس قدر غیر متوقع تھی کہ جب رسول خد صلی اللہعلیہو آلہوسلم اکا نمائندہ، لشکر اسلام کے مدینہ پلٹنے سے پہلے، شہر میں داخل ہوا اور کامیابی کی خبر سنائی، تو مسلمانوں کو

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۲؛ پیغمبر اسلا ﷺ م نے جنگ تمام ہونے کے بعد مدینہ کے راستہ میں نماز عصر پڑھی (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۱٤۔ ۱۱۲)

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۸؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۲۹٤؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۳۷۔

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۔ ۱۸؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۱۱٦؛ طبری، گزشتہ حوالہ، صص ۲۹٤؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۳۷؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص۱۸۹؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۱۹، ص ۲۹۱۔

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۷؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۳۷؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص۱۸۹۔

(۵) زید بن ثابت نے اس طرح سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔

(٦) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۸۔

شروع میں باور نہ ہوا اور نمائندہ کو جنگ سے فراری اور ہارا ہوا سمجھا۔[۱]

لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسیروں کو شہر میں لایا گیا۔ اس کامیابی کا چرچہ حبشہ تک پہنچا اور جب نجاشی کو یہ خبر ملی تو اس نے خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان مہاجروں کو دربار میں بلایا اور یہ خوش خبری ان کو سنائی۔[۲]

پیغمبر اسلا ﷺ م نے فرمایا:

"جنگ بدر وہ پہلی جنگ تھی جس میں خداوند عالم نے اسلام کو عزیز اور شرک کو ذلیل و خوار کیا۔[۳]

شیطان، جنگ بدر کے دن اس قدر ذلیل و خوار ہوا کہ (عرفہ کے دن کے علاوہ کہ خدا کی رحمت کے نزول اور بڑے گناہونکی مغفرت کا مشاہدہ کیا تھا) کبھی ایسا نہیں ہوا تھا"۔[٤]

اس حیرت انگیز کامیابی کے اسباب و علل کو اس طرح سے خلاصہ کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ پیغمبر ﷺ کی لائق اور شائستہ کمانڈری * اور آپ کی شجاعت اور دلیری؛ علی جنگ بدر کو یاد کر کے فرماتے ہیں: "جس وقت جنگ کی آگ سخت شعلہ ور ہوئی تو ہم رسول کی پناہ میں چلے گئے اور

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۱۱۵۔

(۲) گزشتہ حوالہ، ص ۱۲۱.

(۳) گزشتہ حوالہ، ص ۲۱.

(٤) گزشتہ حوالہ، ص ۷۸.

* اس کے باوجود کہ پیغمبر اسلا ﷺ م بعثت سے قبل، فوجی سابقہ نہیں رکھتے تھے اور موخین نے صرف ان کی شرکت جوانی میں (یا نوجوانی میں) جنگ "فجار" میں نقل کی ہے اوراس میں شک پایا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ ایک ٹریننگ یافتہ کمانڈر یا تجربہ کار کمانڈر کی طرح، اتنے اچھے طریقہ سے کمانڈری کے فرائض انجام دیئے کہ کبھی بھی مسلمانوں کو اس طرح سے فتح حاصل نہیں ہوئی۔

اس وقت ہم میں سے کوئی بھی، آپ سے زیادہ دشمن سے نزدیکتر نہیں تھا"۔[1]

۲۔ علی کی بے نظیر شجاعت اور جان نثاری؛ اس طرح سے کہ جنگ میں مارے گئے دشمنوں میں سے نصف کو آپ نے اکیلے قتل کیا تھا۔[2]

شیخ مفید نے ۳۵ لوگوں کا نام لیا ہے۔ جو جنگ بدر میں مارے گئے تھے، اور کہتے ہیں: شیعہ اور اہل سنت راویوں نے بطور اتفاق لکھا ہے کہ اتنے افراد کو علی نے قتل کیا ہے اس کے علاوہ اور بھی قتل ہوئے تھے جن کے قاتل کے بارے میں اختلاف ہے یا علی ان کے قتل میں شریک تھے۔[3]

۳۔ اگر چہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے مدینہ سے نکلتے وقت، بے رغبتی اور کھلے انداز میں

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۲۳؛ مسند احمد حنبل، ج۱، ص۱۲٦؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹٦۱ئ)، ج۱۳، ص۲۷۹۔

(۲) ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱، مقدمہ، ص۲٤؛ شیخ مفید، الارشاد، (قم: المؤتمر العالمی لألفیۃ الشیخ المفید، ط۱، ۱٤۱۳ھ.ق)، ص۷۲۔

(۳) شیخ مفید، گزشتہ حوالہ، ص۷۲۔ ۷۰؛ بلاذری اور واقدی نے اس گروہ کی تعداد ۱۸ افراد نقل کی ہے (انساب الاشراف، ج۱، ص ۳۰۱۔ ۲۹۷؛ المغازی، ج۱، ص ۱۵۲؛ اسی طرح سے رجوع کریں؛ بحار الانوار، ج ۱۹، ص ۲۹۳) جنگ خندق، جنگ بدر کے تین سال بعد ہوئی۔ جس وقت عمرو بن عبدود، عرب کا مشہور پہلوان، خندق کے کنارے لڑنے کے لئے چیلنج کر رہا تھا تو علی اس کے مقابلہ میں گئے اس نے علی سے کہا: تمہارا باپ میرا دوست تھا لہٰذا میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم میرے ہاتھ سے قتل ہو! ۔ ابن ابی الحدید معتزلی، نہج البلاغہ کا مشہور شارح اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "ہمارے استاد ابو الخیر مصدق بن شبیب نحوی جس وقت اس حصہ کو پڑھاتے تھے تو کہتے تھے: عمرو نے جھوٹ کہا ہے اس نے علی کی جنگ کو بدر و احد میں دیکھ رکھا تھا لہٰذا اگر ان سے لڑتا تو قتل ہو جاتا، اس وجہ سے بہانہ کیا اور اس طرح سے علی سے لڑنے میں دیر کیا"۔ (شرح نہج البلاغہ، ج۱۹، ص٦٤).

ناپسندی کا اظہار کیا تھا۔[1] اور نیز کچھ بزرگ مہاجروں نے، فوجی کمیٹی میں، اپنی کمزوری کا اظہار کیا اور ناامید کرنے والی باتیں کہیں۔[2] لیکن زیادہ تر مسلمان ایمان میں غرق اور ان کے حوصلہ بلند تھے۔ اور اس طرح سے بہادرانہ انداز میں لڑے کہ مشرکوں کو بہت تعجب ہوا۔

٤۔ خدا کی غیبی مدد[3] چند طریقے سے ہوئی:

الف: جنگ کی رات بارش کا ہونا، جس سے مسلمانوں کی پانی کی ضرورت پوری ہوگئی اور ان کے قدموں کے نیچے کی زمین سخت ہوگئی، اور اس پر چلنا آسان کام ہوگیا۔[4]

ب: اس رات مسلمانوں کو بڑی اچھی نیند آئی[5] اور وہ سکون سے سوئے صرف پیغمبر اسلام ﷺ صبح تک بیدار رہے اور لشکر اسلام کی کامیابی کے لئے دعا کرتے رہے۔[6]

ج: مسلمانوں کی نصرت و مدد کے لئے فرشتوں کا نزول اور ان کا میدان جنگ میں حاضر ہونا۔[7]

د: مشرکین کے دلوں میں رعب و وحشت کا ڈالنا۔[8]

---

(۱) سورۂ انفال، آیت ٦۔ ٥

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص٤؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (انسان العیون) (بیروت: دار المعرفہ)، ج۲، ص٣٨٦۔ ٣٨٥؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۹، ص٢٤٧۔

(۳) سورۂ آل عمران، آیت ۱۲۳

(٤) سورۂ انفال، آیت ۱۱؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص٥٤؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۱٥ و ٢٥۔

(٥) سورۂ انفال، آیت ۱۱؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص٥٤؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص٣٩٢۔ لیکن قریش خوف و اضطراب کی وجہ سے صبح تک بیدار تھے اور تکلیف کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص٥٤۔

(٦) شیخ مفید، گزشتہ حوالہ، ص٧٣؛ مسند احمد، ج ۱، ص١٢٥؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۹، ص٢٧٩۔

(٧) سورۂ انفال، آیت ۹؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٧٩۔ ٧٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٢٨٦

(٨) سورۂ انفال، آیت ۱۲.

اسلامی لشکر کی کامیابی کے نتائج اور آثار

اس جنگ میں، اسلامی فوج کی کامیابی سے جو آثار و نتائج حاصل ہوئے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ خداوند عالم نے پہلے ہی مسلمانوں سے مشرکین کے قافلہ یا مکہ کے فوجیوں کے مقابلہ میں کامیابی کا وعدہ کیا تھا۔(۱) اور پیغمبر اسلا ﷺ م نے جنگ کی کمیٹی کے جلسہ کے آخر میں خدا کا یہ وعدہ مسلمانوں کو پہنچادیا تھا۔(۲) اور خدا کی نصرت و مدد سے اس کامیابی کے ملنے پر مسلمان خوش ہوگئے۔ اور ان کا ایمان و اعتقاد قوی اور مستحکم ہوگیا۔

۲۔ منافقین اور مدینہ کے یہودی اس کامیابی سے بہت ناراض ہوئے اور ذلت و خواری کا احساس کیا جس وقت رسول خدا ﷺ کے نمائندہ نے مسلمانوں کی بڑی کامیابی کی اطلاع مدینہ کے لوگوں کو دی۔ منافقین نے افواہیں پھیلانا شروع کردیں اور کہنے لگے: "محمد ﷺ قتل کردیئے گئے ہیں اور مسلمان شکست کھاکر متفرق ہوگئے ہیں"۔(۳)

یہودیوں نے بھی اپنے کینہ کا اظہار کیا۔(٤) کعب الاشرف، جوکہ یہودیوں کے بزرگوں میں سے تھا، اس نے کہا: یہ جو کہتے ہیں کہ جنگ میں مارے جانے والے عرب کے بڑے اور سربرآوردہ لوگ تھے۔ اگر یہ خبر درست ہے تو اس روئے زمین کی زندگی سے بہتر زمین کے نیچے دفن ہو جانا ہے"۔(٥)

۳۔ اطراف مدینہ کے قبائل: اس کامیابی کو اسلام کی حقانیت اور خدا کی نصرت کی نشانی سمجھ کر

---

(۲) سورۂ انفال، آیت ۷.

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۹.

(٤) گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۵؛ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ، (قاہرہ: دارالمعارف، ط ۳.)، ج ۱، ص ۲۹٤.

(٥) طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۲۹۷.

(٦) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۲۱؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ٥٥؛ رجوع کریں: بیہقی، ج ۲، ص ۳٤۱۔

اسلام کی طرف راغب ہوگئے۔

یعقوبی لکھتاہے: جب خداوند عالم نے جنگ بدر میں اپنے پیغمبر ﷺ کو سرافراز اور کامیاب کردیا اور قریش کے کچھ لوگ قتل ہوگئے تو قبائل عرب، اسلام کی طرف راغب ہوگئے اور کچھ وفود کو پیغمبر ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ آگے لکھتا ہے کہ جنگ بدر کے چار یا پانچ مہینے بعد قبیلہ ربیعہ، سرزمین "ذی قار" میں کسریٰ سے لڑا اور انھوں نے ایک دوسرے سے کہا: کہ میدان جنگ میں اس تہامی (محمد ﷺ) کے شعار سے استفادہ کرو اس وقت وہ یا محمد ﷺ ، یا محمد ﷺ کی فریاد کے ساتھ لڑے اور کامیاب ہوئے۔[1]

٤۔ قریش کے لوگ متوجہ ہوئے کہ محمد ﷺ کی قدرت اور مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگانے میں وہ اپنے محاسبات میں غلطی اور اشتباہ کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ ہرگز تصور نہیں کرتے تھے کہ انھیں اتنی سخت شکست، چند فراری لوگوں کے ہاتھ، کاشتکاروں کی مدد سے، اٹھانی پڑے گی۔ قریش اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی تجارت خطرے میں پڑجائے گی اور اب وہ مکہ کے تجارتی راستے سے شام نہیں جاسکتے ہیں۔

صفوان بن امیہ نے قریش کے سرداروں کے مجمع میں کہا: "محمد ﷺ اور اس کے ساتھیوں نے ہماری تجارت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے نہیں معلوم ان کے ساتھ کیا کریں؟ وہ ساحل کو نہیں چھوڑیں گے اور ساحل کے لوگ سب ان کے ہم پیمان اور ساتھ ہوگئے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کہاں جائیں؟ اس شہر میں ہمارے اخراجات، گرمیوں میں شام کے تجارتی سفر سے اور جاڑوں میں حبشہ کے تجارتی سفر سے، پورے ہوتے تھے۔ اگر ہم اسی طرح اس شہر میں رہیں تو مجبور ہوکر ہمیں اپنا سارا سرمایہ کھانا پڑے گا اور اپنی ساری دولت سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور ہماری زندگی ختم ہو جائے گی"۔

آخرکار اس مجمع میں طے پایا کہ عراق کے راستے سے شام جائیں اس وقت صفوان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ، جس میں تنہا اس کا حصہ تین لاکھ درہم تھا، عراق کے راستے سے شام کی طرف روانہ ہوا۔ پیغمبر اسلا ﷺ م اس قافلہ کی روانگی سے باخبر ہوکر جمادی الآخر ٣ھ میں ایک سو سپاہیوں کا ایک دستہ

---

(١) تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ١٣٨٤ھ.ق)، ج ٢، ص ٣٨.

زیدبن حارثہ کی سربراہی میں ان کے اموال کو ضبط کرنے کے لئے بھیجا۔ جب دستہ وہاں پہنچا تویہودی قافلہ کے اکثر آدمی فرار کر گئے تھے۔ اسلامی سپاہیوں نے ان کے مال کو ضبط کرلیا اور ایک یا دو اسیر کے ساتھ مدینہ پلٹ آئے۔(۱) تاریخ میں اس ماموریت کو "سریۃ القرَدَہ"(۲) کہا گیا ہے۔(۳)

بنی قینقاع کی عہد شکنی

بنی قینقاع، پہلا یہودی قبیلہ تھا جس نے اپنے دوستی اور عدم تجاوز کے عہد کو توڑا۔ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی، یہودیوں اور منافقوں کے لئے بہت شاق ، اور انھیں ناراض کرنے والی تھی۔ اس بنا پر یہ قبیلہ جنگ بدر کے بعد سے، دشمنی دکھانے لگا۔ پیغمبر ﷺ نے ان کو خبردار کیا کہ قریش کے انجام سے نصیحت لو اور مسلمان ہو جائو کیونکہ تم لوگوں نے ہمارے صفات اور نشانیوں کو اپنی کتاب میں پڑھ رکھا ہے اور میری نبوت سے اچھی طرح آگاہ ہو۔(٤)

ان لوگوں نے کہا: قریش پر کامیابی نے تم کو مغرور کردیا ہے، قریش تاجر پیشہ لوگ تھے اگر ہم سے جنگ کی تو دیکھنا کہ ہم اہل جنگ ہیں! ان تکبرانہ باتوںکے ذریعہ انھوں نے پیغمبر ﷺ کی وارننگ پر خاص توجہ نہیں دی، اور اسی طرح اپنے اختلافات کو برقرار رکھا۔ ایک دن ان یہودیوں میں سے ایک نے ،

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۹۸۔ ۱۹۷.

(۲) "سریۃ القرِدہ" بھی نقل ہوا ہے (بحارالانوار، ج ۲۰، ص ٤؛ حوالہ، طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۵ .

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ٥٤۔ ٥۳؛ مجلسی، بحارالانوار، ج ۲۰، ص ٥۔ ٤.

(٤) "قل للذین کفروا ستغلبون و تحشرون الی جہنم و بئس المھاد. قد کان لکم آیۃ فی فئتین التقتا فئۃ تقاتل فی سبیل اللہ و اخریٰ کافرۃ یرونھم مثلیھم رأی العین واللہ یؤید بنصرہ من یشاء ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار" سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۔ ۲۱.

مدینہ کے اطراف میں اس قبیلہ کے ایک بازار میں، ایک انصار کی زوجہ کی اہانت کی۔ اس حرکت سے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اس عورت نے مسلمانوں سے فریاد کی تو ایک مسلمان نے اس یہودی کو قتل کردیا۔ اس پر سارے یہودی، اس مسلمان پر ٹوٹ پڑے اور اسے قتل کردیا۔ اس فتنہ انگیزی کی وجہ سے دو لوگ مارے گئے لیکن اگر وہ حسن نیت سے کام لیتے تو دوبارہ امنیت کا برقرار ہونا ممکن تھا، اور اس طرح کے واقعات دوبارہ پیش نہ آتے۔ لیکن ان لوگوں نے احتیاطی تدبیریں اپنانے کے بجائے قلعہ میں جاکر پناہ لے لی اور مسلمانوں کے خلاف مورچہ سنبھال لیا۔

پیغمبر اسلا ﷺ م نے ان کے قلعہ کے محاصرہ کا حکم صادر فرمایا۔ پندرہ دن محاصرہ کے بعد، عبد اللہ ابن ابی (خزرجی) جو کہ پہلے ان کا ہم پیمان تھا اس کے کہنے پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے موافقت کی کہ وہ اپنے اسلحوں کو چھوڑ کر مدینہ کے باہر چلے جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ شام کے "اذرعات" علاقہ میں چلے گئے۔ یہ واقعہ ہجرت کے دوسرے سال ماہ شوال میں پیش آیا۔(۱)

بنی قینقاع، شجاع ترین یہودی تھے(۲) اور جیسا کہ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سازو سامان اور قدرت پر مغرور تھے۔ اور شاید اپنے ہم نواؤں، خزرج اور بنی عوف(۳) کی حمایت سے بھی دلگرم ہوگئے تھے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ خزرجی جو کہ سب سے آگے تھے اور واسطہ بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی ان کی سزاؤوں کے کم کرانے میں کچھ نہیں کرسکے(٤) عبادہ بن صامت عوفی بھی ان سے الگ ہوگئے۔(۵)

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۵۲۔ ۵۰؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۰۹۔ ۳۰۸؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۲۹۸۔ ۲۹۷.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۸.

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۸؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۵۰.

(٤) گویا پیغمبر اسلا ﷺ م نے عبد اللہ بن ابی کے واسطہ بننے کو اس اعتبار سے قبول کیا کہ بظاہر وہ مسلمان تھا اور مسلمانوں کی وحدت کی بقاء اور فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے کوشش کررہا تھا۔

(۵) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۹.

دوسری طرف سے یہودیوں کے دو قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ کے پہلے ہمنوا، اوسی تھے اور گویا اسی وجہ سے وہ بنی قینقاع کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھے۔ اور شاید سعد بن معاذ۔ اوس کا سردار۔ اس بحران میں ان کے مداخلہ کو روکنے کے لئے اہم کردار رکھتا تھا۔ بہر حال مدینہ سے اس قبیلہ کی جلاوطنی، مسلمانوں کے لئے مفیدثابت ہوئی۔ اور اس طرح سے ان تینوں قبیلوںکی قدرت بھی بٹ گئی اور مدینہ کے بقیہ یہودیوں کے لئے ایک طرح سے وارننگ بھی تھی کہ اس طرح کی غلطیاں وہ آئندہ نہ کریں۔

جناب فاطمہ زہرا سے حضرت علی کی شادی

جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد دوسرا مبارک واقعہ جو خانۂ حضرت محمد ﷺ میں رونما ہوا، وہ علی کی شادی تھی جو آپ ﷺ کی دختر، فاطمہ زہرا سے ہوئی۔[۱]

فاطمہ زہرا، پیغمبر اکرم ﷺ کے خاص اکرام و احترام کے لحاظ سے اور اپنی لیاقت اور ممتاز شخصیت و فضیلت کے اعتبار سے ایسی خاتون تھیں جن کے متعدد لوگ خواستگار تھے۔ پیغمبر اسلا ﷺ م کے چند معروف اصحاب، جن میں بعض سرمایہ دار بھی تھے، ان سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پیغمبر ﷺ نے

موافقت نہیں کی[۲] اور فرمایا: "خدا کے فیصلہ کا منتظر ہوں"[۳] انھوں نے حضرت علی کو مشورہ دیا کہ فاطمہ کی خواستگاری کے لئے جائیں۔

پیغمبر ﷺ نے جناب فاطمہ کی رائے معلوم کرنے کے بعد علی کی خواستگاری کی موافقت کردی۔[٤]

---

(۱) مجلسی، بحارالانوار، ج ٤٣، ص ۹۷

(۲) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ۱۰۸؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳٤.

(۳) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، (بیروت: دار صادر)، ج ۸، ص ۱۹.

(٤) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۳.

اور اپنی دختر سے فرمایا: "تجھ کو ایسے شخص کی زوجیت میں دے رہا ہوں جو سب سے نیک اور اسلام لانے میں پیش قدم تھا"[(۱)] اور علی سے بھی فرمایا: "قریش کے کچھ لوگ ہم سے نالاں ہیں کہ کیوں اپنی دختر انھیں نہیں دی۔ میں نے ان کے جواب میں کہا: یہ کام خدا کے ارادہ سے ہوا ہے۔ فاطمہ کی ہمسری کے لئے علی کے علاوہ کوئی شائستگی نہیں رکھتا ہے"۔[(۲)]

یہ شادی نہایت ہی سادگی اور خوشحالی کے ساتھ تھوڑے سے مہر[(۳)] اور مختصر سے جہیز کے ساتھ انجام پائی[(٤)] جو اسلام میں ازدواجی روابط کے لئے معنوی قدر و قیمت کے اعتبار سے اعلیٰ ترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

جنگ احد

قریش نے جنگ بدر میں شکست کھانے کے بعد، مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے تجارتی قافلہ کے منافع کو خرچ کر کے، مدینہ پر حملہ کرنے کے مقدمات فراہم کرلئے۔[(٥)] اور بعض قبائل کی حمایت حاصل کرکے بہت سارے جنگی سازو سامان[(٦)] کے ساتھ مکہ سے نکل پڑے اور میدان جنگ میں

---

(۱) امینی، الغدیر، ج۳، ص۲۰.

(۲) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۲.

(۳) گزشتہ حوالہ، ص ۱۱۲.

(٤) مزید آگاہی کے لئے رجوع کریں: ڈاکٹر سید جعفر شہیدی، زندگانی فاطمہ زہرا (تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳٦٥ ھ.ق)، ص ۷٦۔ ٤٤؛ امیر مھنا الخیامی، زوجات النبی و اولادہ، (بیروت: موسسہ عزالدین، ط ۱، ۱٤۱۱ھ.ق)، ص ۳۲۸۔ ۳۲۲.

(٥) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۰۰؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٤؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۲، ص۳۷.

(٦) مشرکین کے سپاہیوں کی تعداد تین ہزار تھی جن میں سات سو افراد زرہ پوش، دو سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے۔ (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰٤۔ ۲۰۳؛ محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۷؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ (قاہرہ: دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹٦۲م)، ج ١٤، ص ۲۱۸.

سپاہیوں کی تشویق کے لئے کچھ عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔[۱]

پیغمبر اسلا ﷺ م، مکہ میں اپنے چچا عباس کی مخفی خبر کے ذریعہ قریش کے ارادے سے آگاہ ہوگئے۔[۲] اور آپ نے ایک فوجی کمیٹی بناکر دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے، مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ عبد اللہ ابن ابی اور انصار کے کچھ بزرگ نیز بعض مہاجر شخصیتیں جیسے حمزہ، چاہتے تھے کہ شہر کے باہر دشمن سے مقابلہ کریں کیونکہ شہر میں رہنا دشمن کی جرأت کا باعث بنے گا اور مسلمانوں کی ناتوانی اور کمزوری کی علامت قرار پائے گا۔ اور جنگ بدر میں سپاہ اسلام کی قدرت نمائی کے اعتبار سے نامناسب سمجھا جائے گا۔[۳]

آخر کار پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس بہادر او رانقلابی گروہ کی رائے کو قبول کیا او رایک ہزار[٤] افراد کے ساتھ احد* کے پہاڑ کی طرف چل دیئے۔ بیچ راستے میں عبد اللہ بن ابی یہ بہانہ کر کے کہ پیغمبر ﷺ نے جوانوں کے مشورے پر عمل کیا اور ہماری رائے کو نظر انداز کیا[٥] اور نیز اس بات کو دلیل بنا کر کہ

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۳۔ ۲۰۲؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۷؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٦٦.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰٤ اور ۲۰٦؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ١٤، ص ۲۷؛ ایک نقل کی بنا پر قبیلہ خزاعہ جو کہ دوست دار پیغمبر ﷺ اور مسلمان تھا۔ اس موضوع سے پیغمبر ﷺ کو باخبر کیا (ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ص ۲۱۸)، اور ممکن ہے کہ دونوں طریقوں سے خبر پہنچی ہو۔

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۱۲۔ ۲۱۰، ۲۱۳؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٦۷؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۳۸.

(٤) ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج ۱، ص ۱۹۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۱۱۷.

* احد پہاڑ، مدینہ کے شمالی سمت میں واقع ہے۔ اور قدرتی روکاوٹوں کی بنا پر دشمن جنوب کی سمت سے مدینہ میں داخل نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا مجبور تھا کہ اطراف شہر کا چکر لگا کر شمال کی سمت سے حملہ کرے۔ (محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ در میدان جنگ، ترجمہ سید غلام رضا سعیدی (تہران: مرکز انتشارات محمدی، ۱۳٦۳ھ.ش)، ص ۸۵۔ ۷۹.

(٥) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۱۹؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۳۹؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٦۸.

جنگ نہیں ہوگی۔[1]، تین سو (۳۰۰) افراد کے ساتھ مدینہ پلٹ آیا۔

اسلامی لشکر جس کی تعداد کم ہوکر سات سو (۷۰۰) افراد ہوچکی تھی،[2] پیغمبر اسلا ﷺ م لشکر اسلام کی تعداد کم ہونے کے باعث انھیں احد پہاڑ کے کنارے روکا۔ اس پہاڑ کو پیچھے، مدینہ کو اپنے سامنے، اور عینین پہاڑ کو مسلمانوں کے داہنی طرف قرار دیا[3] اسلامی لشکر مغرب کی سمت اور مشرکین، مشرق کی سمت میں تھے۔[4] اس وقت پیغمبر اسلا ﷺ م نے پورے علاقے پر فوجی نقطۂ نظر سے، نظر دوڑائی تو آپ کی توجہ عینین پہاڑ کی طرف مرکوز ہوگئی؛ کیونکہ ممکن تھا کہ دوران جنگ، دشمن اس گوشے سے مسلمانوں کے محاذ کے پیچھے پہنچ جائے۔ اس بنا پر ایک مسلمان کمانڈر عبد اللہ بن جبیر کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ اس گوشہ کی حفاظت کے لئے مامور کیا اور فرمایا: "چاہے ہم جیتیں یا ہاریں، تم لوگ یہیں رہنا اور اسپ سوار لشکر کو تیر اندازی کے ذریعہ ہم سے دور کردینا تاکہ پشت کی جانب سے ہم پر حملہ نہ کرسکیں"[5] *

---

(۱) سورۂ آل عمران، آیت ۱٦۷؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۱۹؛ طبرسی، مجمع البیان (شرکة المعارف الاسلامیہ، ۱۳۷۹ھ.ق)، ج۲، ص ۵۳۳.(۲) طبرسی، اعلام الوریٰ، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ط۳)، ص ۸۰؛ ابو سعید واعظ خرگوشی، شرف النبی، ترجمہ: نجم الدین محمد راوندی (تہران: انتشارات بابک، ۱۳٦۱ھ.ش)، ص ۳٤۵؛ حلبی، السیرة الحلبیہ (انسان العیون)، (بیروت: دار المعرفہ)، ج۲، ص ٤۹٤؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۷۰.(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۰؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۹؛ نور الدین سمہودی، وفاء الوفاء با اخبار دار المصطفیٰ (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ط ۳، ۱٤۰۱ھ.ق)، ج ۱، ص۲۸٤.(٤) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۲۲۰۔(۵) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۲۵ و ٤۹؛ رجوع کریں: ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۷۰؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤۰۔ ۳۹؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۸۵؛ محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۳، ص ۱٤.

* تاریخی کتابوں میں، مسلمان تیر اندازوں کے مورچہ سنبھالنے کی جگہ کو "پہاڑ" یا وادی کا دہانہ کہا گیا ہے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ احد پہاڑ کے شگاف کی جگہ یہی ہے کہ جہاں سے جنگ کے دوسرے دور میں خالد بن ولید نے مسلمانوں پر حملہ کیا تھا۔ لیکن محمد بن سعد کاتب، واقدی، جس کے استاد کی رپورٹیں اور خبریں پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ کی جنگوں کے بارے میں، خاص طور پر جغرافیائی لحاظ سے معتبر اور مستند ہیں، (المغازی، تحقیق: مارسڈن جونس، مقدمہ، ص ٦، ق ۳۱)، وہ اس حصہ کو عینین کے نام سے ذکر کرتا ہے (طبقات الکبریٰ، ج۲، ص ۳۹)، کہ جس کے بارے ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک پہاڑ تھا جو لشکر اسلام کے بائیں طرف موجود تھا۔ اور شاید اس لحاظ سے کہ اس کے بغل میں دو چشمے تھے۔ (الطبقات الکبریٰ، ج۲، ص ۳۹)، اس کا نام عینین رکھا گیا ہو؛ کیونکہ عین کا ایک معنی، چشمہ ہے۔ مسلمانوں کے قدیم جغرافیہ دانوں نے اس حصہ کو پہاڑ کہا ہے۔ یاقوت حموی لکھتا ہے: "عینین احد کا ایک پہاڑ ہے، اس کے اور احد کے درمیان ایک وادی ہے" (معجم البلدان، ج٤، ص ۱۷٤؛ مادہ عین، عبد اللہ بکری اندلسی بھی کہتا ہے: "عینین پہاڑ، احد میں واقع ہے اور پیغمبر اسلا ﷺ م نے جنگ احد میں تیر اندازوں کو اس پہاڑ پر ٹھہرا رکھا تھا" (معجم ما استعجم من سماء البلاد و المواضع، ج۳، ص ۹۷۸؛ مادہ عین) تمام دستاویزات اور تاریخی و جغرافیائی قرائن و شواہد اور علاقہ احد کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ عینین سے مراد ایک مٹی کا ٹیلہ تھا جو احد پہاڑ کے سامنے اور شہر مدینہ کے بائیں طرف واقع تھا اور جنگ اس ٹیلہ اور پہاڑ کے بیچ میں ہوئی ہے، اس جنگ کے شہدائ، میدان جنگ ہی میں مدفون ہیں اور ان کی قبریں ان دونوں کے بیچ میں ہیں۔ اس بنا پر تیر اندازوں کے مورچہ سنبھالنے کی جگہ، احد کے پہاڑ میں نہیں تھی اور جیسا کہ خود مؤلف نے نزدیک سے اس جگہ کا مشاہدہ کیا ہے۔ اصولی طور پر احد پہاڑ میں کوئی ایسا شگاف نہیں موجود جس سے دو سو (۲۰۰)، گھوڑ سوار سپاہی گزر سکیں۔ پروفیسر محمد حمید اللہ، جس نے ۱۹۳۲۔ ۱۹٤۵۔ ۱۹٤۷۔ ۱۹٦۳، عیسوی میں جنگ احد کے میدان کا دقیق طور سے مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے اس سلسلہ میں اس نے اہم اور قیمتی تحقیقات انجام دی ہیں۔ رجوع کریں (رسول اکرم ﷺ در میدان جنگ، ترجمہ سید غلام رضا سعیدی، ۹۵۔ ۹۲.

ابوسفیان نے بھی لشکر کو آراستہ کیا اور علم دار کا انتخاب کیا، اس زمانہ میں "علمدار" میدان جنگ میں بہت اہم کردار ادا کرتا تھا اوریہی وجہ ہے کہ علم کو کسی بہادر اوردلیر شخص کے ہاتھ میں دیا جاتا تھا۔ علمدار کی استقامت و پائیداری اور میدان جنگ میںعلم کا لہرانہ، سپاہیوں کے جوش و خروش کا باعث قرار پاتا تھا۔ اوراس کے برخلاف علمدار کا مارا جانا اور علم کی سرنگونی ان کے حوصلے کے پست اور ثبات قدم میں لغزش کا باعث بنتی تھی۔

ابوسفیان نے علمداروں کو قبیلۂ "بنی عبد الدار" سے (جو کہ شجاعت اور بہادری میں مشہور تھے)

انتخاب کیا اوران سے کہا: ہم جانتے ہیں کہ تم عبدالدار علمداری کے لئے ہم سے لائق تر ہو اور علم کی اچھی طرح سے حفاظت کرتے ہو اور ہمارے خیال کو اس طرف سے مطمئن رکھو گے کیونکہ جب لشکر کا علم سرنگوں ہو گیا تو وہ لشکر ٹک نہیں پائے گا"۔[۱]

جنگ کے پہلے مرحلے میں مسلمانوں کی فتح

ہجرت کے تیسرے سال[۲] ۱۵ شوال کو جنگ شروع ہوئی اور زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مسلمان جیت گئے اور مشرکین ہار کھا کر بھاگنے لگے۔ ان کے شکست کی وجہ ،بہت زیادہ نقصان نہیں تھی؛ کیونکہ جنگ کے آخر تک کل نقصان (اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تعداد جو نقل ہوئی ہے) پچاس افراد سے زیادہ کا نہیں ہوا تھا۔[۳] اور یہ تعداد لشکر شرک کی کل تعداد کے بہ نسبت، بہت ہی کم تھی۔ بلکہ ان

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۲۲۱؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۱۰۶۔

(۲) مجلسی، بحار الانوار، ج ۲۰، ص ۱۸؛ عسقلانی، الاصابہ فی تمیز الصحابہ، دار احیاء التراث العربی، ط ۱، ۱۳۲۸ھ.ق، ج ۱، ص ۳۵٤۔ تیسرے ساتویں، آٹھویں، نویں، اور گیارہوں روز بھی بیان کیا گیا ہے۔ (تاریخ الامم و الملوک، ج ۳، ص ۱٤، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی، ج ۱، ص ۲۸۱.)

(۳) رجوع کریں: السیرۃ الحلبیہ، ج ۲، ص ۵٤۷، کل قتل ہونے والے مشرکین کی تعداد ۲۳ اور ۲۸ افراد نقل ہوئی ہے ۔ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ، ج ۱۵، ص ۵٤؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ٤۳؛ بلاذری، اسباب الاشراف، ج ۱، ص ۳۲۸.

کے شکست کھانے کی وجہ علمدار کا مارا جانا تھا۔ ان میں سے نو افراد علی کے قوی ہاتھوں کے ذریعہ ہلاک ہوئے تھے۔[۱] اور مسلسل علم کے گرنے کی وجہ سے ان کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ فرار کرنے لگے۔[۲]

علی نے بعد میں اس موضوع کو دلیل بنایا جیسا کہ عمر کے قتل ہو جانے کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو چھ افراد پر مشتمل شوریٰ بنی اس میں اس موضوع کو آپ نے اپنے درخشاں کارناموں کا ایک حصہ سمجھ کر تذکرہ کیا جس کی تائید شوریٰ کے افراد نے کی۔[۳]

قریش کے علمدار کے قتل ہونے کے بعد لشکر شرک کی صفوں میں ہلچل مچ گئی اور سب فرار کرنے لگے۔ اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کرتے وقت جب میدان جنگ میں مال غنیمت کو دیکھا تو اس کو اکٹھا کرنے میں مشغول ہوگئے۔ اکثر تیر اندازوں نے جب یہ منظر دیکھا تو مال غنیمت جمع کرنے کی لالچ میں اس خیال سے کہ جنگ ختم ہوچکی ہے اپنے محاذ کو چھوڑ دیا اور پیغمبر اسلا ﷺ م کے دستور کے بارے میں عبد اللہ بن جبیر کے خبردار کرنے پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔[٤]

---

(۱) شیخ مفید، الارشاد (قم: الموتمر العالمی لالفیۃ الشیخ المفید، ط ۱، ۱٤۱۳ھ-ق)، ص ۸۸؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۵۱؛ مجمع البیان، (شرکۃ المعارف الاسلامیہ)، ج۲، ص ٤۹٦۔

(۲) طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۷؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤۱؛ سمہودی، وفاء الوفائ، ج۱، ص ۲۸۸؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۲٦.

(۳) صدوق، الخصال، (قم: منشورات جامعۃ المدرسین فی الجامعہ العلمیہ، ۱٤۰۳ھ.ق)، ص ٥٦۰.

(٤) سورۂ آل عمران، آیت ۱٥۲.

مشرکوں کی فتح

تیراندازوں کی خلاف ورزی کے سبب جنگ کی صورت حال بدل گئی؛ کیونکہ خالد بن ولید نے دو سو (۲۰۰) سواروں کے ساتھ اس جگہ پر حملہ کردیا جہاں کے بارے میں پیغمبر ﷺ نے اپنے سپاہیوں کو آگاہ کیا تھا اور عبد اللہ بن جبیر کو بچے ہوئے دس افراد کے ساتھ شہید کردیا اور پشت محاذ سے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔

دوسری طرف سے عمرۃ علقمہ کی لڑکی اور قریش کی ایک عورت جو کہ میدان جنگ میں موجود تھی نے علم کو زمین سے اٹھا کر فضا میں لہرا دیا۔[1] قریش خالد کے حملے اور پرچم کو لہراتا ہوا دیکھ کر خوشحال ہوگئے اور انھوں نے دوبارہ حملہ کردیا۔[2] چونکہ اس وقت مسلمانوں کی فوج تتر بتر گئی تھی اور کمانڈروں کا رابطہ سپاہیوں سے ٹوٹ گیا تھا۔ لہٰذا وہ مقابلہ نہیں کرسکے اور بری طرح سے شکست کھاگئے۔ چند دوسرے محرکات بھی اس شکست کا باعث بنے، وہ یہ ہیں:

۱۔ پیغمبر اسلا ﷺ م کے قتل ہونے کی افواہ۔[3]

۲۔ اس زمانے میں دونوں طرف کی فوجیں مخصوص لباس نہیں رکھتی تھیں اور میدان جنگ میں

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۸۳؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۷؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۵۱؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۲، ص ۴۹۶۔ حسان بن ثابت پیغمبر اسلا ﷺ م کا شاعر نے اس مناسبت سے ایک شعر میں قریش کی مذمت کی ہے اور کہا ہے: اگر اس دن عمرہ نہ ہوتا تو بردہ فروشوں کے بازار میں بیچ دیئے جاتے (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۸۴؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ۱۴ ص ۲۱۷.

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۴۲۔ ۴۱؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۸۲؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۷؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۴۹۔۲۶.

(۳)ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۸۲؛ گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۷؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۲۷۔ ۲۶.

صرف نعروں کے ذریعہ ایک دوسرے کی فوج کو پہچانا جاتا تھا۔ جب قریش نے دوبارہ حملہ کیا تو مسلمانوں کی صفیں زیادہ سرگرداں ہوگئیں اور ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے اور آپس میں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح تلوار چلانے لگے[۱] کہ حسیل بن جابر (حذیفہ بن یمان کے والد) مسلمانوں کے ہاتھ مارے گئے۔[۲] لیکن جب اپنی حالت سمجھ گئے تو دوبارہ نعرہ بلند کیا اور جنگ کا نقشہ بدلا۔[۳]

۳۔ ہوا نے سمت بدلی، اس وقت تک جو ہوا مشرق سے چل رہی تھی۔ وہ مغرب سے چلنے لگی اور جنگ کو مسلمانوں پر دشوار کردیا۔[٤]

بہرحال مسلمانوں کی صفیں اس طرح سے منتشر ہوئیں کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ فرار کر گئے اور کچھ لوگ پہاڑ کی چوٹی پر بھاگ گئے جبکہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے خود میدان جنگ میں مقابلہ کیا اور بھاگنے والوں سے پائیداری اور استقامت کے لئے کہا۔[٥] صرف علی اور چند دوسرے افراد میدان جنگ میں ڈٹے رہے۔[٦]

علی، پیغمبر ﷺ کے بغل میں کھڑے ہوکر تلوار چلا رہے تھے اور کئی مرتبہ انھوں نے پیغمبر ﷺ سے دشمنوں

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤۲؛ رجوع کریں: وفاء الوفائ، ج۱، ص ۲۸٦.

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤۳ و ٤٥؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۹۳؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۸۸؛ سید علی جان مدنی، الدرجات الرفیعہ (قم: منشورات مکتبۃ بصیرتی، ۱۳۹۷ھ.ق)، ص ۲۸۳.

(۳) بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف، ط ۳،)، ص ۳۲۲.

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤۲.

(٥) سورۂ آل عمران، آیت ۱٥٤ ۔ ۱٥۳؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۳۱۸؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۰؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ٤۷؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱٥، ص ۲۳ و ۲٥.

(٦) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤۷؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ۱٥، ص ۲۱ و ۲۹.

کے حملوں کو دور کیا[1] اور آپ کی بے نظیر استقامت و پائیداری کی بنا پر آسمان احد میں صدائے غیبی گونجی: لا فتیٰ الا علی و لاسیف الا ذوالفقار۔[2]

یہاں تک کہ ایک مسلمان نے پیغمبر ﷺ کو پہچان لیا اور میدان جنگ میں باقی رہ جانے والے چند افراد (یا فرار کے بعد واپس آنے والے افراد) آنحضرت ﷺ کے گرد اکٹھا ہوئے اور جنگ کے عالم میں احد پہاڑ کے کنارے پہنچے[3] اور جنگ کی گرد و غبار بیٹھی۔

اس موقع پر ابوسفیان نے مسلمانوں کے حوصلہ کو کمزور کرنے کے لئے افواہیں پھیلانا شروع کردیں اور نفسیاتی جنگ چھیڑ دی اور نعرے لگانے لگا: اعل ھبل اعل ھبل، سرفراز ہو اے ھبل، سرفراز ہو اے ھبل! پیغمبر ﷺ نے اس کے نعرے کے جواب میں فرمایا: اللّٰہ اعلیٰ و اجل۔ خدا بلند و برتر ہے! ابوسفیان نے کہا: لنا العزی و لاعزی لکم۔ ہم عزی بت رکھتے ہیں اور تم عزی نہیں رکھتے ہو۔ پیغمبر ﷺ کے حکم سے ایک مسلمان نے اس کے جواب میں کہا: اللّٰہ مولیٰ و لا مولیٰ لکم۔ خدا ہمارا مولا ہے اور تمہارا کوئی مولا نہیں ہے۔[4]

---

(۱) شیخ مفید، الارشاد، (قم: المؤتمر العالمی لالفیہ الشیخ المفید، ۱۴۱۳ھ.ق)، ص ۸۹؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۱۴، ص ۲۵۰؛ حافظ بن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق (ترجمہ الامام علی ابن ابی طالب)، تحقیق: محمد باقر المحمودی (بیروت: دارالتعارف للمطبوعات، ط ۱، ۱۳۹۵ھ.ق)، ج ۱، ص ۱۵۰؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۸۸.

(۲) طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۱۷؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ۱۴؛ شیخ مفید، گزشتہ حوالہ، ص ۸۷؛ مجلسی گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۵۴، ۱۰۵، ۱۰۷۔

(۳) طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۱۹؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۸۹۔۸۸؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۵۴۔

(۴) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۴۸۔ ۴۷؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۲۷؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۲۴؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج ۱۵، ص ۳۱۔ ۳۰؛ ابوسعید واعظ خرگوشی، شرف النبی، ترجمۂ نجم الدین محمود راوندی (تہران: انشارات بابک، ۱۳۶۱ھ.ق)؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۵۳۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۳۲ و ۴۵.

اس جنگ میں (بنا بر مشہور) ستر[۱] افراد مسلمانوں میں سے جن میں جناب حمزہ رسول ﷺ کے چچا اور مصعب بن عمیر بھی تھے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ جبکہ احد میں مسلمانوں نے شکست کھائی اور قریش کے سپاہیوں میں سے کوئی نہیں مرا اور ظاہری محاسبات کی بنیاد پر اگر وہ لوگ، اس وقت مدینہ پر بھی حملہ کرتے تو کامیاب ہوجاتے لیکن قریش کے سردار، اس اقدام[۲] کے انجام سے پریشان ہوئے اوراس سے چشم پوشی کر کے مکہ واپس چلے گئے اور مسلمانوں سے انتقام لیکر خوش ہوگئے تھے کہ بدر میں جتنے لوگ ان کے مارے گئے تھے اتنے کو انھوںنے قتل کردیا ہے جبکہ نہ مدینے کو کوئی نقصان پہنچا تھا اور نہ شام کا تجارتی راستہ آزاد ہوا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں دشمن یہ گمان نہ کریں کہ مسلمانوں کو کچل دیا ہے۔ اور مدینہ پر حملہ کی جرأت نہ کرسکیں، پیغمبر ﷺ نے جنگ کے ایک دن بعد، اسلامی سپاہیوں کے ساتھ جو زیادہ تر زخمی تھے، سرزمین "حمراء الاسد" تک مشرکوں کا پیچھا کیا اور جب اطمینان حاصل ہوگیا کہ وہ دوبارہ حملے کا ارادہ نہیں رکھتے تو آپ مدینہ پلٹ آئے۔[۳]

---

(۱) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۲۸؛ طبرسی، اعلام الوریٰ (تہران: دارالکتب الاسلامیہ، ط ۳)، ص ۸۲؛ ابوسعیدواعظ خرگوشی، گزشتہ حوالہ، ص ۳٤٦؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۲۹۲۔ ۲۹۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۱۸؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٥٤۷.

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۱۰؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٥٥۰.

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۰۷ اور ۱۱۰؛ ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱٥، ص ۳۳۔ ۳۱؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٥٥۰؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ٤۰، ٤۱ اور ۹۹.

جنگ احد کے نتائج

جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کے کچھ آثار و نتائج یہ ہیں:

۱۔ اگرچہ اس جنگ میں فوجی لحاظ سے مسلمانوں نے شکست کھائی۔ لیکن ان کے لئے یہ عبرت تھی کہ آئندہ فرمان پیغمبر ﷺ سے سرپیچی نہ کریں اور بعد کی جنگوں میں اس طرح کی خلاف ورزیاں دوبارہ نہ ہوں۔

۲۔ منافقین فتنہ انگیزی پر اتر آئے اور مسلمانوں کی شکست پر خوشی کا اظہار کرنے لگے لہذا ان کی مذمت کی گئی۔[۱]

۳۔یہودیوں نے بھی اپنے کینہ کو آشکار کردیا اور کہا: محمد ﷺ ، بادشاہی کے چکر میں ہیں۔ اور کوئی بھی پیغمبر اس طرح سے شکست نہیں کھایا ہے۔[۲]

٤۔ دشمنان اسلام، اطراف مدینہ میں گستاخ ہوگئے اور سازش اور فتنہ انگیزی کرنے لگے۔

مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے قبیلۂ بنی اسد کی ناکام نقل و حرکت کا نمونہ واقعۂ"رجیع" اور واقعہ "بئر معونہ" ہے۔

٥۔ مسلمانوں کے مدینہ پلٹنے کے بعد غم و اندوہ کا بادل شہر پر چھا گیا اور مایوسی اور ناامیدی پورے شہر میں نظر آرہی تھی۔ اور منافقوں اوریہودیوں کے شیطانی وسوسے بھی احد میں ابوسفیان کی نفسیاتی جنگ کو مدینہ میں اپنائے ہوئے تھے اور اس طرح نقصان پہنچا رہے تھے. خداوند عالم نے سورۂ آل عمران کی کچھ آیات کے ذریعہ ان کے اثرات کو ختم کیا اور مسلمانوں کے حوصلہ کو بلند کیا۔ ابن اسحاق کے کہنے کے مطابق اس سورہ کی ٦٠ آیتیں جنگ احد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔[۳]

خداوند عالم نے ان آیات میں مسلمانوں کو شکست کے راز کی طرف متنبہ کیا ہے اور ان کو خبردار کیا ہے کہ اگر "فوجی شکست" کھائے ہیں تو وہ ناامید نہ ہوں کہ "نفسیاتی شکست" بھی کھائیں اور نیز ان کو متوجہ کیا کہ ان کے "شکست کا راز"، "فوجی قوانین کی عدم پابندی" اور مال دنیا کی طرف توجہ تھی اگر بدر میں خدا کی مدد سے کامیاب ہوئے تو اس بنا پر تھا کہ صرف خدا کے لئے لڑ رہے تھے لیکن اس جنگ میں مال غنیمت کے چکر میں پڑ گئے اور شکست کھا گئے۔ (یہاں پر سورہ آل عمران کی کچھ آیات کا ترجمہ پیش ہے)

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۱۸۔ ۳۱۷.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۱۷؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٥٤٩.

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۱۲.

"اور اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی ہے جب کہ تم کمزور تھے لہٰذا اللہ سے ڈرو شاید تم شکر گزار بن جاؤ"۔

اور اللہ و رسول کی اطاعت کرو کہ شاید رحم کے قابل ہو جاؤ خبردار سستی نہ کرنا، مصائب پر محزون نہ ہونا اگر تم صاحب ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچی تو قوم کو بھی (دشمنوں) اس سے پہلے (بدر میں) ایسی ہی تکلیف پہنچ چکی ہے اور ہم ایام (فتح و شکست) کو لوگوں کے درمیان الٹتے پلٹتے رہتے ہیں تاکہ خدا صاحبان ایمان کو دیکھ لے اور تم میں سے بعض کو گواہ قرار دے اور وہ ظالمین کو دوست نہیں رکھتا ہے۔

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ گے جب کہ خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو بھی نہیں جانا ہے تم موت کی ملاقات سے پہلے اس کی بہت تمنا کیا کرتے تھے اور جیسے ہی اسے دیکھا، دیکھتے رہ گئے خدا نے اپنا وعدہ اس وقت پورا کردیا جب تم اس کے حکم سے کفار کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا اور آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور راس وقت خدا کی نافرمانی کی جب اسنے تمہاری محبوب شے کو دکھلادیا تھا۔ تم میں کچھ دنیا کے طلب گار تھے اور کچھ آخرت کے۔ اس کے بعد تم کو ان کفار کی طرف سے پھیر دیا تاکہ تمہارا امتحان لیا جائے اور پھر اس نے تمہیں معاف بھی کردیا کہ وہ صاحبان ایمان پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔

کیا جب تم پر وہ مصیبت پڑی جس کی دوگنی تم کفار پر ڈال چکے تھے تو تم نے یہ کہنا شروع کردیا کہ یہ ایسے ہوگیا تو پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ یہ سب خود تمہاری طرف سے ہے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔[۱]

جنگ احد میں شکست سے مسلمانوں کے فوجیوں کا اعتبار ختم ہوگیا او رباعث بنا کہ مدینہ کے اطراف یئنڈشمنان اسلام، مسلمانوں کے خلاف سازش کریں اور مدینہ پر حملہ کی سازش اور نقشہ تیار کرنے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب، مسلمانوں کی فوجی کمزوری کی خاطر تھا۔[۲] ان سازشوں کے چند نمونے یہ ہیں:

---

(۱) سورۂ آل عمران، ۱۲۳، ۱۳۲، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۲ اور ۶۵ ویں آیتیں.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۴۲.

۱۔ سریۂ ابوسلمہ: پیغمبر اسلا ﷺ م کو خبر ملی کہ "قبیلۂ بنی اسد" نے مدینہ پر حملے کا ارادہ کرلیا ہے لہٰذا آنحضرت ﷺ نے، ابوسلمہ کو ایک سو پچاس افراد کا کمانڈر بنا کر ان کے علاقہ میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ قبل اس کے کہ دشمن حملہ کریں تم ان پر حملہ کردینا۔ لہٰذا یہ لوگ نزدیک راستے سے، بہت تیزی کے ساتھ بنی اسد کی سرزمین پر پہنچ گئے۔ جب ان کے قافلہ والوں نے دیکھا تو مبہوت اور ہواس باختہ ہوگئے اور فوراً فرار کرگئے اور ابوسلمہ مال غنیمت اورچند اسیروں کو لے کر مدینہ پلٹ آئے۔[۱]

اس کامیابی سے کسی حد تک مسلمانوں کے فوجیوں کا اعتبار بلند ہوا او رمنافقین ویہودی اوراطراف مدینہ کے قبائل سمجھ گئے کہ ان کی سوچ و فکر کے برخلاف، مسلمان ابھی کچلے نہیں گئے ہیں۔

۲۔ واقعۂ رجیع: ماہ صفر ۴ھ میں قبیلۂ "بنی لحیان" کے ورغلانے پر "قبیلۂ عضل و قارہ" کے چند افراد، مدینہ میں داخل ہوئے اور اظہار اسلام کے ساتھ پیغمبر ﷺ سے کہا: ہمارے قبیلہ سے کچھ افراد مسلمان ہوگئے ہیں، کسی کو آپ بھیجئے جو ہم کو قرآن اور اسلامی احکام کی تعلیمات دے، پیغمبر اسلا ﷺ م نے دس افراد* کو ان کے ہمراہ بھیجا۔ جب وہ لوگ قبیلۂ ہذیل کے "رجیع" نامی مقام پر پانی کے کنارے پہنچے تو قبیلۂ عضل و قارہ کے افراد نے بنی لحیان کی مدد سے ان پر حملہ کردیا، مبلغین اسلام نے دفاع کیا لیکن ایک طرفہ جنگ میں اکثر شہید ہوگئے اور دو افراد اسیر ہوئے۔ مشرکین ان دو اسیروں کو مکہ لے کر گئے اور انھیں جنگ بدر کے مقتولین کے ورثہ کے ہاتھوں بیچ دیا اور ان لوگوں نے ان دو اسیروں کو بہت ہی دردناک اور فجیع طریقہ سے شہید کردیا۔[۲]

---

(۱) گزشتہ حوالہ، ص ۳۴۳۔ ۳۴۰؛ محمد بن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۵۰.

* بعض مورخین کے کہنے کے مطابق چھ یا سات افراد تھے (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۷۸؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۹۴؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۵۵.)

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۶۲۔ ۳۵۴؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۵۶۔ ۵۵؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۹۲ ۔ ۱۷۸؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ص ۱۹۵ ۔ ۱۹۴؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۱۵۲ ۔ ۱۵۱.

ایسا لگتا ہے کہ مذکورہ دو قبیلوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازباز کرر کھا تھا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے ایسی خیانت کی۔

۳۔ بئر معونہ کا قصّہ: یہ واقعہ، واقعۂ رجیع سے زیادہ دردناک اوردلخراش تھا۔ اور ماہ صفر ٤ ھ میں رونما ہوا۔ ابوبراء قبیلۂ بنی عامر کا بزرگ مدینہ میں پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااور بغیر اسلام کا اظہار کیئے یا اس کی طرف بے رغبتی کا اظہار کیئے ہوئے درخواست کی کہ آنحضرت ﷺ اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو "نجد" کے لوگونکو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے، اس علاقہ میں بھیجیں، شاید وہ اسلام کو قبول کرلیں۔

پیغمبر اسلا ﷺ م نے فرمایا: "میں نجد کے لوگوں سے مسلمانوں کے بارے میں ڈرتا ہوں"۔

ابوبراء نے کہا: "یہ لوگ ہمارے پناہ میں رہیں گے"۔ پیغمبر اسلا ﷺ م نے اپنے بہترین اصحاب اور قاریان قرآن میں سے ستر[۱] افراد کو بھیجا۔ یہ گروہ جب "بئر معونہ" پر پہنچا، تو اپنے ایک قاصد کو پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خط دے کر عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ اس نے خط کو نہیں پڑھا اور اس کو قتل کردیا۔ اس وقت بنی عامر سے اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے لئے مدد مانگی تو ان لوگوں نے ابوبراء کے امان کے احترام میں اس کام سے اجتناب کیا۔ عامر بن طفیل نے قبیلۂ "بنی سلیم" کے کچھ افراد کی مدد سے مبلغین اسلام کے گروہ پر حملہ کردیا تو مجبور ہوکر انھوں نے اپنا دفاع کیا اور صرف کعب بن زید اور عمرو بن امیہ خمری کے علاوہ سب شہید ہوگئے۔[۲]

---

(۱) ایک نقل کے مطابق چالیس آدمی تھے (طبری، تاریخ الامم والملوک، ج۳، ص۳٤؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص۱۹٤؛ واقدی، المغازی، ج۱، ص۳٤۷.)

(۲) طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳٤۔ ۳۳؛ طبرسی، مجمع البیان، (شرکۃ المعارف الاسلامیہ)، ج۲، ص ۵۳۳؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج۱، ص ۱۹٦۔ ۱۹۵؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۱٤۸۔ ۱٤۷؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۳٤۸۔ ۳٤٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۱۹۳؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۲، ص ۵۳۔ ۵۱.

عمرو بن امیہ دشمن کے ذریعہ اسیر ہوا اور پھر آزاد ہوکر مدینہ پلٹتے وقت بنی عامر کے دو افراد کو جو کہ پیغمبر ﷺ کے ساتھ عہد و پیمان کئے ہوئے تھے (اور وہ اس سے بے خبر تھا) قتل کر دیا۔[۱]

بنی نضیر کے ساتھ جنگ[۲]

عمرو بن امیہ کے ذریعہ بنی عامر (پیغمبر اسلا ﷺ م کے ہم پیمان) کے دو افراد کے قتل ہونے پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے اس واقعہ پر افسوس اور ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا: "ان کو ہمیں دیت دینی چاہیئے"۔[۳]

دوسری طرف سے قبیلۂ بنی عامر نے ایک خط کے ذریعہ ان سے دیت کا مطالبہ کیا۔[٤]

اس لئے کہ بنی عامر نے قبیلۂ بنی نضیر کے ساتھ بھی عہد و پیمان کیا تھا۔ پیغمبر اسلا ﷺ م ان کو دیت دینے کے لئے مہاجر و انصار کے چند افراد کے ساتھ مدینہ کے اطراف میں ان کے ٹیلہ کے پاس گئے اور ان سے باتیں کیں۔ بنی نضیر کے سردار تیار ہوگئے۔ لیکن خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا تاکہ دیوار کے اوپر جاکر جہاں پیغمبر ﷺ بیٹھے تھے ایک بڑا پتھر پھینک کر آپ کو قتل کردے۔ رسول اسلام ﷺ غیبی راستے سے ان کی اس سازش سے آگاہ ہوگئے۔[٥] اور فوراً اس جگہ کو ترک کر کے مدینہ واپس چلے آئے اور

---

(۱) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ٣٤؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٣، ص ١٩٥؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ٥٣.

(۲) کچھ مورخین اور سیرت نگاروں نے (مشہور قول کے برخلاف) اس واقعہ کی تاریخ، جنگ احد سے قبل اور اس کی وجہ دوسری چیز ذکر کی ہے۔ استاد علامہ سید جعفر مرتضی العاملی نے اس نقل کو ترجیح دیا ہے (الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ج٦، ص ٤٤۔ ٣٢)

(۳) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج٢، ص ٥٣؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٣، ص ١٩٥؛ طبری، تاریخ الامم والملوک، ج٣، ص ٣٥؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج١، ص ٣٥٢.

(٤) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج١، ص ٣٥٢ اور ٣٦٤.

(٥) بیہقی، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ٣٣٥؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج١، ص ٣٦٦۔ ٣٦٥؛ طبرسی، اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ص٨٨.

ان کو خبردار کیا کہ مدینہ کو ترک کردیں اور اپنے مال و اثاث کو اپنے ساتھ لے کر چلے جائیں۔ وہ لوگ مرعوب ہوکر مدینہ سے چلے گئے؛ لیکن عبد اللہ بن ابی نے ان کو مقابلہ کرنے کے لئے کہا اوران سے وعدہ کیا کہ جنگ پیش آنے کی صورت میں مسلح افراد کے ساتھ ان کی مدد کریں گے۔ اوراگر انھیں مدینہ سے نکالا گیا تو وہ بھی مدینہ کو ترک کردیں گے۔(۱)

کچھ تاریخی خبریں بتاتی ہیں کہ اس واقعہ سے قبل، قریش نے ان کو مسلمانوں کے خلاف سازش اورجنگ کرنے کے لئے ورغلایا تھا۔(۲) اوراس واقعہ میں ان کا بھڑکانا اور ورغلانا بے اثر نہیں تھا۔

بنی نضیر، عبد اللہ کے جھوٹے وعدوں سے دھوکہ کھا گئے اور مدینہ ترک کرنے سے پھر گئے۔ پیغمبر ﷺ کے حکم پر لشکر اسلام نے پندرہ دن تک ان کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اس عرصہ میں کہیں سے مدد کی کوئی خبر نہیں آئی لہٰذا وہ مجبور ہوکر، پیغمبر اسلام ﷺ کی موافقت پر اپنے اسلحوں کو زمین پرڈال کر اپنے مال و اثاثہ زندگی کو اونٹوں پر لاد کر کچھ لوگ اذرعات شام اور کچھ لوگ جن میں ان کا رئیس حی ابن اخطب بھی تھا۔ خیبر کی طرف چلے گئے۔ اور اہل خیبر نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور ان سے اظہار اطاعت کیا۔(۳)

چونکہ بنی نضیر بغیر جنگ کے تسلیم ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے مال و اثاثہ کو بہ شکل "خالصہ"(۴) پیغمبر اسلا ﷺ م کی خدمت میں پیش کیا گیا ۔ آنحضرت ﷺ نے مہاجر و انصار کے درمیان پیمان اخوت و برادری کی

---

(۱) سورۂ حشر، آیت ۱۱؛ طبرسی، مجمع البیان، (تہران: شرکۃ المعارف الاسلامیہ، ۱۳۷۹ھ.ق)، ج۱۰، ص ۳۶۴؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص ۱۶۵ اور ۱۶۹.

(۲) سمہودی، وفاء الوفائ، ج۱، ص ۲۹۸۔ ۲۹۷.

(۳) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص ۲۰۳۔ ۱۹۹؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۹۔ ۳۶؛ واقدی، المغازی، ج۱، ص ۳۸۰۔ ۳۶۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ (قاہرہ: دار المعارف)، ص ۳۳۹؛ رجوع کریں: سمہودی، وفاء الوفائ، ج۱، ص ۲۹۸۔ ۲۹۷.

(۴) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۱؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۹۸؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص ۶۶ اور ۱۷۳.

بنیادپر انصار کی مرضی اور موافقت سے اس کو مہاجرین کے درمیان تقسیم کردیا۔[۱]

خداوند عالم نے قرآن مجید میں بنی نضیر کی خیانت اوران کے برے انجام کااس طرح سے تذکرہ فرمایا ہے:

"وہی وہ ہے جس نے اہل کتاب کے کافروں کو پہلے ہی حشر میں ان کے وطن سے نکال باہر کیا تم تواس کا تصور بھی نہیں کررہے تھے کہ یہ نکل سکیں گے اور ان کا بھی یہی خیال تھا کہ ان کے قلعے انھیں خدا سے بچالیں گے لیکن خدا ایسے رخ سے پیش آیاجس کا انھیں وہم وگمان بھی نہیں تھا اوران کے دلوں میں رعب پیدا کردیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے اور صاحبان ایمان کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے تو صاحبان نظر عبرت حاصل کرو۔ اور اگر خدا نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی توان پر دنیا ہی میں عذاب نازل کردیتا اورآخرت میں تو جہنم کا عذاب طے ہی ہے۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ اور رسول سے اختلاف کیا او رجو خدا سے اختلاف کرے اس کے حق میں خدا سخت عذاب کرنے والا ہے۔[۲]

جنگ خندق (احزاب)

یہ جنگ، ماہ شوال ۵ھ میں ہوئی[۳] جنگ کا آغاز اس طرح سے ہوا کہ "حی ابن اخطب" اور "بنی نضیر" کے کچھ سردار جو خیبر میں پناہ لئے ہوئے تھے نیز قبیلۂ بنی وائل کا ایک گروہ مکہ میں قریش سے ملا اور ان کو پیغمبر اسلا ﷺ م سے جنگ کے لئے رغبت دلائی اور اس راہ میں ان کی ہر طرح کی مدد و نصرت کا وعدہ کیا۔

---

(۱) سمہودی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۱؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۱؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۷۷؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۷۲۔ ۱۷۱.

(۲) سورۂ حشر، آیت ٤۔ ۲؛ ابن عباس سورۂ حشر کو سورۂ "بنی نضیر" کہتے ہیں (طبرسی، مجمع البیان، ج۱۰، ص ۲۵۸.)

(۳) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳٤۳؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٦۵؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۲٤.

قریش نے ان سے پوچھا: کہا ہمارا دین بہتر ہے یا محمد ﷺ کا دین؟ وہ یہودی اور خدا پرست تھے اور فطری طور پر انھیں بت پرستی کی تائید نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ کہنے لگے: تمہارا دین، محمد ﷺ کے دین سے بہتر ہے۔ اور تم حق سے نزدیک تر ہو۔

قریش ان کی باتوں سے خوش حال ہوکر جنگ کے لئے آمادہ ہوگئے۔ خداوند عالم ان کے دشمنانہ فیصلہ کی اس طرح مذمت فرماتا ہے۔

"کیاتم نے نہیں دیکھاکہ جن لوگوں کو کتاب کا کچھ حصہ دے دیا گیا وہ شیطان اور بتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کفار کو بھی بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور جس پر خدا لعنت کردے آپ پھر اس کا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔[۱]

یہودی لیڈروں کا یہ کینہ توز فیصلہ، عدل و انصاف اور منطق سے اس قدر دور تھا کہ آج کے دور کے بعض یہودی، اس فعل کی وجہ سے ان کی مذمت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرائیل ولفنون یہودی، "سرزمین عرب میں یہودیوں کی تاریخ "نامی ایک کتاب میں لکھتا ہے:

"ان کو اتنی واضح اور آشکار غلطی نہیں کرنا چاہیئے کہ قریش کے لیڈروں کے سامنے بتوںکی عبادت کو توحید اسلامی سے افضل و برتر بتائیں اگرچہ قریش ان کے تقاضا کو رد کردیتے کیونکہ بنی اسرائیل بت پرستونکے درمیان صدیوں سے پرچمدار توحید تھے۔[۲]

بہرحال، یہودیوں کے لیڈر پھر قبیلۂ "غطفان" کے پاس گئے اوران سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں ساتھ دینے کے لئے کہا۳) اس قبیلہ سے خاندان بنی فزارہ، بنی مرہ اور بنی اشجع نے

---

(۱) سورۂ نسائ، آیت ۵۲۔ ۵۱.

(۲) محمد حسین هیکل، حیات محمد (قاہرہ: مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ط ۸، ۱۹۶۳.)، ص ۳۲۹.

(۳) انھوں نے غطفان سے وعدہ کیا کہ اس حمایت و نصرت کے بدلہ میں خیبر میں ایک سال خرمہ کی پیداوار کو انھیں دیدیں گے (بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۴۳؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٤٤).

حمایت کا اعلان کیا[۱] اور اسی طرح قبیلۂ بنی سلیم اور بنی اسد کی بھی حمایت حاصل کرلی۔[۲]

قریش نے بھی اپنے اتحادیوں اور حامیوں، جیسے قبیلۂ ثقیف اور بنی کنانہ کی حمایت حاصل کرلی۔[۳] اور اس طریقے سے ایک طاقتور فوجی اتحاد وجود میں آگیا اور ایک دس ہزار کا لشکر[٤] ابوسفیان کی سرکردگی میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ کے راستہ میں، حی ابن اخطب نے ابوسفیان سے وعدہ کیا کہ قبیلۂ بنی قریظہ کو بھی جس کے پاس سات سو پچاس (۷۵۰) جنگجو تھے، ان کے لشکر کی حمایت میں جنگ میں شامل کریں گے۔[٥]

اس لحاظ سے قریش اور یہودیوں نے اس جنگ کی تیاری میں عظیم دولت صرف کردی اور سپاہیوں کو مختلف قبائل سے اکٹھا کیا وہ اس جنگ کو کامیاب ترین جنگ تصور کرتے تھے اور قصد کرلیا تھا کہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیں گے۔

پیغمبر اسلا ﷺ م، قبیلۂ خزاعہ (جوکہ مسلمانوں کے حامی تھے) کی خفیہ خبرونگے ذریعہ لشکر احزاب کی حرکت سے باخبر ہوگئے۔[٦]

---

(۱) طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤٤؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۲٥.

(۲) محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٦؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤٤۳؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعة العلمیہ)، ج۱، ص ۱۹۷؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص ۱۹۷.

(۳) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳٤۳.

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٦؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۳۰؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۰۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۲۰۰.

(٥) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٤٥٤.

(٦) حلبی، انسان العیون (السیرۃ الحلبیہ)، (بیروت: دار المعرفہ، ج۲، ص ٦۳۱.

پیغمبر ﷺ کے حکم سے ایک فوجی کمیٹی تشکیل پائی اور گویا جنگ احد کے تجربہ کے پیش نظر کسی نے مدینہ سے باہر جانے کا مشورہ نہیں دیا اور سب شہر میں رہنے پر متفق ہو گئے۔(۱)

مدینہ کے اردگرد قدرتی روکاوٹیں، جیسے گھر، کھجور کے باغ وغیرہ، موجود تھیں جو دشمن کو شہر میں داخل ہونے سے روک رہی تھیں(۲) سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ اطراف شہر کے جس حصہ میں اس طرح کی روکاوٹ موجود نہیں، ایک خندق کھودی جائے جو لشکر کے گزرنے میں رکاوٹ بنے۔(۳)

پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کی مسلسل کوشش اور زحمتوںکے ذریعہ اور پیغمبر ﷺ کی عملی شرکت سے ایک بڑی خندق کھودی گئی۔(٤) پیغمبر اسلا ﷺ م نے عورتوں، بچوں اور عام لوگوںکو شہر کے اندر قلعوں اور

---

(۱) شیخ مفید، الارشاد (قم: الموتمر العالمی لالفیۃ الشیخ المفید، ط ۱، ۱٤۱۳ھ.ق)، ص ۹٦؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۹۷؛

(۲) حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٦۳٦؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٦٦؛

(۳) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۳٤۳؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٦٦؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ٤٤؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۹۸؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۹۰؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۲۰، ص ۲۱۸

(٤) ابن سعد کے نقل کے مطابق، خندق کی کھودائی چھ دن میں تمام ہوئی۔ (طبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ٦۷) پروفیسر محمد حمید اللہ، اس دور کا مسلمان دانشور جس نے، دشمنان اسلام کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی جنگ کے میدانوں کو کئیمرتبہ قریب سے مشاہدہ کیا اور اس کے بارے میں تحقیقات کی ہیں وہ معتقد ہے کہ خندق بہ شکل N اور ساڑھے پانچ کلومیٹر لمبی تھی (رسول اکرم ﷺ در میدان، ترجمۂ سید غلام رضا سعیدی، (تہران: کانونانتشارات محمدی، ۱۳٦۳ش)، ص ۱۱٤ - ۱۱۳؛ گویا اس محاسبہ کا اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ اسلامی سپاہیوں کی تعداد تین ہزار (۳۰۰۰) افراد پر مشتمل تھی اور خندق کھودتے وقت دس دس افراد کے دستے بنائے گئے تھے اور ہر دستہ ٤۰ ہاتھ کھودتا تھا (طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ٤۵؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۱۹۸؛ لہٰذا فطری طور پر ہر ایک کے حصہ میں ٤ ہاتھ آیا ہوگا جو تقریباً ٦ ہزار میٹر (٦ کلو میٹر) ہوگا۔

پناہ گاہوں میں رکھا۔[۱] لشکر اسلام میں (قول مشہور کی بنا پر) کل تین ہزار افراد تھے۔[۲] خندق اور "سلع" پہاڑ کے بیچ ٹھکانہ بنایا۔ اور پہاڑ کو اپنی پشت پر قرار دیا۔[۳]

لشکر احزاب کا کمانڈر سمجھ رہا تھا کہ جنگ احد کی طرح شہر کے باہر مسلمانوں سے مقابلہ کریں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور جب وہ شہر کے دروازے کے پاس پہنچے تو خندق دیکھ کر حواس باختہ ہوگئے! کیونکہ خندق کا استعمال، جنگی ٹکنیک کے لحاظ سے عرب میں رائج نہ تھا۔[٤] اس وجہ سے مجبور ہوکر خندق کے پیچھے ڈیرہ ڈال کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔

محاصرہ بیس روز تک باقی رہا اس دوران طرفین خندق کے دونوں طرف سے ایک دوسرے کے اوپر تیراندازی کرتے تھے اور قریش کے جنگجو مسلمانوں کی صفوں میں رعب و وحشت ڈالنے کے لئے فوجی مشقیں اور تیراندازی کرتے تھے[٥] دشمن کے ذریعہ شہر کا محاصرہ کرنے سے مسلمان مشکلات اور دشواریوں میں پڑ گئے تھے اور شہر کے حالات برے اور خطرناک ہوگئے تھے جس کا تذکرہ خداوند عالم نے اس طرح سے کیا ہے:

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص٦٧؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص٤٦؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص٦٣٦۔

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٦؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۳۱؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص۲۰۰، سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳۰۱۔

(۳) بلاذری، ج۲۰، ص۳٤۳؛ محمد بن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص٦٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۳۱؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص٤٦؛ سمہودی، ج۱، ص ۳۰۱۔

(٤) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳٤۳؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص٤٨؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبة الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج۲، ص٤۱؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص٦٣٦و٦٥٧۔

(٥) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٧؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص٦٣٧۔ ٦٣٦۔

"اس وقت جب کفار تمہارے اوپر کی طرف سے اور نیچے کی سمت سے آگئے اور دہشت سے نگاہیں خیرہ کرنے لگیں اور کلیجے منھ کو آنے لگے اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے خیالات میں بتلا ہوگئے۔ اس وقت مومنین کا باقاعدہ امتحان لیا گیا اور انھیں شدید قسم کے جھٹکے دیئے گئے"۔(۱)

بنی قریظہ کی خیانت

اس موقع پر ایک دوسرا واقعہ رونما ہوا جس نے مسلمانوں کی حالت کو بدتر کردیا وہ یہ کہ قبیلۂ بنی قریظہ نے عدم تجاوز کے پیمان کو توڑ دیا اور لشکر احزاب کی حمایت کا اعلان کردیا۔ اس قبیلہ کی خیانت، حی ابن اخطب کے شیطانی وسوسہ کے ذریعہ انجام پائی۔(۲) اس سازش کے فاش ہونے سے بہت سارے مسلمانوں کے حوصلہ پست ہوگئے۔ لیکن پیغمبر ﷺ کی کوشش تھی کہ اس کے برے اثرات کو مٹادیں۔

بنی قریظہ نے صرف عہد شکنی پر اکتفا نہ کی بلکہ عملی طور سے دو دوسری بڑی خیانتوں کے مرتکب ہوگئے۔ پہلی یہ کہ لشکر احزاب کے لئے غذائی رسد کا کام انجام دیا جو کہ آذوقہ کے لحاظ سے سخت مشکلات میں گرفتار تھے اسی طرح سے ایک مرتبہ مسلمانوں نے "قبا" کے علاقہ میں ایک قافلہ کو دیکھا جو خرما، جو اور چارہ لئے ہوئے تھا اور وہ قریظہ کی طرف سے سپاہ احزاب کے لئے بھیجا جارہا تھا، لہٰذا اس کو ضبط کرلیا۔(۳)

دوسری یہ تھی کہ شہر کے اندر پناہ گاہوں میں عورتوں اور عام لوگوں کے درمیان، دہشت گردی کے

---

(۱) سورۂ احزاب، آیت ۱۱۔ ۱۰.

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ٦٧؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۳۱؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤٧۔ ٤٦؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۰۳؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۲۰۱۔ ۲۰۰.

(۳) سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۰٤؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٤٧.

ذریعہ ان کے اندر رعب و وحشت پیدا کردیا تھا اور ایک روز ان میں سے ایک شخص قلعہ کے اندر تک پہنچ گیا تھا جو "صفیہ" پیغمبر ﷺ کی پھوپھی کے ذریعہ مارا گیا۔[۱]

ایک رات بنی قریظہ نے قصد کیا کہ مرکز مدینہ پر حملہ کریں اس وجہ سے حی ابن اخطب کو قریش کے پاس بھیجا اور ان سے کہا کہ ایک ہزار افراد قریش سے اور ایک ہزار افراد غطفان سے اس حملہ میں ان کی مدد کریں۔ اس نقل و حرکت کی خبر پیغمبر ﷺ کو ملی اور شہر میں سخت رعب و وحشت طاری ہوگیا۔

رسول خدا ﷺ نے پانچ سو افراد کو اس شہر کی حفاظت کے لئے مامور کیا۔ وہ لوگ راتوں کو تکبیر کے نعروں کے ساتھ گشت کرتے تھے اور لوگوں کے گھروں کا پہرہ دیتے تھے۔[۲]

لشکر احزاب کی شکست کے اسباب

لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود، خندق کھودنے کے علاوہ، چند دوسرے اہم اسباب کی وجہ سے حالات مسلمانوں کے حق میں بدل گئے تھے۔ اور آخر کار لشکر احزاب کی ناکامی کا باعث بنا۔ وہ اسباب یہ تھے:

---

(۱) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۴۷؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٤٦٣۔ ٤٦٢؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج ۳، ص ۵۰؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۰۲.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٤٦٠؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ٦۳٦؛ ابوبکر سے نقل ہوا ہے کہ وہ جنگ احزاب کو یاد کرتے تھے اور بنی قریظہ کی اس خیانت کے بارے میں کہتے تھے: ہم مدینہ میں اپنے بچوں (اور عورتوں) کے بارے میں قریش اور غطفان کے بہ نسبت بنی قریظہ سے زیادہ ڈرتے تھے (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٤٦٠.)

۱۔ بنی قریظہ اور لشکر احزاب کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا

نعیم بن مسعود، قبیلۂ غطفان کا ایک فرد تھا جو جلدی ہی مسلمان ہوا تھا اس نے پیغمبر ﷺ کی اجازت سے[1] بنی قریظہ سے جا کر ملاقات کی اور ان سے پرانی دوستی ہونے کی بنا پر پہلے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا پھر عہد شکنی پر ان کی مذمت کی اور کہا: تمہاری صورت حال، لشکر قریش سے الگ ہے اگر جنگ کسی مرحلہ پر نہ پہنچی تو وہ اپنے وطن کی طرف پلٹ جائیں گے لیکن تم کہاں جاؤ گے؟ اگر جنگ تمام نہ ہوئی تو مسلمان تم کو نابود کردینگے۔ اور پھر ان کو مشورہ دیا کہ لشکر احزاب کے کچھ کمانڈروں کو اغواہ کر کے ضمانت کے طور پر جنگ کے تمام ہونے تک رکھے رہیں۔

پھر اس بات کو فوجی راز اور بنی قریظہ کے مخفی ارادے کے عنوان سے قریش اور اپنے قبیلہ غطفان کے سرداروں سے بتایا اور کہا کہ بنی قریظہ کا ارادہ ہے کہ اس بہانہ سے تمہارے کچھ افراد کو گرفتار کرکے حسن نیت اور پچھلی باتوںکی تلافی کے عنوان سے حضرت محمد ﷺ کے حوالہ کریں۔ اوران کو خبردار کیا کہ ایسا مشورہ قبول نہ کریں۔ اس نے یہ چال اپنائی اوران دوگروہوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا اور متحدہ احزاب کا محاذ اندر سے کمزور ہوگیا۔[2]

عمرو بن عبدود کا قتل

گویا قریش تین لحاظ سے مشکلات اوردشواریوں میں گرفتار تھے اور چاہتے تھے کتنی جلدی جنگ کو تمام کریں۔

پہلا: یہ کہ جنگ میں تاخیر ہونے کی بنا پر غذائی مواد کم ہوگیا تھا۔

---

(۱) ان الحرب خدعۃ

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٩؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٢٤٠؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٥١۔ ٥٠؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٥٠؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ٣٠٤؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ٢٠٧.

دوسرا: یہ کہ آہستہ آہستہ ہوا ٹھنڈی ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے خیموں میں رہنا دشوار ہوگیا تھا۔

تیسرا: یہ کہ ماہ ذیقعدہ جوکہ ماہ حرام تھا وہ قریب ہوگیا تھا لہٰذا اگر جنگ ماہ شوال میں تمام نہ ہو پائی تو مجبوراً انھیں تین مہینے مسلسل رکنا پڑے گا۔[1]

اس وجہ سے طے کیا کہ ہر صورت میں جنگی روکاوٹوں کو ختم کریں اس بنا پر لشکر احزاب کے پانچ بہادر اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا کرخندق کے باریک حصہ سے دوسری طرف پہنچ گئے[2] اور تن بہ تن جنگ کے لئے رجز خوانی کرنے لگے ان میں سے ایک عرب کا سب سے بہادر اور نامور پہلوان "عمرو بن عبدود" تھا جو کہ "شہشوار قریش" اور "شہشوار یلیل" کے نام سے مشہور تھا۔[3] خندق کو پھاند کر "ھل من مبارز" کی صدا بلند کی۔ لیکن کوئی مسلمان اس سے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوا۔[4] یہ چیلنج کئی

---

(۱) محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ در میدان جنگ، ترجمہ: سید غلام رضا سعیدی، ص ۱۲۸

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۶۸؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۴۷۰؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۴۸؛ شیخ مفید، الارشاد، (قم: المؤتمر العالمی لالفیۃ الشیخ المفید، ط ۱، ۱۴۱۳ھ.ق)، ص۹۷؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص۲۰۳۔

(۳)چونکہ وہ "یلیل" نامی سرزمین پر تن تنہا، دشمن کے ایک گروہ پرغالب ہوا تھا لہٰذا وہ اسی نام سے مشہور ہوا (بحار الانوار، ج۲۰، ص ۲۰۳) وہ جنگ بدر میں زخمی ہوگیا تھا اسی وجہ سے جنگ احد میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اور تین سال کے بعد پھر جنگ خندق میں آیا تھا لہٰذا اپنے کو ایک علامت کے ذریعہ مشخص کر رکھا تھا تاکہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب جلب کرے۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص ۲۳۵؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک، ج۳، ص ۴۸؛ ابن اثیر، الکامل فی تاریخ، ج۲، ص ۱۸۱)۔

(۴)واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۴۷۰؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم(دار احیاء الکتب العربیۃ، ۱۹۶۴ئ)، ج۱۳، ص ۲۹۱ و ج۱۹، ص۶۳؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص۲۰۳۔

مرتبہ دھرایا اورہر مرتبہ صرف علی، پیغمبر ﷺ کی اجازت سے اس کی طرف بڑھے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "کل ایمان، کل کفر و شرک کے مقابلہ میں جارہا ہے"۔(۱)

علی نے ایک فردی جنگ میں بہادرانہ انداز میں عمرو بن عبدود کو ہلاک کردیا، عمرو بن عبدود کے قتل ہوتے ہی چار دوسرے پہلوان جواس کے ساتھ خندق پھاند کر آئے تھے اور علی سے لڑنے کے منتظر تھے، فرار کر گئے! اور ان میںسے ایک گھوڑے کے ساتھ خندق میں گرگیا اور مسلمانوں کے ذریعہ قتل ہوا۔(۲)

پیغمبر اسلا ﷺ م نے علی کی اس عظیم شجاعت و بہادری پر ان سے فرمایا: "آج اگر میں تمہارے اس عمل کو اپنی پوری امت کے اعمال سے موازنہ کروں تو تمہارا یہ عمل ان پر بھاری قرار پائے گا۔ کیونکہ عمرو بن عبدود کے قتل ہونے سے مشرکین کا کوئی گھر ایسا نہیں بچا جس میں ذلت و رسوائی نہ چھائی ہو اور مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس میں عزت و سربلندی نہ آئی ہو۔(۳)

اہل سنت کے ایک بزرگ محدث حاکم نیشاپوری کے نقل کے مطابق، پیغمبر ﷺ نے فرمایا: جنگ خندق میں علی بن ابی طالب کی لڑائی عمرو بن عبدود سے روز قیامت تک میری امت کے اعمال سے یقینا افضل ہے"۔(٤)

عمرو کے قتل ہوتے ہی لشکر احزاب کے حوصلہ پست ہوگئے اور شکست کے آثار ان کے لشکر میں نمودار ہوئے اور مختلف قبیلے جو جنگ کرنے کے لئے آئے تھے ہر ایک اپنے وطن کی طرف واپس جانے لگا۔(۵)

---

(۱) برز الاسلام کلہ الی الشرک کلہ۔ (ابن ابی الحدید، گزشتہ حوالہ، ج۱۹، ص ٦١؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص۲۱۵.)

(۲) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳٤۵؛ محمدبن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ٦٨؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۲۳٦؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٤٨؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص ۳۰۳.

(۳) ابو الفتح محمدبن علی الکراجکی، کنز الفوائد (قم: دارالذخائر، ۱٤۱۰ھ.ق)، ج۱، ص ۲۹۸؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص ۲۰۵، ۲۱٦.

(٤) المستدرک علی الصحیحین، تحقیق: عبد الرحمن المرعشی (بیروت: دار المعرفہ، ط ۱، ۱٤۰٦ھ.ق)، ج۳، ص ۳۲.

(۵) کراجکی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۹۹.

غیبی امداد

آخری وار، خداوند عالم نے امداد غیبی کی شکل میں ان پر یہ کیا کہ ٹھنڈی ہوا اور شدید طوفان کو رات میں ان پر مسلط کردیا۔ طوفان نے ان کے ٹھکانوں کو تہس نہس کردیا اور ان کے لئے وہاں ٹھہرنا دشوار ہوگیا آخر کار ابوسفیان نے مکہ پلٹنے کا حکم صادر کیا۔[(۱)]

خداوند عالم نے اپنی نصرت کا اس طرح سے تذکرہ فرمایا ہے:

"ایمان والو! اسوقت اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب کفر کے لشکر تمہارے سامنے آگئے اور ہم نے ان کے خلاف تمہاری مدد کے لئے تیز ہوا اور ایسے لشکر بھیج دیئے جن کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔ اور خدا نے کفار کو ان کے غصہ سمیت واپس کردیا کہ وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکے اور اللہ نے مومنین کو جنگ سے بچالیا اور اللہ بڑی قوت والا اور صاحب عزت ہے"۔[(۲)]

اس جنگ میں احزاب کے سرداروں کی طرف سے عظیم سرمایہ خرچ کرنے ،اور اتنی کثیر تعداد میں سپاہیوں کو اکٹھا کرنے کے باوجود ان کے لئے اس جنگ کا نتیجہ تلخ آور اور غم انگیز تھا۔ کیونکہ نہ مدینہ کو کوئی نقصان پہنچا اور نہ ہی وہ شام کے تجارتی راستے کو آزاد کرا سکے۔ اس وجہ سے ابوسفیان کی کمانڈری بدنام ہوئی اور قریش کی عظمت و ہیبت کم ہوگئی۔ یہ وہ جنگ تھی جس کے بعد مسلمان دفاعی حالت سے نکل کر تہاجمی قدرت کے مالک ہوگئے یعنی حملہ کرنے کی پوزیشن میں آگئے۔

---

(۱) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳٤۵؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۷۱؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۵۲۔ ۵۱؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص۱۹۸؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص۹۲؛ سمہودی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳۰۵؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص۲۰۹۔ ۲۰۸۔

(۲) سورۂ احزاب، آیت ۹ اور ۲۵.

پیغمبر اسلا ﷺ م نے فرمایا: "اس کے بعد ہم حملہ کریں گے وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکتے"[۱] اور اسی طرح سے ہوا بھی۔ اس جنگ میں چھ افراد شہید ہوئے[۲] اور دشمن کی طرف کے تین افراد مارے گئے۔[۳]

جنگ بنی قریظہ

لشکر احزاب کے پلٹ جانے کے بعد، پیغمبر ﷺ مامور ہوئے کہ بے خوف بنی قریظہ کی طرف جائیں اور ان کا کام تمام کردیں۔ پیغمبر ﷺ نے فوراً لشکر کے کوچ کا حکم دیا اور اسی روز عصر کے وقت لشکر اسلام نے قلعہ بنی قریظہ کا محاصرہ کرلیا۔ بنی قریظہ نے اپنے قلعہ میں مورچہ سنبھال کر تیراندازی شروع کردی اور پیغمبر اسلا ﷺ م کی شان میں نازیبا کلمات کے ذریعہ گستاخی کی۔

۲۵ روز محاصرہ کے بعد آخر کار ان کے پاس تسلیم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا قبیلۂ اوس جس نے پہلے بنی قریظہ کے ساتھ عہد و پیمان کیا تھا پیغمبر ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے ہم نواؤں کے ساتھ بنی قینقاع کے یہودیوں جیسا برتاؤ کریں۔

---

(۱) شیخ مفید، الارشاد، ص۱۰٦؛ صحیح بخاری، تحقیق: الشیخ قاسم الشماعی الرفاعی (بیروت: دار القلم، ط۱، ۱٤۰۷ھ.ق)، ج۵، ص۲۱۵؛ کتاب المغازی، باب ۱٤٦، حدیث ۵۹۳؛ طبرسی، مجمع البیان، ج۸، ص۳٤۵؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص۲۰۹۔

(۲) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص٤۲؛ واقدی، المغازی، ج۲، ص٤۹۲؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص۲٦٤؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۵۸؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص۱۹۸۔ اس جنگ کے شہداء کی تعداد اس سے زیادہ نقل ہوئی ہے۔رجوع کریں: تاریخ پیامبر اسلام ﷺ، محمد ابراہیم آیتی (تہران: مؤسسہ انتشارات و طبع تہران یونیورسٹی، ۱۳٦۱)، ص۳۷۲۔

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص٤۹٦؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۲٦۵؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۵۹؛ ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۱۹۸؛ یعقوبی نے دشمن کے مقتولین کی تعداد آٹھ بتائی ہے۔ (ج۲، ص٤۲).

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "تمہارے بزرگ، سعد بن معاذ کو اس سلسلے میں قضاوت کا حق حاصل ہے" اوسیوں اور بنی قریظہ نے اس قضاوت کو قبول کیا، سعد کو ایسی ماموریت ملنے کے بعد قبیلہ جاتی اور جاہلی رسم و رواج کے مطابق، بنی قریظہ کے حق میں فیصلہ کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ اپنے قبیلہ والوں کی باتوں سے متاثر نہیں ہوئے اور اعلان کیا کہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اس کے بعد دونوں طرف کی تائید حاصل کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان کے لوگوں کو قتل کردیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو اسیر اوران کے مال ودولت کو غنیمت سمجھ کرلے لیا جائے۔

یہ حکم اجرا ہوا، حی ابن اخطب، قبیلۂ بنی نضیر کا سردار بھی قتل ہونے والوں میں تھا، جس نے مسلمانوں کے ساتھ ان کی پیمان شکنی میں تشویق اوراہم کردار ادا کیا تھا۔ کیونکہ اس نے بنی قریظہ سے وعدہ کیا تھا کہ ان کا ساتھ دے گا اور شکست کھانے کی صورت میں ان کے انجام میں شریک رہے گا۔ اسے جب زندگی کے آخر لمحات میں، خیانت اور فتنہ گری کے باعث، برا بھلا کہا گیا تو بجائے گناہوں کے اعتراف اور اظہار پشیمانی کے، اپنی اور بنی قریظہ کی بری عاقبت کو خداوند عالم کے جبر و تقدیر کا نتیجہ قرار دیا۔ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ سے کہا: میں تمہاری دشمنی سے پشیمان نہیں ہوں لیکن جو خدا جس کو رسوا کرے رسوا ہو جاتا ہے" اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا: خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں مجھے ڈر اور خوف نہیں ہے اور یہ شکست و رسوائی یقینی ہے جو خدا کی جانب سے بنی اسرائیل کے لئے مقرر ہوئی ہے"۔ (۱)

پیغمبر اسلام ﷺ نے اسیروں کے ایک گروہ کو ایک مسلمان کے ذریعہ نجد بھیجا تاکہ ان کو بیچ کر

---

(۱) اس جنگ کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کریں: (طبقات الکبری، ج ۲، ص ۷۸۔ ۷۴؛ تاریخ الامم والملوک، ج ۳، ص ۵۸۔ ۵۳؛ المغازی، ج ۲، ص ۵۲۴۔ ۴۹۶؛ السیرۃ النبویہ، ج ۳، ص ۲۶۱۔ ۲۴۴؛ وفاء الوفائ، ج ۱، ص ۳۰۹۔ ۳۰۵؛ بحار الانوار، ج ۲۰، ص ۲۳۸۔ ۲۳۳۔

مسلمانوں کے لئے اسلحے اور گھوڑے خریدے ۔[1]

قرآن کریم نے ان کے برے انجام کا اس طرح سے ذکر کیا ہے:

"اوراس نے کفار و مشرکین کی پشت پناہی کرنے والے اہل کتاب کوان کے قلعوں سے نیچے اتاردیا اوران کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ تم نے ان میں سے کچھ کو قتل کیا اور کچھ کو قیدی بنالیا۔ اورپھر تمہیں ان کی زمینوں ان کے گھروں اور ان کے اموال اور ایسی زمین کا وارث بنادیا جن میں تم نے قدم بھی نہیں رکھا تھا اور بیشک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔[2]

تجزیہ و تحلیل

اگرچہ اس واقعہ کی تفصیلات (جیسے بنی قریظہ کے سپاہیوں کی تعداد یا جو لوگ فرمان قتل کو بجالائے) کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف موجود ہے لیکن اصل واقعۂ زمانۂ قدیم سے مورخین کے درمیان مشہور اور مسلم تھا اور ہے یہاں پر اگر اس مسئلہ کے بارے میں دو نظریوںکا تجزیہ و تحلیل کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

۱۔ بعض یورپی تاریخ نگاروں نے بنی قریظہ کے ساتھ پیغمبر ﷺ کے سلوک پر نکتہ چینی کی ہے اور اسے

---

(۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص ۲۵٦؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک، ج۳، ص ۵۸؛ ایک گروہ کو بھی ، سعد ابن عبادہ کے ذریعہ اس سلسلہ میں شام بھیجا (واقدی، المغازی، ج۲، ص ۵۳۳)جنگ خندق و بنی قریظہ کے بارے میں مذکورہ کتابوں کے علاوہ رجوع کریں: تفسیر المیزان، ج١٦، ص ۳۰۳۔ ۲۹۱.

(۲) سورۂ احزاب، آیت ۲۷۔ ۲٦.

ایک وحشیانہ اور غیر انسانی اقدام کہا ہے۔[1] لیکن بنی قریظہ کے جرم و جنایات کو دیکھتے ہوئے اس نکتہ چینی کو قبول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان لوگوں نے نہ صرف عہد شکنی اور جنگ کے اعلان پر اکتفا کی بلکہ جیسا کہ بیان ہوا مدینہ کے اندر دہشت پھیلانے والی کاروائیاں اور نیز لشکر احزاب کے لئے غذائی رسد کا کام انجام دے کر اور حقیقت میں ان کی مالی امداد کے ذریعہ عملی طور پر جنگ میں شریک تھے اور ہم جانتے ہیںکہ اس طرح کے اقدامات جنگ کے مواقع پر کسی قوم کے نزدیک قابل چشم پوشی نہیں ہیں اور اس کے مجرموں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلا ﷺ م اس عہد و پیمان کی رو سے جو ان سے کیا تھا ان کو سزائیں دینے کا حق رکھتے تھے لیکن اوسیوں کی درخواست پر فضل کے عنوان سے سعد کی قضاوت کا مشورہ دیا اور اس مشورہ کو اوسیوں اور بنی قریظہ نے قبول کرلیا. لہٰذا اعتراض کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

اس سے قطع نظر، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عفو و درگزر کہاں اور کس کے بارے میں بہتر اور مناسب ہے؟ کیا وہ لوگ ، جو انسانی صورت تو رکھتے ہیں لیکن انسانی وقار کو پائمال کردیتے ہیں اور اپنے کسی معاہدہ کے پابند نہیں ہوتے ۔

---

(۱) مونٹ گری واٹ، محمد فی المدینہ، تعریب: شعبان برکات (بیروت: منشورات المکتبۃ العصریہ)، ص ۳۲۷، مولف کتاب نے بھی ۲۳ سال تک ان یورپی سیرت نگاروں کا ہم نوا بن کر بنی قریظہ کی مذمت پر اعتراض کیا ہے وہ بنی قریظہکی بڑی خیانت کا تذکرہ کرنے کے باوجود لکھتا ہے: "جنگ خندق میں مدینہ کا محاصرہ کرنے سے مسلمانوںکی زندگی دشوار ہوگئی تھی اور مکہ پر حملہ آوروں کے ساتھ بنی قریظہ کا مل جانا ایک ممکن الوقوع امر تھا اور جب بھی ایسا ہوتا، مسلمانوں کی شکست یقینی تھی اور احتمال قوی پایا جاتا تھا کہ محمد ﷺ کی تحریک بالکل مٹ جاتی..." اس کے باوجود وہ مزید لکھتا ہے. لیکن محمد ﷺ کو ان پر رحم کرنا چاہیئے تھا (مصطفی حسینی طباطبائی، خیانت درگزارش تاریخ (تہران: انتشارات چاپخش، ط ۱، ۱۳۶۶)، ج۳، ص ۱۶۵ ـ ۱۶۴)

جن کا وجود، دشمنی، کینہ او رہٹ دھرمی سے لبریز ہو، عفو و گزشت کے قابل ہیں؟(١)

کیا بنی نضیر کے یہودیوں کے ساتھ "حی ابن اخطب" کی رہبری میں نرمی کا سلوک نہیں کیا گیا تھا؟ لیکن وہ سازش کرنے سے باز نہ آئے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوگئے۔ کیا ضمانت پائی جاتی تھی کہ حی ابن اخطب اور کعب بن اسد گزشتہ امور کی تکرار نہیں کریں گے۔ اور دوسرے بڑے لشکر کو اسلام او رمسلمانوں کی نابودی کے لئے اکٹھا نہیں کریں گے؟ کیا ان کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ، ایک خونخوار جانور پر رحم کرنے جیسا نہیں ہے۔

مدینہ کے محاصرہ کے ایام میں، ایک دن ابوسفیان نے پیغمبر اسلا ﷺ م کو ایک دھمکی آمیز خط میں لکھا: "لات و عزیٰ کی قسم، اس لشکر کے ساتھ تجھ سے جنگ کرنے کے لئے آیا ہوں اور ہم چاہتے ہیںکہ ہرگز دوبارہ جنگ کی ضرورت نہ پڑے اس حملہ میں تم کو نیست و نابود کردیں گے۔ لیکن اگر (بغیر جنگ کے) مکہ پلٹ گئے تو روز احد کے مانند تمہارے لئے ایک دن ایسا لائیں گے کہ عورتیں اس دن گریبان چاک کرڈالیں گی۔(٢) کیا اگر ایسی صورت حال پیش آجائے تو بنی قریظہ دوسری بار لشکر احزاب کا ساتھ نہیں دیں گے؟

اس سے قطع نظر کہ سعد کا حکم توریت کے حکم کے مطابق تھا اور شاید وہ یہودیوں سے قریبی تعلقات

---

(١) بنی قریظہ کے آخری ایام میں ان کے بعض مخفی مذاکرات (جیسے کعب بن اسد کا مشورہ، عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے اور پھر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کا) او رنیز پھانسی دینے سے قبل ان کی بعض حرکتوں اور عکس العمل نے، ان کی شدید دشمنی، بے رحمی او رہٹ دھرمی کا پردہ فاش کردیا، جیسا کہ ان میں سے ایک کو بعض مسلمانوں کی درخواست پر پیغمبر ﷺ نے معاف کردیا لیکن وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا اور اسے بھی قتل کرنا پڑا۔ (ابن ہشام، السیرة النبویہ، ج٣، ص ٢٥٤۔ ٢٥٣.)

(٢) واقدی، المغازی، ج٢، ص ٤٩٢.

اور ہم پیمان ہونے کی وجہ سے ان کے قضائی قوانین سے آگاہی بھی رکھتے تھے۔

توریت میں اس طرح سے نقل ہوا ہے: "جس وقت کسی شہر کی طرف جنگ کے لئے جاؤ تو پہلے ان تک صلح کا پیغام پہنچاؤ اور اگر وہ تم کو صلح آمیز جواب دیں اور شہر کا دروازہ تمہارے لئے کھول دیں، جس میں تمام قوم کے لوگ پائے جاتے ہوں اور ٹیکس دیکر تمہارے تابع ہو جائیں، تو ان سے جنگ نہ کرنا۔ اور اگر تم سے صلح نہ کرکے، جنگ کریں تو ان کا محاصرہ کرلو اور چونکہ تمہارے خدا نے کا ان کو تمہارے حوالے کردیا ہے لہٰذا ان کے تمام مردوں کو تلوار سے قتل کرڈالو۔ اور ان کی عورتوں، بچوں اور مویشیوں اور جو کچھ ان کے شہر میں ملے یعنی ان کے تمام مال غنیمت کو لوٹ لو اور اسے کھاؤ۔[1]

۲۔ اس دور کا ایک محقق، بنی قریظہ کی سزاؤںکا منکر ہوگیا ہے اور کچھ دلائل اور قرائن کو دلیل بنا کر پیغمبر ﷺ کی جانب سے اس طرح کی سخت سزاؤوں کے دیئے جانے کو بعید قرار دیتا ہے۔[2]

یہ نظریہ اگرچہ بعض یورپی تاریخ نگاروںکی تنقید یا صہیونزم کے پروپیگنڈہ کے مقابلہ میں ایک طرح کا دفاعیہ تو ہوسکتا ہے لیکن جیسا کہ بعض بڑے دانشمندوں نے اس نظریہ پر تنقید کی ہے،[3] یہ دلائل محکم نظر نہیں آتے، خاص طور سے اس استدلال میں سورۂ احزاب کی ۲۶ ویں آیت کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے جو کہ اصل واقعہ کی حکایت کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ، جنگ احزاب کے بعد سے تاریخ میں بنی قریظہ کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا جبکہ اگر واقعہ صحیح نہ ہوتا تو فطری طور ان کے بعد کے حالات، تاریخ میں ذکر ہوتے۔

---

(۱) توریت، ترجمۂ ولیم کلن قیس اکسی، لندن، ۱۳۲۷ ھجری، سفر تثنی، بیسویں فصل اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے سعدکی کتابوںکی طرف رجوع کریں: جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ج۲، ص ۱۵۷۔ ۱۵٤.

(۲) سید جعفر شہیدی، تاریخ تحلیلی اسلام تا پایان امویان (تہران: مرکز نشریونیورسٹی، ط ٦، ۱۳٦۵)، ص ۷۵۔ ۷۳

(۳) سید علی میر شریفی، نگرشی کوتاہ بہ غزوۂ بنی قریظہ، مجلہ نور علم، شمارہ ۱۱، اور ۱۲.

جنگ بنی مصطلق

شعبان ٦ھ [۱] میں پیغمبر اسلا ﷺ م کو خبر ملی کہ حارث بن ابی ضرار، بنی مصطلق کا رئیس (قبیلۂ خزاعہ کا ایک خاندان) ، اپنے قبیلہ والوں اوراس کے علاقہ کے کچھ عرب لوگوں کو مدینہ پر حملہ کے لئے تیار کر رہا ہے ۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلامی سپاہیوں کو آمادہ کیا اور "مریسیع" * کنواں کے پاس، بحر احمر کے ساحلی علاقہ تک گئے. اس علاقے میں جنگ ہوئی اور بنی مصطلق بہت جلد ہار کھا گئے اوران سے بہت ساری دولت اور اسیر مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ [۲]

جُویریہ حارث کی لڑکی بھی اسیروں میں تھی۔ حارث اپنی لڑکی کی آزادی کے لئے مدینہ میں پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جب آنحضرت ﷺ نے اسے غیب سے خبر دی کہ وہ دو اونٹ اپنی لڑکی کی رہائی کے لئے لایا ہے اور راستے میں چھپا رکھا ہے، تو وہ مسلمان ہوگیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جویریہ کو آزاد کردیا اور پھر اس سے شادی کرلی۔ [۳]

---

(۱) مورخین کے بعض گروہ، جیسے واقدی، بلاذری، اور محمد بن سعد اس غزوہ کو پانچویں سال کے حوادث میں سے شمار کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اس کو جنگ احزاب کے پہلے تحریر کیا ہے۔ بعض قرائن، ان کے اس نظریہ کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔ رجوع کریں: السیرۃ النبویہ، ج۳، ص۳۰۲، حاشیۂ؛ وفاء الوفائ، ج۱، ص۳۱٤.

* اسی مناسبت سے اس غزوہ کو غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۰۸۔ ۳۰۲؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ٦٦۔ ٦۳؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج ۲۰، ص ۲۹۰۔ ۲۸۱)

(۳) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۰۸؛ مفید، الارشاد (قم: المؤتمر العالمی لالفیۃ الشیخ المفید، ط ۱، ۱٤۱۳ھ.ق)، ص ۱۱۹۔ ۱۱۸؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج ۱، ص ۲۰۱.

مسلمانوں نے پیغمبر ﷺ کے احترام میں اسیروں کو جو اب پیغمبر ﷺ کی زوجہ کے رشتہ دار سمجھے جانے لگے تھے، آزاد کردیا اس وجہ سے جویریہ کو اپنے رشتہ داروں کی بہ نسبت سب سے بابرکت عورت کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔(۱)

یہ شادی پیغمبر اسلام ﷺ کی شادیوں میں ایک نمونہ تھی جو بہت سارے اجتماعی فوائد رکھتی تھی اور ذاتی پہلوؤں سے ہٹ کر اجتماعی لحاظ سے انجام پائی تھی۔

عمرہ کا سفر

٦ھ میں پیغمبر اسلام ﷺ نے قصد کیا کہ "عمرہ" کرنے کے لئے مکہ جائیں۔ ہجرت کے بعد سے اس دن تک مسلمان حج و عمرہ نہیں کرپائے تھے، اس مذہبی سفر میں معنوی پہلوؤں کے علاوہ ایک طرح کی مذہبی نمائش بھی تھی جو تبلیغی اثر رکھتی تھی، کیونکہ اس سے زائرین اوراہل مکہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا اور پیغمبر کو اپنے اصحاب کی کثرت تعداد کو دکھانا تھا۔ اور نیز یہ اقدام اس بات کی بھی علامت تھا کہ حج و عمرہ جو کہ مشرکین کے یہاں ایک عظیم اور مقدس عبادت ہے وہ دین محمد ﷺ میں بھی موجود ہے اور اسے ایک فریضہ واجب قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ چیز ان کے قلوب و جذبات کو جلب کرنے میں موثر تھی. اور اگر قریش عمرہ بجالانے سے روکتے تو لوگونکے خیالات ان کے حق میں مضر ثابت ہوتے، کیونکہ قریش کعبے کی کنجی کے مالک تھے اور ہمیشہ حجاج کو حج کی تشویق او رترغیب دلاتے تھے اوران کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام کرتے تھے اور اس کو اپنے لئے ایک افتخار اور سعادت سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر وہ مسلمانوںکو مکہ میں داخل ہونے سے روکتے تو لوگ ان سے نفرت کرنے لگتے اور سبھی سمجھ جاتے کہ

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۰۸۔ ۳۰۷؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ٤١١؛ طبری، اعلام الوری، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ)، ص ٩٤؛ بعض تاریخی کتابوں میں یہ شادی دوسری طرح سے ذکر ہوئی ہے۔

اس کام کا مقصد صرف مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور جھگڑا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔(۱)

پیغمبر اسلام ﷺ ذیقعدہ کے مہینہ میں ایک ہزار آٹھ سو افراد(۲) کے ہمراہ مکہ روانہ ہوئے اس سفر میں پیغمبر ﷺ کے حکم سے تمام افراد، صرف ایک تلوار اپنے ساتھ حمائل کئے تھے (جو کہ اس زمانہ میں ہر ایک مسافر اپنے ساتھ رکھتا تھا) اور نیز قربانی کے اونٹ، مدینہ سے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے تاکہ قریش کو معلوم ہو جائے کہ وہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔

قریش جب پیغمبر اسلام ﷺ کی روانگی سے آگاہ ہوئے تو طے کیا کہ ان کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے اور ان کے سراغ میں سپاہیونکے ساتھ مکہ سے باہر آگئے اور پیغمبر ﷺ مجبور ہوکر سرزمین "حدیبیہ" میں رک گئے۔ قریش نے کئی نمائندے پیغمبر ﷺ کے پاس بھیجے تاکہ ان کے مقصد سے آگاہ ہوں ہر مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: "ہم جنگ کا اراہ نہیں رکھتے ہیں او رعمرہ کے قصد سے آئے ہیں" لیکن اس کے باوجود قریش ان کو اسی طرح شدت سے منع کرتے رہے اور مسئلہ مشکل میں پڑ گیا۔

---

(۱) جیسا کہ جب قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا تو مکہ کے ایک بزرگ حلیس بن علقمہ نے قریش کو دھمکی دی کہ اگر وہ اس کام سے باز نہ آئے تو اپنے قبیلہ والوں کو ان سے جنگ کے لئے اکٹھا کریں گے۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۲، ص ۹۶؛ حلبی، السیرۃ النبویہ، ج۲، ص ۶۹۶.

(۲) کلینی، الروضۃ من الکافی (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۶۲)، ص ۳۲۲؛ مورخین نے پیغمبر ﷺ کے ہمراہ اصحاب کی تعداد ۷۰۰، ۱۳۰۰، ۱۴۲۵، ۱۶۰۰، ۱۷۰۰، تک نقل کی ہے۔ (السیرۃ الحلبیہ، ج۲، ص ۶۸۹، المغازی، ج۲، ص ۶۱۴؛ طبقات الکبری، ج۲، ص ۹۸۔ ۹۵؛ تاریخ الامم و الملوک، ج۳، ص ۷۲؛ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ج۳، ص ۳۳۲؛ مجمع البیان، ج۹، ص ۱۱۰.

بیعت رضوان

آخرکار پیغمبر اسلام ﷺ نے عثمان بن عفان کو ان کے پاس بھیجا تاکہ ان کے مقصد سے قریش کو آگاہ کریں۔ عثمان کے پلٹنے میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ اڑی کہ قریش نے ان کو قتل کردیا ہے۔[۱]

اس موقع پر پیغمبر ﷺ نے اپنے اصحاب کو ایک درخت کے نیچے جمع کیا اور ان کے ساتھ عہد و پیمان پائیدار کیا۔[۲]

بیعت کی رسم ختم ہوئی ہی تھی کہ معلوم ہوا کہ عثمان کے قتل کی خبر غلط تھی یہ عہدنامہ چونکہ درخت کے نیچے کیا گیا اور اس میں شرکت کرنے والوں سے خدا نے خوشنودی اور رضایت کا اظہار کیا[۳] لہٰذا اس کو "بیعت رضوان" اور "بیعت شجرہ" کہا گیا ہے۔

پیمان صلح حدیبیہ (فتح آشکار)

عثمان کے بے نتیجہ پلٹنے کے بعد آخرکار سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بن کر پیغمبر ﷺ کے پاس آیا اور آنحضرت ﷺ سے مذاکرات کئے اور کہا کہ قریش کی طرف سے ہر طرح کی بات چیت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس سال مسلمان عمرہ نہ کریں۔[٤]

اس گفتگو کے ذریعہ جو عہد و پیمان کیا گیا وہ "صلح حدیبیہ" کے نام سے مشہو رہوا، جس کی شرطیں یہ ہیں:

۱۔ قریش اور مسلمان اس بات کا عہد کریں کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے اور اجتماعی امن و امان برقرار رکھیں گے۔

۲۔ محمد ﷺ اور تمام مسلمان اس سال مکہ میں داخل نہیں ہوں گے لیکن آئندہ سال قریش اسی موقع پر مکہ سے باہر چلے جائیں گے اور مسلمان تین دن مکہ میں رہ کر عمرہ کریں گے؛ اور مسافر جتنا ہتھیار لے کر چل سکتا ہے اس سے زیادہ وہ اپنے ساتھ ہتھیار نہ رکھیں۔[٥]

---

(۱) المغازی، ج۲، ص ۶۰۲.

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۰؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۷۸؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۹۹۔ ۹۷؛ بلاذری، انساب الاشراف، ج۱، ص ۳۵۰؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۹۶.

(۳) "لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرة فعلم ما فی قلوبهم فانزل السکینة علیهم و اثابهم فتحاً قریباً" سورۂ فتح، آیت ۱۸.

(٤) طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۷۸؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۱.

(٥) اس شرط کی رو سے، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں نے ۷ھ میں عمرہ انجام دیا جس کو "عمرة القضائ" کہا گیا ہے۔

۳۔ اگر قریش کا کوئی آدمی اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر محمد ﷺ کے پاس چلا جائے تو اس کو مکہ واپس کیا جائے اور اگر محمد ﷺ کے ساتھیوں میں سے کوئی قریش کے پاس آجائے تو قریش اس کو واپس نہیں کریں گے۔

٤۔ ہر قبیلہ آزاد ہے چاہے وہ محمد ﷺ کے ساتھ عہد و پیمان کرے یا قریش کے ساتھ، (اس مقام پر قبیلۂ خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان کا اعلان کیا اور بنوبکر نے قریش کے ساتھ عہد و پیمان کا اعلان کیا)۔

٥۔ مسلمان اور قریش دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کریں گے اور ان کے دشمن کا ساتھ نہیں دیں گے اور دشمنی کا اظہار نہیں کریں گے۔[۱]

٦۔ مکہ میں اسلام کی پیروی آزاد رہے گی اور کسی بھی شخص کو ایک خاص دین کی پیروی کی خاطر اذیت نہیں دی جائے گی اور اس کی مذمت نہیں کی جائے گی۔[۲]

۷۔ اصحاب محمد ﷺ میں سے جو شخص حج یا عمرہ یا تجارت کے لئے مکہ جائے اس کی جان و مال امان میں رہے گی اور قریش میں سے جو شخص مصر یا شام جانے کے لئے مدینہ کے راستہ سے گزرے گا اس کی جان و مال امان میں رہے گی۔[۳]

---

(۱) پیمان کی اس شرط کا عربی متن یہ ہے: "لا اسلال و لا اغلال و ان بیننا و بینہم عیبۃ مکفوفۃ" اسلال کے معنی خفیہ چوری اور کسی کی حمایت و مدد کرنا اور نیزرات کو حملہ کرنے کے معنی میں ہے۔ (ابن اثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، ج۲، ص ۳۹۲، مادۂ سل) قرائن کے حساب سے، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں (احمد میانجی، مکاتیب الرسول، ج۱، ص ۲۷۷)، اسی وجہ سے (بعض معاصر مورخین کے برخلاف) ہم نے اس کا ترجمہ چوری نہیںکیا ہے۔

(۲) طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۷؛ بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۳۵۱۔ ۳۵۰؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۲؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۹۷؛ بحار الانوار، ج۲۰، ص ۳۵۲؛ اور رجوع کریں: طبقات الکبریٰ، ج۲، ص ۹۷، ۱۰۱، ۱۰۲۔

(۳) طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۹۷؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۲، ص ۷۷؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص ۳۵۰ اور ۳۵۲.

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی

پیمان صلح کے اصول پر موافقت کے بعد، جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے پر علی نے صلح نامے کا مضمون لکھا تو نمائندہ قریش نے صلح نامے کے اوپر، بسم اللہ الرحمن الرحیم، اور نام محمد کے بعد "رسول اللہ" لکھنے کی مخالفت کی اور اس موضوع پر گفتگو کافی طولانی ہوگئی اور آخرکار رسول خد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ا نے کچھ مصلحتوں کے پیش نظر جو اس عہد وپیمان میں پائی جاتی تھیں، مجبور ہوکر موافقت کی اور علی رسول اللہ کا عنوان مٹانے سے کنارہ کش ہوگئے تو آپ نے فرمایا: ایسے حالات تمہارے لئے بھی پیش آئیں گے اور مجبور ہوکر تمہیں بھی ماننا پڑے گا[1] اور یہ پیشین گوئی جنگ صفین میں مسئلہ حکمیت کے موقع پر معاویہ کے اصرار پر علی کے نام کے آخر سے "امیر المومنین کا عنوان" مٹانے پر، پوری ہوئی۔[2]

صلح حدیبیہ کے آثار و نتائج

چونکہ مسلمان مستقبل میں اس صلح کے آثار و نتائج سے بے خبر تھے، لہٰذا اس کو "شکست" سمجھتے تھے[3] اور کچھ لوگ اس کو منت و سماجت کہتے تھے۔[4] تاکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس صلح پر دستخط کرنے سے روک

---

(۱) طبرسی، مجمع البیان، ج۹، ص ۱۱۸؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۳۵۰۔ ۳۳٤؛ صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں: مکاتیب الرسول، علی احمد میانجی، ج۱، ص ۲۷۵ اور ۲۸۷؛ کتاب وثائق، تالیف محمد حمید اللہ، ترجمہ: محمود مہدوی دامغانی، (تہران: ط و نشر بنیاد، ط ۱، ۱۳٦۵)، ص ٦٦و٦۸.

(۲) نصربن مزاحم، گزشتہ حوالہ، ص ۵۰۹۔ ۵۰۸؛ طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۷؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج۲، ص ۱۷۹؛ ابوحنیفہ دینوری، الاخبار الطوال، تحقیق: عدالمنعم عامر (قاہرہ: داراحیاء الکتب العربیہ، ۱۹٦۰.)، ص ۱۹٤؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج۳، ص ۳۲؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۷۰۸.

(۳) مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۰، ص ۳۵۰.

(٤) واقدی، مغازی، ج۲، ص ٦۰۷؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۳، ص ۳۳۱؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک ج۳، ص ۹۷؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۲، ص ۷۰٦؛ اس واقعہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادہ کی بعض مسلمانوں کی طرف سے کھلی مخالفت ایک طرح سے حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یادر حقیقت حکم خدا کے مقابلہ میں ان کے بے جا اجتہادیا خودرائے کی علامت تھی۔ اس قسم کی حرکت جو کہ بعد میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند صحابیوں کی طرف تکرار ہوئی، تاریخ اسلام میں تلخ و ناگوار واقعات کا سرچشمہ بنی جبکہ مسلمان ہونے کا مطلب حکم خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور پیروی اوران کے ارادہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وماکان لمؤمن و لامؤمنۃ اذا قضی اللہ و رسولہ أمراً أن یکون لہم الخیرۃ من أمرہم و من یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً" (سورۂ احزاب، آیت ۳٦.)

سکیں؛ لیکن جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے پیشین بینی کی تھی، اس صلح میں متعدد سیاسی و سماجی اثرات و نتائج پائے جاتے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ اس صلح کے نتیجے میں مشرکین نے مسلمانوں کے وجود کو تسلیم کیا۔ جبکہ اس سے پہلے مشرکین مسلمانوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور ان کی نابودی میں لگے ہوئے تھے۔

۲۔ مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان جو آہنی دیوار حائل تھی وہ اس صلح کے نتیجہ میں گر گئی او رمکہ و مدینہ میں امد و رفت، اور دونوں طرف کے لوگوں میں آزادانہ ارتباط اوراعتقادی بحث و مباحثہ کی وجہ سے مشرکین کی ایک بہت بڑی تعداد مسلمانوں کے استدلال اورنئی منطق کو سن کر اسلام کی طرف راغب ہوگئی اور مسلمان ہونے والوں کی تعداد اس صلح کے بعد فتح مکہ والے سال تک، ان کی گزشتہ مجموعی تعداد کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگئی۔[۱]

اس بارے میں یہ جاننا کافی ہوگا کہ اس سفر میں پیغمبر ﷺ کے اصحاب اٹھارہ سو (۱۸۰۰) سے زیادہ نہیں تھے جبکہ دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر اسلامی سپاہیونکی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

امام جعفر صادق ، اسلام کے حق میں حالات کی اس بڑی تبدیلی کے بارے میں فرماتے ہیں: "ابھی دو سال صلح کا زمانہ تمام نہیں ہوا تھا کہ قریب تھا کہ اسلام پورے مکہ پر چھا جائے"۔[۲]

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۳۳۶؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص ۸۱؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۷۱.

(۲) طبرسی، اعلام الوری، ص ۹۸؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۰، ص ۳۶۳.

۳۔ قریش کی مخالفتیں اور دشمنیاں اور ان کے فوجی حملوں کی وجہ سے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اتنا موقع فراہم نہیں ہو سکا تھا کہ جزیرۃ العرب کے اندر اور باہر اعلیٰ پیمانے پر تبلیغ کر سکیں، لیکن صلح کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کامیاب ہوئے کہ دشمنوں کو مدینہ کے اطراف سے ختم کر کے متعدد تبلیغی جماعتیں مختلف علاقوں میں بھیجیں۔ جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔ دنیا کے سربراہوں او راہم شخصیتوں کو اسلام کی طرف دعوت کے خطوط، صلح حدیبیہ کے بعد ہی بھیجے گئے ہیں۔

٤۔ یہ صلح ایک طرح سے فتح مکہ کا باعث قرار پائی۔ اس لئے کہ صلح کی چوتھی شرط کے بموجب قبائل کا قریش یا مسلمانوں سے ملنا، آزاد اعلان ہوا تھا اور قبیلہ "خزاعہ" مسلمانوں کے ساتھ متحد ہوگئے تھے اور قریش نے اس قبیلے پر حملہ کر کے عہد شکنی کی جس کے نتیجہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کا اقدام کیا۔

یہ صلح اپنے درخشندہ آثار و نتائج کے لحاظ سے، مسلمانوں کے لئے بہت بڑی فتح اور کامیابی قرار پائی۔ جیسا کہ حدیبیہ سے پلٹتے وقت، مدینہ کے راستے میں "سورۂ فتح" پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا(١) اور خداوند عالم نے اس صلح کو "فتح مبین" کہا۔(٢)

---

(١) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ١٠٥۔ ١٠٤؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٣، ص ٣٣٤؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص٩٨؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ٧١٤.

(٢) "انا فتحنا لک فتحاً مبیناً".

پانچواں حصہ

عالمی دعوت سے رحلت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک

پہلی فصل: عالمی تبلیغ

دوسری فصل: اسلام کا پھیلاؤ

تیسری فصل: حجۃ الوداع اور رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پہلی فصل

عالمی تبلیغ

پیغمبر اکرم ﷺ کی عالمی رسالت

اگرچہ دین اسلام بظاہر جزیرہ نمائے عرب، اور ایک مختصر سے قبیلے سے شروع ہوا تھا اور پیغمبر اکرم ﷺ بھی اسی عرب قوم سے تعلق رکھتے تھے لیکن اسلام ایک علاقے یا عربوں سے مخصوص دین نہیں تھا جس پر قرآن مجید کی وہ بہت سی آیات دلیل اور شاہد ہیں جن میں عربوں یا قریش سے خطاب نہیں کیا گیا بلکہ قرآن کے مخاطب ناس (تمام لوگ) ہیں، البتہ جن مواقع پر اسلام کے پیروؤں سے کوئی پیغام مخصوص ہے یا انہیں کچھ شرعی احکامات بتائے گئے ہیں وہاں قرآن مجید کے مخاطب، صرف مومنین یا مسلمان ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اپنی بعثت کی ابتداء سے ہی مکہ میں اپنے دین کو عالمی عنوان سے پیش کیا۔ چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اسلام کے اس عالمی پیغام کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ جس کے چند نمونے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

۱۔" اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے۔ اے لوگو! بیشک میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔[۱]

---

(۱)قل یا ایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعاً، سورۂ اعراف، آیت ۱۵۸.

۲۔ "اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اورنذیر بنا کر"۔(۱)

۳۔ "یہ قرآن مجید تمام عالمین کے لئے یادآوری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے"۔(۲)

٤۔ "یہ کتاب ذکر اور قرآن مبین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جو زندہ ہیں"۔(۳)

٥۔ "پروردگار وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجاتاکہ اس دین کو تمام ادیان پر کامیاب اور کامران کردے"۔(٤)

٦۔ "اور ہم نے آپ کو عالمین کے لئے سوائے رحمت کے اور کچھ نہیں بنا کر بھیجا ہے"۔(٥)

یہ تمام آیتیں مکی سوروں کی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی دعوت اور آپ کا پیغام سب لوگوں کے لئے تھا اور مکہ سے ہی آپ کے پیغام کی یہ خصوصیت واضح اور روشن تھی۔ لیکن ان تمام روشن اور واضح دلائل کے باوجود بعض مغربی لوگوں نے جیسے "گولت زیہر" نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ پیغمبر ﷺ کے دین اور پیغام نیز آپ کی رسالت کو بعد میں عمومیت دی گئی اور آپ کی ابتدائی تعلیمات اس زمانہ کے عرب ماحول کی ضروریات سے زیادہ نہیں تھیں(٦) جبکہ گزشتہ بیان کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس مغربی مدعی کی بات میں کتنا دم ہے اور ہمیں اس کے بارے میں مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱)و ما ارسلناک الا کافةً للناس بشیراً و نذیراً، سورۂ سبا، آیت ۲۸.

(۲)و ما هو الا ذکر للعالمین، سورۂ قلم، آیت ۵۲.

(۳)ان هو الا ذکر و قران مبین لینذر من کان حیاً، سورۂ یٰس، آیت ۷۰۔ ۶۹.

(٤) هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ...، سورۂ توبہ، آیت ۳۳.

(٥) و ما ارسلناک الا رحمة للعالمین، سورۂ انبیائ، آیت ۱۰۷.

(٦)رجوع کیجئے: محاکمۂ گولت زیہر،یہودی، محمدغزالی مصری، صدر بلاغی کا ترجمہ (تہران، حسینیۂ ارشاد۱۳۶۳)، ص ۸۰۔ ۷۹۔

عالمی تبلیغ کا آغاز

اگر پیغمبر اکرم ﷺ نے مکہ میں قیام کے دوران اور اس کے بعد ہجرت کے چند سال بعد تک، اسلام کو جزیرہ نمائے عرب سے باہر پھیلانے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین مکہ، یہودیوں اور دوسرے دشمنان دین کی ریشہ دوانیوں نے آپ کو اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن جب صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کے سامنے سے قریش کے تمام حملوں کے خطرات ٹل گئے اور آپ کو مدینہ میں نسبتاً سکون اور اطمینان حاصل ہوا تو آپ نے ذی الحجہ ٦ھ یا محرم ٧ھ میں اس دور کے اہم بادشاہوں کو خطوط لکھے جن میں ان کو اسلام کی طرف دعوت دی، پیغمبر اکرم ﷺ نے ایک دن کے اندر چھ خطوط اپنے چھ صحابیوں کے ذریعے اس دور کے شہنشاہان مملکت کے نام بھیجے جن کے نام یہ ہیں: نجاشی بادشاہ حبشہ، قیصر روم، خسرو پرویز بادشاہ ایران، مقوقس بادشاہ مصر، حارث بن شمر غسانی حاکم شام، حوضہ بن عدی بادشاہ یمامہ۔[١]

البتہ یہ پیغمبر ﷺ کی عالمی تبلیغ کا آغاز تھا اور دنیا کے اہل اقتدار کی طرف آپ کے دعوت نامے صرف انھیں چھ خطوط میں محدود نہیں رہے بلکہ آپ نے اس کے بعد بھی اپنی وفات تک مختلف مواقع پر دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی اپنے سفیر بھیجے تھے[٢] جن میں خطوط کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی تھا اور سب کے سب بہت ہی سادہ، بے تکلف اور صریح عبارت میں لکھے گئے تھے البتہ دنیا کے شہنشاہان مملکت کا عکس العمل ان کے مقابلے میں یکساں نہیں تھا۔

---

(١)ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ١، ص ٢٦٢۔ ٢٥٨.

(٢)علی احمدی میانجی، مکاتیب الرسول، ج ١، ص ٣١، ابن ہشام نے آنحضرت ﷺ کے خطوط کو دس عدد (سیرۃ النبویہ، ج ٤، ص ٢٥٤)، یعقوبی نے پیغمبر ﷺ کے کل تبلیغی خطوط کی تعداد تیرہ عدد (تاریخ یعقوبی، ج ٢، ص ٦٧۔ ٦٦) اور مسعودی نے کتاب التنبیہ و الاشراف میں (ص ٢٣٦۔ ٢٢٧) ان خطوط کی تعداد چھ بتائی ہے۔ اس زمانے کے ایک محقق نے آپ کے خطوط کی کل تعداد بیس بتائی ہے۔ (احمد صابری ہمدانی، محمد و زمامداران، (قم: دار العلم، ج ٢، ص ١٣٤٦)

جنگ خیبر

خیبر چند قلعوں کے مجموعے کا نام تھا، جہاں کے لوگوں کا مشغلہ کھیتی باڑی کرنا اور مویشی پالنا تھا، وہ علاقہ چونکہ بہت ہی زرخیز تھا لہٰذا اس کو حجاز کے غلّے[۱] کا گودام کہا جاتا تھا۔ خیبریوں کی اقتصادی حالت بہت اچھی تھی جس کا پتہ اس غذا اور اسلحوں کے اس ذخیرے سے لگایا جاسکتا ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں ان قلعوں کی فتح کے بعد سامنے آیا تھا۔ یہ قلعے نظامی اعتبار سے مستحکم اور مضبوط بنے ہوئے تھے جن کے اندر موجود فوجیوں کی تعداد دس ہزار تھی[۲] اسی وجہ سے یہودی اپنے کو سب سے طاقتور سمجھتے تھے اور یہ تصور کرتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ان سے جنگ کرنے کی ہمت اور طاقت نہیں ہے۔[۳]

۶ھ میں سلام بن ابی الحقیق جو بنی نضیر کا ایک سردار تھا اور خیبر کے یہودیوں کی لیڈر شپ اس کے ہاتھ میں آگئی تھی اس نے قبیلۂ غطفان اور دوسرے مشرک قبیلوں کو جمع کر کے مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کی خاطر بڑی فوج تیار کرلی اس کی ان فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں اس کے قتل ہو جانے کے بعد خیبریوں نے اس کی جگہ اسیر ابن زارم * کو اپنا سردار چن لیا اس نے بھی اسلام دشمنی کی وجہ سے ان قبائل کو اسلام کے خلاف اکسایا۔[٤]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گزشتہ دشمنیوں اور جھگڑوں کو مصالحت کے ساتھ حل کرنے کے لئے عبد اللہ بن رواحہ کی سرپرستی میں ایک وفد اس کے پاس بھیجا تاکہ اس کو راضی کرسکے وہ جب عبد اللہ بن رواحہ اور

---

(۱) واقدی، المغازی، تحقیق مارسڈن جونس، ج۲، ص۶۳٤، سیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ج٤، ص۳٦۰.

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۷۰۳۔ ۳٦۷، یعقوبی نے ان کی تعداد بیس ہزار افراد لکھی ہے۔ (ج۲، ص٤٦.)

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص٦۳۷۔

* یسیرم بن رزام یا رازم بھی لکھا گیا ہے۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص۲٦٦.)

(٤) الکبریٰ ابن سعد، ج۲، ص۹۲۔ ۹۱.

اپنے کچھ یہودی ساتھیوں کے ساتھ ایک وفد کی صورت میں مدینہ کی طرف آرہا تھا تو راستے میں اپنے اس فیصلے سے نادم ہوا اور اس نے سوچا کہ عبد اللہ کو قتل کردے، چنانچہ طرفین کی اس چھڑپ میں وہ اور اس کے ساتھی مارے گئے[۱] اور اس طرح پیغمبر کی یہ مصالحت آمیز کوشش کارگر نہ ہو سکی۔

ان تمام سازشوں اور فتنوں کے علاوہ موجودہ دور کے ایک مورخ کے بقول اس وقت یہ خطرہ بھی پایا جاتا تھا کہ خیبر کے یہودی، مسلمانوںسے پرانی دشمنی کی بناپر اور بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ایران یا روم کے آلۂ کار بن سکتے ہیں اور ان کے اشارے پر مسلمانوں پر حملہکر سکتے ہیں۔[۲]

پیغمبر اکرم ﷺ جب صلح حدیبیہ کے بعد جنوبی علاقے کے خطرات کی طرف سے مطمئن ہوگئے تو آپ نے ۷ھ کے آغاز میں ۱٤۰۰ افراد پر مشتمل، لشکر کے ساتھ[۳]، یہودیوں کی گوش مالی کے لئے شمال کی طرف روانہ ہوئے اور اسلامی فوج کے لئے ایسے راستے کا انتخاب کیا جس سے غطفان جیسے طاقتور قبیلے کا رابطہ جس کا اس وقت خیبریوں سے معاہدہ تھا خیبریوں سے ٹوٹ گیا، جس کے بعد ان کے درمیان ایک دوسرے کی امداد اور تعاون کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا۔[٤] یہودیوں پر اچانک اور ان کی بے توجہی سے فائدہ اٹھا کر حملہ کرنے کی حکمت عملی کے نتیجہ میں راتوں رات قلعۂ خیبر اسلامی فوج کے محاصرے میں آگیا اور جب صبح ہوئی تو یہودیوں کے سردار اس خطرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج ٤، ص ۲٦۷۔ ۲٦٦.

(۲) محمد حسین ہیکل، حیات محمد ﷺ، (قاہرہ: مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ط۸)، ص ۳۸٦.

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٦۸۹، طبقات الکبریٰ محمد بن سعد، (بیروت: دار صادر) ج ۲، ص ۱۰۷، گزشتہ حوالہ، ابن ہشام، ج ٤، ص ۳٦٤.

(٤) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٦۳۹.

البتہ پھر بھی مسلمانوں اور خیبریوں کی یہ جنگ برابر کی لڑائی نہیں تھی کیونکہ وہ لوگ بہت ہی مضبوط و مستحکم اور مورچہ بند قلعوں کے اندر تھے اور انھوں نے قلعوں کے دروازے بند کر رکھے تھے اور میناروں کے اوپر سے تیر اندازی کر کے یا پتھر برسا کر اسلامی فوج کو قلعہ کی دیوار سے نزدیک نہیں ہونے دے رہے تھے چنانچہ ایک حملے میں اسلامی فوج کے پچاس سپاہی زخمی ہوگئے۔[۱]

دوسری طرف سے ان کے پاس کافی مقدار میں خوراک کا ذخیرہ موجود تھا مگر اس محاصرہ کے طولانی ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس خوراک کا ذخیرہ کم ہوگیا انجام کار نہایت دشواریوں اور زحمتوں کے بعد خیبر کے قلعے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضہ میں آنے لگے لیکن آخری قلعہ جس کا نام قموص تھا اور اس کا سپہ سالار مرحب تھا جو یہودیوں کا مشہور پہلوان بھی تھا یہ قلعہ آخر تک کسی طرح فتح نہ ہوسکا اور اسلامی فوج کے سپاہی اس پر قبضہ نہ کرسکے۔ ایک روز پیغمبر ﷺ نے اسلامی فوج کا پرچم حضرت ابوبکر اور دوسرے روز حضرت عمر کے حوالہ کیا اور فوج کو ان کے ساتھ یہ قلعہ فتح کرنے کے لئے روانہ کیا لیکن دونوں افراد کسی کامیابی اور فتح کے بغیر رسول خدا کے پاس واپس آگئے[۲]۔ آپ نے یہ صورت حال دیکھ کر ارشاد فرمایا:

"کل میں یہ پرچم اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھو ںخداوند عالم اس قلعہ کو فتح کرائے گا وہ ایسا شخص ہے جو خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور اس کا رسول بھی اسے دوست رکھتے ہیں وہ کرار غیر فرار ہوگا" اس رات پیغمبر ﷺ کے تمام صحابہ کی یہی آرزو تھی کہ کل پیغمبر، اسلامی فوج کا پرچم اس کے حوالے کردیں جب سورج طلوع ہوا، پیغمبر نے فرمایا: علی کہاں ہیں؟ سب نے عرض کی کہ علی کو آشوب چشم ہے اور وہ آرام کر رہے ہیں، پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی کو طلب کیا اور آپ کی آنکھوں کو

---

(۱)وہی حوالہ، ص ٦٤٦.

(۲)طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۳، ص ۹۳؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص ۳٤۹؛ ابن کثیر، البدایہ و النہایہ (بیروت: مکتبۃ المعارف، ط ۲، ۱۹۷۷ع) ج٤، ص۱۸٦.

اپنی کرامت سے شفا بخشی اور اس کے بعد اسلامی فوج کا علم ان کے حوالے کیا اور فرمایا :

ان کی طرف جاؤ اور جب ان کے قلعہ کے پاس پہنچنا تو پہلے انھیں اسلام کی دعوت دینا اور خدا کے احکام کی اطاعت کے بارے میں جو ان کا وظیفہ ہے وہ ان کو یاد دلانا، خدا کی قسم اگر پروردگار نے تمہارے ہاتھوں ان میں سے ایک شخص کو بھی ہدایت کر دی تو یہ تمہارے لئے اس سے کہیں بہتر ہے کہ تمہارے پاس سرخ بالوں * والے بہت سے اونٹ ہوں۔[(۱)]

---

* سرخ بالوں والے اونٹ سب سے زیادہ پسندیدہ اور قیمتی ہوتے تھے یہ مثال بہت زیادہ مال و دولت کی طرف اشارہ تھی ۔

(۱) پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ کلام اور حضرت علی کی سرداری تھوڑے سے الفاظ اور تعبیرات کے اختلاف کے ساتھ مندرجہ ذیل کتابوں میں نقل ہوئی ہیں:

صحیح بخاری، تحقیق: الشیخ قاسم اشماعی الرفاعی (بیروت: دار القلم، ط ۱، ۱٤۰۷ھ.ق)، ج۵؛ کتاب المغازی، باب ۱۵۵، ص۲٤۵؛ صحیح مسلم، بشرح النوی (بیروت: دار الفکر، ۱٤۰۱ھ.ق)، ج۱۵، ص۱۷۷ ـ ۱۷٦؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۱۱۱ ـ ۱۱۰؛ صدوق، کتاب الخصال (قم: منشورات جماعة المدرسین، ۱٤۰۳ھ.ق)، ص ۳۱۱ (باب الخمسة)؛ طبری، تاریخ الامم والملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۳، ص۹۳؛ شیخ سلیمان قندوزی حنفی، ینابیع المودة (بیروت: مؤسسة الاعلمی للمطبوعات)، ج ۱، ص٤۷؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۲۱۹؛ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، (در حاشیۂ الاصابہ)، ج۳، ص۳٦؛ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی الصحیحین (بیروت: دار المعرفه، ۱٤۰٦ھ.ق)، ج۳، ص۱۰۹؛ ابن ہشام، السیرة النبویہ، ج۳، ص۳٤۹؛ ابن حجر ہیثمی مکی، الصواعق المحرقة، مکتبة القاہرہ، ۱۳۸۵ھ.ق)، ص ۱۲۱؛ واقدی، المغازی، ج۲، ص٦۳۵؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص٤٦؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج٤، ص۱۸٦؛ حلبی، انسان العیون (السیرة الحلبیہ)، ج۲، ص۷۳٦ـ ۷۳۳؛ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی، الامالی (قم: دار الثقافه، ۱٤۱٤ھ.ق)، ص۳۸۰۔

حضرت علی پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق روانہ ہوئے اور ایک دلیرانہ جنگ میں مرحب کو قتل کیا اور بے نظیر و لاجواب شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مستحکم اور مضبوط قلعے کو فتح کرلیا۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس فتنہ اور فساد اور سازشوں کے اڈے یعنی خیبر کی فتح میں چند اسباب اور عوامل کارفرما تھے جن میں سے پیغمبر اکرم ﷺ کی بہترین سپہ سالاری اور جنگی حکمت عملی (جیسے دشمن کی غفلت سے فائدہ اٹھانا دشمن سے متعلق خبریں اور ان کے قلعوں کی اندرونی معلومات حاصل کرنا) اور بالآخر حضرت علی کی بے نظیر شجاعت کا بھی اس میں کافی اہم کردار تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی کی اس بہادری اور فداکاری کو اس انداز سے سراہا کہ اس دور کے ہر مسلمان بچے بچے کی زبان پر آپ کی بہادری کا کلمہ تھا اور اس کے مدتوں بعد تک آئندہ نسلوں کو بھی یہ واقعہ معلوم تھا اور اس دور کی تاریخ میں اسے اتنا عیاں اور روشن سمجھا جاتا تھا کہ معاویہ نے اپنی حکومت میں حضرت علی پر سب و شتم کو عام کرنے کے باوجود جب ایک دن سعد وقاص سے کہا کہ تم علی پر سب و شتم کیوں نہیں کرتے ہو؟ تو اس نے کہا: میں یہ کام ہرگز نہیں کرسکتا ہوں، کیونکہ مجھے بخوبی یاد ہے کہ پیغمبر ﷺ نے ان کی ایسی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں کہ میری آرزو اور تمنا ہے کہ کاش ان میں سے صرف ایک ہی فضیلت میرے اندر بھی پائی جاتی۔

۱۔ ایک جنگ (جنگ تبوک) میں جاتے وقت پیغمبر ﷺ نے ان کو مدینہ میں اپنا جانشین بنادیا تھا تو انھوں نے پیغمبر ﷺ سے کہا تھا کہ آپ نے مجھے شہر میں بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑ دیا! پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ تمہاری نسبت میرے ساتھ ویسی ہی ہو جو ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی (یعنی ان کی جانشینی اور خلافت) بس فرق اتنا سا ہے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا"۔

۲۔ آپ نے جنگ خیبر میں فرمایا: کل میں پرچم اس شخص کے سپرد کروں گا جو خدا اور پیغمبر ﷺ کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور پیغمبر بھی اس سے محبت کرتے ہوں گے اس دن ہم سب کی یہی آرزو تھی کہ یہ مقام اور منصب ہمیں مل جائے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: علی کو بلاؤ! ان کو بلایا گیا جبکہ ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی پیغمبر ﷺ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگایا اور آپ کی آنکھیں فوراً ٹھیک ہوگئیں اور آپ نے فوج کا علم ان کے حوالے کیا اور خدا نے ان کے سر پر قلعہ قموص کی فتح کا سہرا باندھا۔

۳۔ جب مباہلہ سے متعلق قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی "فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم "[۱] تو پیغمبر اکرم ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلایا اور کہا: "خدایا! یہ میرے اہل بیت ہیں"[۲]

حضرت علی نے اس تاریخ ساز جنگ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا: "ہمیں جنگجوؤں، اسلحوں اور جنگی سازو سامان کے ایک پہاڑ (طوفان) سے مقابلہ کرنا پڑا، ان کے قلعہ نا قابل تسخیر اور ان کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کے دلاور اور بہادر ہر روز قلعوں سے باہر آتے تھے، مبارز طلب کرتے تھے اور ہماری فوج کا جو شخص بھی میدان میں قدم رکھتا تھا مارا جاتا تھا جس وقت جنگ کی آگ بھڑک گئی اور دشمن نے مبارز طلب کیا، ہمارے سپاہیوں کے ہاتھ پیر دہشت اور خوف کے مارے لرزنے لگے اور وہ ایک دوسرے کو عاجزانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے سب نے مجھ سے آگے بڑھنے کے

---

(۱) سورۂ آل عمران، آیت ٦١.

(۲) شرح صحیح مسلم، النووی، ج۱۵، ص ۱۷٦، سعد وقاص (قبیلۂ بنی زہرہ سے) جو کہ سابقین اسلام میں سے تھا اور ۱۷ سال کی عمر میں (الطبقات الکبریٰ، ج۳، ص ۱۳۹، یا ۱۹ سال کی عمر میں (السیرۃ الحلبیہ، ج۹، ص ٤۳٤) مکہ میں دائرہ اسلام میں آگیا وہ جب مدینہ میں تھا تو اس کا شمار بڑے مہاجروں میں ہوتا تھا اور سیاسی طور پر حضرت علی کا رقیب اور عمر کے قتل ہو جانے کے بعد خلافت کی چھ رکنی کمیٹی کا ایک ممبر تھا۔ اور اس کمیٹی میں اس نے علی کو ووٹ نہیں دیا، (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱، ص۱۸۸) عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد حضرت علی لوگوں کے عظیم استقبال پر ظاہری طور پر خلافت و حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اس وقت بہت ہی لوگ تھے جنھوں نے آپ کی بیعت نہیں کی ان میں یہ بھی ایک تھا۔ (مسعودی، مروج الذہب، ج۲، ص ۳۵۳؛ ابن اثیر، الکافی فی التاریخ، ج۳، ص ۱۹۱) لیکن ان تمام باتوں کے باوجود علی کی تین بڑی فضیلتوں کا معترف تھا۔

لئے کہا: پیغمبر ﷺ نے بھی مجھ سے کہا کہ آگے بڑھو اور قلعہ پر حملہ کرو، میں نے قدم آگے بڑھایا اور ان کے جس پہلوان اور بہادر سے روبرو ہوا اس کو ہلاک کرڈالا اور ان کے جس جنگجو نے میرا مقابلہ کرنا چاہا وہ زمین پر نظر آیا اور آخر کار وہ عقب نشینی پر مجبور ہوگئے، اس کے بعد اس شیر کی طرح جو اپنے شکار کا پیچھا کر رہا ہو میں نے ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ انھوں نے قلعے میں پناہ لے لی اور اس کے دروازے کو بند کر لیا، میں نے قلعہ کے دروازے کو اکھاڑ پھینکا اور تنہا قلعہ میں داخل ہوگیا... اس موقع پر خداوند عالم کے علاوہ میرا اور کوئی معاون و مددگار نہیں تھا۔[۱]

آخری قلعہ فتح ہونے کے بعد خیبریوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی اور ہتھیار ڈال دئے اور جنگ تمام ہوگئ۔ مورخین کے مطابق یہودیوں کے ۹۳ آدمی[۲] مارے گئے اور شہداء اسلام کی تعداد ۲۸ تھی۔[۳]

یہودیوں کا انجام

جب خیبر کے یہودیوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی تو انھوں نے اس بات کو دلیل بنا کر کہ وہ لوگ کھیتی باڑی کے ماہر ہیں، پیغمبر ﷺ سے یہ خواہش کی کہ وہ لوگ اپنے اس علاقہ میں اسی طرح باقی رہیں اور کھیتی باڑی کرتے رہیں۔ پیغمبر ﷺ نے ان کی اس درخواست کو قبول فرما لیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہر سال اپنی کھیتی باڑی اور غلہ کی آمدنی کا آدھا حصہ اسلامی حکومت کو ادا کریں گے[٤] اور جس وقت بھی

---

(۱)صدوق، الخصال، ص ۳۶۹، باب السبعہ.

(۲)بحار الانوار، مجلسی، ج ۲۱، ص ۳۲.

(۳)تاریخ پیامبر اسلام: محمد ابراہیم آیتی، (تہران: ناشر دانشگاہ تہران، چ ۳، ۱۳٦۱) ص ٤۷۵۔ ٤۷۳.

(٤) واقدی، المغازی، ج ۲، ص ٦۹۰، معجم البلدان، یاقوت حموی، ج ۲، ص ٤۱۰ (لغت خیبر)

آنحضرت کہیں ان لوگوں کو اس ملک سے باہر جانا ہوگا۔[۱] یہ معاہدہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ تک اسی طرح باقی رہا مگر خلیفۂ دوم کے دور حکومت میں ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف پھر شورش کرنا چاہی تو حضرت عمر نے ان کو شام کی طرف جلاوطن کردیا۔[۲]

فدک

اہل خیبر کی شکست کے بعد، فدک کے یہودی کسی مقابلہ کے بغیر پیغمبر ﷺ کے سامنے تسلیم ہوگئے اور خیبریوں کے معاہدے کی طرح، پیغمبر ﷺ سے ایک معاہدہ کیا اور چونکہ فدک کسی جنگ کے بغیر فتح ہوا تھا لہٰذا اس کی آدھی آمدنی "خالصہ" یعنی رسول خدا کی ذاتی ملکیت قرار پائی۔[۳]

---

(۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۳، ص ۳۵۲.

(۲) یاقوت حموی، گزشتہ حوالہ، ص ۴۱۰، فتوح البلدان (بیروت: ۱۳۹۸) ص ۳۷۔ ۳۶.

(۳) بلاذری، گزشتہ حوالہ، ص ۴۲، گزشتہ حوالہ، ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۵۲، الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، ج ۲، ص ۲۲۴، گزشتہ حوالہ واقدی، ج ۲، ص ۷۰۷، گزشتہ حوالہ، یاقوت حموی، ج ۴، ص ۲۳۸ (لغت فدک): الاموال، ابو عبید قاسم بن سلام: تحقیق محمد خلیل ہراس (بیروت: دار الفکر، ط ۲، ۱۳۹۵ھ ص ۱۶.

دوسری فصل

اسلام کا پھیلاؤ

جنگ موتہ

جیسا کہ گزر چکا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد اپنی عالمی رسالت کا آغاز کیا اور دنیا کے شہنشاہان مملکت کو اسلام کی طرف دعوت دی اس زمانے کے ملکوں میں روم اور ایران جیسی بڑی حکومتیں سپر پاور سمجھی جاتی تھیں، قیصر روم تک پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت کے بارے میں خبریں پہنچی تھیں جس کی بنا پر وہ اسلام قبول کرنے کی طرف مائل تھا لیکن جب اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اسے عیسائیوں اور روم کی فوج کی بہت سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنا پر اسے مجبوراً اپنے فیصلہ کو تبدیل کرنا پڑا،[1] اس سے صاف واضح ہے کہ ان کے دوسرے امراء اور عہدے دار اسلام کے بارے میں معاندانہ رویہ رکھتے تھے۔ اس زاویہ نگاہ سے جنگ موتہ کی ابتدا کی صحیح علت تلاش کی جا سکتی ہے!! پیغمبر اسلا ﷺ م نے جزیرۃ نمائے عرب سے باہر اپنی دعوت اور تبلیغ کو عام کرنے کے لئے ۸ھ میں حارث بن عمیر ازدی کو یہ خط دے کر بُصریٰ "شام" کے بادشاہ کے پاس بھیجا۔[2]

---

(۱) زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ (بیروت: دار المعرفہ، ط۲) ج۲، ص ۱۷۰ - ۱۷۱؛ حلبی، السیرۃ الحلبیۃ (انسان العیون)، (بیروت:: دار المعرفۃ)، ج۳، ص ۲۸۹ - ۲۹۰.

(۲) حلبی لکھتا ہے کہ یہ خط، روم کے بادشاہ ہرقل کے نام تھا جو اس وقت شام میں رہتا تھا، سیرۃ الحلبیہ، ج۲، ص ۷۸٦.

شرحبیل بن عمروغسانی جو اس وقت قیصر روم کی طرف سے شام کا گورنر تھا[۱] اس نے رسول خدا کے سفیر کو قید کرلیا اوران سے ان کی ذمہ داری کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے کے بعد "موتہ" نامی گاؤں میں انھیں قتل کرڈالا، پیغمبر ﷺ کے لئے یہ حادثہ تلخ اورناگوار تھا اورآپ اس سے بہت غمزدہ اور متاثر ہوئے۔[۲]

اگرچہ ایک آدمی کے قتل ہو جانے سے کوئی جنگ نہیں چھڑتی ہے لیکن اس دور میں سفرائے ملت کو جو اہمیت اور حقوق حاصل تھے ان کے مطابق اوردوسرے اخلاقی اصولوں کے برخلاف پیغمبر ﷺ کے سفیر کا قتل در حقیقت آپ کے لئے ایک طرح کی نظامی اور فوجی دھمکی تھی اور شام کے گورنر کی طرف سے پیغمبر ﷺ کی مسالمت آمیز دینی دعوت کے مقابلے میں اپنی قدرت کا اظہار تھا اسی وجہ سے پیغمبر اکرم ﷺ نے اس علاقہ میں ایک فوج روانہ کرنے کا ارادہ کیا آپ کے اس اقدام کو اسلام کا پیغام عزت اوردشمن کے مقابل اپنی نظامی قوت کے اظہار کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس بنیادپر رسول خدا نے ۳ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکرسرزمین موتہ کی طرف روانہ کیا جس کی سپہ سالاری بالترتیب جناب جعفربن ابوطالب[۳]؛ زیدبن حارثہ اور عبد اللہ بن رواحہ کے حوالے کی۔ یعنی اگر ان میں سے کوئی ایک شخص

---

(۱)وہی حوالہ، ج۲، ص ۷۸۶.

(۲)واقدی، المغازی، تحقیق مارسڈن جونس (بیروت: مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات) ج۲، ص ۷۵۵، طبقات الکبری، ابن سعد، بیروت: دار احیائ، ج۲، ص ۱۲۸.

(۳)جعفربن ابی طالب، حبشہ میں برسوں سکونت کے بعد ۷ھ میں مدینہ پلٹ کر آئے اور فتح خیبر کے بعد اسی علاقہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور آنحضرت ﷺ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ (ابن سعد، الطبقات الکبری، (بیروت: دار صادر)، ج۴، ص۳۵؛ ابن اثیر، اسد الغابہ (تہران: المکتبۃ الاسلامیہ، ۱۳۳۶ش)، ج۱، ص ۲۸۷؛ ابن عبد البر، الاستیعاب، (حاشیہ اصابہ میں)، ج ۱، ص ۲۱۰؛ ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبین، تحقق سید احمد صفر (قم: منشوراتا لشریف الرضی، ۱٤۱٦ھ)، ص۳۰؛ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، (بیروت: مکتبۃ المعارف) ، ج٤، ص۲۰٦.)

شہید ہو جائے تو دوسرا شخص اس کے بعد فوج کا سپہ سالار ہوگا۔[۱]

موتہ نامی ایک دیہات کے کنارے اسلامی فوج کا سامنا روم کی فوج سے ہوا جس کے فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ تینوں سپہ سالاروں نے ترتیب وار اسلامی فوج کا پرچم اپنے ہاتھوں میں بلند کرتے ہوئے جنگ کی اور منزل شہادت پر فائز ہو گئے اس کے بعد اسلامی فوج کے سپاہیوں نے خالدبن ولید کو اپنا سپہ سالار منتخب کیا اس نے مختلف طریقوں سے پہلے تو دشمن کو مرعوب کیا اور اس کے بعد عقب نشینی کا حکم دیدیا اور اسلامی فوج کو مدینہ واپس لے آیا۔[۲]

واقدی نے... اس جنگ کے شہداء کی تعداد آٹھ[۳] اور ابن ہشام نے بارہ[٤] ذکر کی ہے اور

---

(۱)طبرسی، اعلام الوریٰ بأعلام الہدیٰ (دار الکتب الاسلامیہ)، ط۳، ص ۱۰۷۔ مشہور یہ ہے کہ اس لشکر کی سپہ سالاری میں جناب زید جناب جعفر پر مقدم تھے لیکن کچھ شیعہ روایات (جیسا کہ طبرسی نے نقل کیا ہے) جناب جعفر کے مقدم ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور قرائن و شواہد بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ (جعفر سبحانی، فروغ ابدیت (قم: مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، ۱۳۶۸، ط۵، ج۲، ص ۲۹۳۔ ۲۹۱۔) محمد بن سعد کی ایک روایت بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔ (الطبقات الکبریٰ، ج۲، ص۱۳۰) مزید اطلاع کے لئے مجموعۂ مقالات "دراسات و بحوث فی التاریخ و الاسلام"، جعفر مرتضی، ج۱، ص۲۱۰ کے بعد، مراجعہ کریں۔

(۲)ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۵۵ھ) ج٤، ص۲۱۔ ۱۹؛ محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۳، ص۱۱۰۔ ۱۰۷؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۵۶۹۔ ۷۵۵؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳۰۔ ۱۲۸؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۷۹۳۔ ۷۸۷؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۱۰٤۔ ۱۰۲؛ زینی دحلان، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۷۲۔ ٦۸؛ مجلسی، بحار الانوار (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸٤ھ)، ج۲۱، ص ٦۳۔ ۵۰؛ طوسی، الامالی (قم: دار الثقافہ، ط۱، ۱٤۱٤ھ)، ص ۱٤۱۔

(۳)المغازی، ج۲، ص ۷٦۹.

(٤) السیرۃ النبویہ، ج٤، ص۳۰.

بعض جدید کتابوں میں ان کی تعداد سترہ (۱۷)[۱] ذکر کی گئی ہے آج بھی ان شہداء کی قبریں، شہر موتہ[۲] کے نزدیک موجود ہیں اور تینوں سپہ سالاروں کی قبروں کے اوپر بہترین گنبد موجود ہیں اور جناب جعفر کی قبر کے نزدیک ایک خوبصورت مسجد بھی موجود ہے۔[۳]

فتح مکہ

جیسا کہ گزر چکا صلح حدیبیہ کے معاہدے کی ایک شق دس سال تک مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ بندی تھی، اس کی بنا پر پیغمبر اسلا ﷺ م کو قریش کی شرارتوں اور ان کے فوجی حملوں کی طرف سے سکون اور اطمینان حاصل ہوگیا تھا۔ اسی کے بعد آپ نے بہت بلند اقدامات کئے اور مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لئے متعدد لوگوں کو بھیجا اور اپنی عالمی رسالت کا باقاعدہ آغاز کیا۔ مدینہ کے اطراف میں بہت سے دشمن قبائل کو غیر مسلح کردیا یا ان سے صلح اور دوستی کا معاہدہ کیا اور خیبر جو تمام فتنوں کا اڈہ اور مرکز تھا وہ تو آپ کے ہاتھ پہلے ہی فتح ہو چکا تھا۔

قریش کی عہد شکنی

صلح حدیبیہ کے معاہدے کے دو سال بعد قریش نے اس معاہدے کو توڑ دیا کیونکہ اس صلح نامہ کی چوتھی شق کے مطابق ہر قبیلہ کو یہ اختیار تھا کہ وہ یا پیغمبر ﷺ کے ساتھ معاہدہ کرلے یا قریش کے ساتھ دوستی

---

(۱) محمد ابراہیم آیتی، تاریخ پیامبر اسلام ﷺ (تہران: ناشر: تہران یونیورسٹی، ۱۳۶۱)، ص ۵۰۱.

(۲) یہ شہر ملک اردن کے جنوبی صوبہ کرک میں ہے جو کہ شہر امان (اردن کا دار الحکومت) سے ۱۳۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے.

(۳) جعفر سبحانی، ملک اردن کے سفر کی رپورٹ (موتہ: ایک یادگاری جگہ ہے) مجلۂ درسہائی از مکتب اسلام، سال ۳۸ شمارہ ۷، ماہ مہر ۱۳۷۷.

کرلے۔ اسی دوران قبیلۂ خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ اور قبیلۂ بنو بکر (بنی کنانہ) نے قریش کے ساتھ اتحاد کرلیا۔[1] ۸ ہجری، میں قبیلہ بنی بکر نے، قبیلۂ خزاعہ پر حملہ کردیا، اس حملہ میں قریش نے فوجی سازو سامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ بنی بکر کا تعاون کیا اور کچھ خزاعیوں کو قتل کرڈالا۔ جس کی بنا پر حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔[2] اس کی وجہ سے قبیلۂ خزاعہ کے سردار نے پیغمبر اکرم ﷺ سے مدد طلب کی۔ حضرت نے عمومی تعاون کا اعلان کردیا[3] اور یہ ارادہ کیا کہ مکہ پر حملہ کردیا جائے مگر اس حملہ کی اطلاع قریش کو نہ ہونے پائے اور دشمن کو اس بات کا پتہ نہ چلے اور مکہ کسی طرح کی خونریزی اور جنگ کے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے، آپ نے اپنے مقصد کو پوشیدہ رکھا[4] اور یہ حکم دیا کہ مکہ کے راستہ کو زیر نظر رکھا جائے[5] اور خدا سے دعا کی کہ قریش کو آپ کے اس اقدام سے بے خبر رکھے۔[6] پیغمبر اکرم ﷺ تمام قوت و طاقت کو جمع کرکے دس ہزار[7] کا لشکر لیکر مکہ کی طرف روانہ

---

(۱) ظہور اسلام سے قبل ان دو قبیلوں کے درمیان دشمنی اور خون خرابہ ہوتا رہتا تھا۔ (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ج٤، ص ۳۱) اسی زمانہ سے خزاعہ نے عبد المطلب کے ساتھ عہد باندھا تھا۔ (المغازی، واقدی، ج۲، ص ۷۸۱).

(۲) السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۳، المغازی واقدی، ج۲، ص۷۸۳، تاریخ یعقوبی، ابن واضح (نجف، المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ.ق) ابن ہشام کہتا ہے: "اس حملہ میں ایک شخص قبیلۂ خزاعہ کا مارا گیا" (ج٤، ص ۳۳) لیکن واقدی اور ابن سعد نے مارے جانے والوں کی تعداد ۲۰ عدد لکھی ہے (المغازی، ج۲، ص ۷۸٤، طبقات الکبریٰ، ج۲، ص ۱۳٤).

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۸۰۰۔ ۷۹۹، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳۵.

(٤) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۸۰۲۔ ۷۹٦؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳٤.

(۵) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۷۹٦ ۔ ۷۸٦؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳٤.

(٦) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۳٤؛ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ٤۷.

(۷) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ٤۲۔ ٤۳؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳۵؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۸۰۱.

ہوگئے آپ کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور جب تک اسلامی فوج نے مکہ کے دروازہ کے سامنے (مرّ الظہران کے مقام پر) پڑاؤ نہ ڈال دیا قریش کے جاسوس اس سے باخبر تک نہ ہوسکے۔

جناب عباس، پیغمبر ﷺ کے چچا اس وقت تک مکے میں موجود تھے اور جب اسلامی لشکر مکہ کی طرف آرہا تھا تو یہ مدینے کی طرف جارہے تھے، جحفہ کی منزل پر وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں پہونچے اور مسلمانوں کے ساتھ مکہ واپس پلٹ آئے۔ اسلامی لشکر نے مکہ کے باہر جو پڑاؤ ڈال رکھا تھا اس کی آخری شب میں شہر سے باہر ابو سفیان سے آپ کا سامنا ہوا آپ اس کو پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں لائے[۱] ابوسفیان اسلامی لشکر کی عظمت اور کثرت کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا رسول خدا نے اس کو معاف فرمادیا اور جناب عباس کی اس درخواست کے مطابق کہ جو شخص بھی مسجد الحرام میں پناہ لے لے یا اپنے گھر میں بیٹھا رہے یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے، وہ امان میں ہے۔

اسلامی لشکر کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ابوسفیان نے رسول خدا کی طرف سے جاری امان نامے کی اطلاع اہل مکہ کو دیدی اس تدبیر کی وجہ سے آپ کو کسی طرح کے خون خرابے کی نوبت نہیں ائی اور اہل شہر کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت اور مقابلہ کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور مکہ آسانی کے ساتھ فتح ہوگیا، شہر کے صرف ایک حصہ میں جہاں کچھ ہٹ دھرم قسم کے قریش رہتے تھے انھوں نے پیغمبر ﷺ کا مقابلہ کرنا چاہا جن میں سے کچھ لوگ مارے گئے۔[۲]

پیغمبر اکرم ﷺ نے مکہ میں داخل ہونے کے بعد اونٹ پر سوار ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور اس دوران آپ کے ہاتھ میں جو عصا تھا اس کے ذریعہ کعبہ کے چاروں طرف رکھے ہوئے بتوں کو گراتے رہے اور فرماتے رہے: (حق آگیا اور باطل چلا گیا بیشک باطل، تو نابود ہونے والا ہے)۔[۳]

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٤٢، ٤٤، ٤٦؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۸۱۹۔ ۸۱۷.

(۲)۱۵ سے ۲۸ افراد۔ (ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۵۰؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۸۲۵؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱۳٦.)

(۳)(جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقاً)، سورۂ اسرائ، آیت ۸۱.

اور اس کے بعد جیسا کہ مورخین اور محدثین کے درمیان مشہور ہے حضرت علی پیغمبر ﷺ کے حکم سے آپ کی دوش مبارک پر چڑھے اور وہ بڑا بت جو کعبہ کے اوپر تھا اس کو نیچے گرادیا اور وہ زمین پر گرتے ہی چکنا چور ہوگیا۔[1]

علامہ امینی نے اس واقعہ کو اہل سنت کے ٤١ محدثین سے نقل کیا ہے (الغدیر، ج٧، ص ١٢١، تذکرۃ الخواص، اور بحار اور دوسری کتابوں میں منقول کچھ روایات کے مطابق) یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کسی سال میں رونما ہوا ہے اور شب میں قریش کی نظروں سے دور انجام پایا ہے اور اس بات کا احتمال پایا جاتا ہے کہ واقعہ دو طرح سے رونما ہوا ہے۔ پیغمبر اسلا ﷺ م کے شانے پر علی کے سوار ہونے کا واقعہ قدیم زمانے سے متعدد شعراء کے اشعار میں بیان ہوا ہے ان میں سے ابن العرندس حلی نویں صدی ہجری کے شاعر نے ایک بہترین قصیدہ کے ضمن میں کہا ہے: و صعود غارب احمد فضل لہ دون القربۃ و الصحابہ افضلا (الغدیر، ج٧، ص ٨) یعنی علی کا احمد ﷺ کے شانے پر سوار ہونا ایک ایسی بڑی فضیلت ہے اور ان کے لئے یہ فضیلت قرابتداری اور صحابی ہونے کے علاوہ ہے۔ اسی طرح ابن ابی الحدید نے اپنے "سبع علویات" قصائد میں سے ایک قصیدے میں جو کہ فتح مکہ کے موقع کا ہے، کہا ہے کہ:

رغبت بأسمیٰ غارب احدقت بہ

ملائک یتلون الکتاب المسطرا

بغارب خیر المرسلین و اشرف الأ

نام و ازکیٰ فاعل و طیء الثّریٰ

"قرآن کی تلاوت کرنے والے ملائکہ جس بلندترین دوش مبارک کا احاطہ کئے ہوئے تھے اس پر آپ سوار ہوئے، جو اس دنیا میں سب سے بہترین ذات گرامی رسولوں میں سب سے بہتر لوگوں میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس جس نے اس زمین پر قدم رکھا "(دکتر محمد ابراہیم آیتی بیرجندی، تاریخ پیامبر اسلام، انتشارات دانشگاہ تہران، ص ٥٣٠- ٥٢٩).

---

(١) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ٥٩؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ٨٣٢؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ١٣٦؛ اسی طرح رجوع کریں، طوسی، امالی (قم: دار الثقافہ، ١٤١٤ھ)، ص ٣٣٦؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دارالمعرفہ)، ج٣، ص ٣٠؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ (بیروت: دار المعرفہ، ط١، ١٤١٦ھ)، ج١، ص ٣٢٢؛ علی بن موسی بن طاووس، الطرائف فی معرفۃ مذاہب الطوائف (قم: مطبعۃ الخیام)، ج١، ص ٨١- ٨٠؛ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب (قم: المطبعۃ العلمیہ)، ج٢، ص ١٣٦- ١٣٥؛ جار اللہ زمخشری، تفسیر کشاف، مکتبہ مصطفی البابی الحلبی، ج٢، ص ٢٤٤.

امام جعفر صادق سے منقول روایت کے مطابق حضرت علی نے جس بت کو توڑا تھا اس کا نام "ہبل" تھا جس کو پیغمبر کے حکم سے باب بنی شیبہ پیندفن کردیا جو مسجد الحرام کا ایک دروازہ ہے تاکہ لوگ مسجد الحرام میں داخل ہوتے وقت اس کے اوپر سے گزر کر جائیں اور اسی بنا پر اس دروازے سے مسجد الحرام میں داخل ہونا مستحب قرار پایا ہے۔(۱)

پیغمبر اسلا ﷺ م کی طرف سے عام معافی کا اعلان

اگرچہ قریش اور مشرکین مکہ نے آغاز اسلام سے لیکر اب تک مسلمانوں کی دشمنی، مخالفت اور ان پر دباؤ اور ظلم اور تشدد میں کسی قسم کی فروگزاشت نہیں کی تھی اور اس دن پیغمبر ﷺ کے پاس ہر قسم کا انتقام لینے کی قوت اور طاقت تھی اس کے باوجود آپ نے چند لوگوں کے علاوہ کہ جنھوں نے کچھ زیادہ ہی بڑے جرائم کا ارتکاب کیا تھا،(۲) بقیہ سب لوگوں کو عام معافی دینے کا اعلان کردیا اور فرمایا:

میں اپنے بھائی یوسف کی بات ہی کہوں گا کہ آج تمہارے اوپر کوئی سرزنش نہیں ہے خدا تمہیں معاف کرے اور وہ ارحم الراحمین، سب سے زیادہ مہربان ہے(۳) جاؤ تم لوگ جاؤ، تم لوگ آزاد شدہ ہو۔(٤)

---

(۱) حر عاملی، وسایل الشیعہ (بیروت: دار احیاء التراث الاسلامی)، ج ۹، ص ۳۲۳، ابواب مقدمات الطواف، باب استحباب دخول المسجد الحرام من باب بنی شیبہ، حدیث ۱.

(۲) مورخین نے ان کی تعداد آٹھ سے دس تک لکھی ہے (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، ج ٤، ص ٥٣ - ٥١؛ المغازی واقدی، ج ۲، ص ۸۲٥، طبقات الکبریٰ ابن سعد، ج ۲، ص ۱۳٦، البتہ ان میں سے کچھ لوگوں کو معاف کردیا گیا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔

(۳) "لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم و ھو ارحم الراحمین" سورۂ یوسف، آیت ۹۲.

(٤) حلبی، السیرۃ الحلبیہ (انسان العیون)، ج ۳، ص ٤۹؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ، ج ۲، ص ۹۸.

قریش جو ذلت کے ساتھ تسلیم ہوئے تھے اور انھیں حضرت کی طرف سے سخت انتقامی کاروائی کا خدشہ تھا آپ کی اس شرافتمندانہ اور کریمانہ عفو و بخشش سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ رسول خدا نے خانۂ کعبہ کے پاس لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

خداوندعالم نے اول تخلیق سے مکہ کو محترم اور مقدس قرار دیا ہے یہ شہر روز قیامت تک حرم اور مقدس سرزمین ہے کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ اس سرزمین پر خون ریزی کرے اس کا درخت کاٹے، اس شہر کی حرمت مجھ سے پہلے کسی شخص پر حلال نہیں ہوئی اور نہ میرے بعد کسی پر حلال ہوگی اور میرے لئے بھی صرف اسی وقت (یہاں کے لوگوں پر غصہ کی وجہ سے) حلال ہوئی ہے اور اس کے بعد اس کی وہی صورت حال رہے گی یہ بات حاضرین، غائبین تک پہونچادیں۔[۱]

پیغمبر اسلا ﷺ م نے فتح مکہ کے بعد وہاں کی مسلمان عورتوں سے یہ عہد لیا کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں، چوری نہ کریں، زنا نہ کریں، اپنے بچوں کو قتل نہ کریں، اپنے ناجائز بچوں کو بہتان اور حیلے کے ذریعہ اپنے شوہروں کے سر نہ تھوپیں اور نیک کاموں میں پیغمبر ﷺ کی نافرمانی نہ کریں۔[۲]

بعض شہرت یافتہ لوگوں نے جو بعد میں بہت ہی مشہور ہوئے اور کسی عہدے یا مقام تک

---

(۱)ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ٥٨؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج٢، ص ٥٠؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج ٢، ص ٨٤٤؛ الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ۔

(۲) سید محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج١٩، ص ٢٤٦۔ یہ عہدنامہ سورۂ ممتحنہ کی آیت نمبر١٠ "یا ایہا النبی اذا جاء ک المؤمنات یبایعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئاً و لایسرقن و لایزنین و لایقتلن اولادہن و لایأتین ببھتان یفترینہ بین أیدیہن و أرجلہن و لایعصینک فی معروف فبایعہن و استغفر لہن اللہ ان اللہ غفور رحیم" کے نازل ہونے کے بعد انجام پایا، اس کو بیعۃ النساء بھی کہا جاتا ہے۔

پہونچے انھوں نے بھی فتح مکہ میں اسلام کا اظہار کیا، جس میں ابوسفیان[۱] اور اس کا بیٹا معاویہ[۲] بھی شامل تھا۔

فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے سخت اور دشوار گزار حالات کی بنا پر اور فتح مکہ کے بعد اس کی جگہ، امن و سکون اور اطمینان کا ماحول پیدا ہو جانے کی وجہ سے پروردگار عالم نے فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو جانے والے افراد کو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے لوگوں سے بہتر اور با عظمت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم راہ خدا میں انفاق نہیں کرتے ہو جب کہ آسمان اور زمین کی میراث کا تعلق خدا سے ہے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے انفاق اور جہاد کیا ان کا درجہ یقینا ان لوگوں سے زیادہ افضل ہے جنھوں نے بعد میں انفاق اور قتال کیا ہے خدا کا ہر وعدہ نیک ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو پروردگار اس سے بخوبی واقف ہے۔[۳]

فتح مکہ کے آثار اور نتائج

چونکہ مکہ مشرکین بلکہ اسلام مخالف تمام طاقتوں کا سب سے اہم اڈا اور سب سے مضبوط قلعہ اور مورچہ تھا اور مخالفین اسلام کی اصل حمایت اور پشت پناہی یہیں سے ہوتی تھی اور اسی کی بنا پر ان کے حوصلے بلند رہتے تھے۔ اس بنا پر اس شہر کی پسپائی اور اس شہر پر مسلمانوں کا قبضہ تاریخ اسلام میں ایک اہم

---

(۱) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۱۳۵؛ ابن اثیر، اسد الغابہ (تہران: المکتبۃ الاسلامیہ، ۱۳۳٦)، ج ٤، ص ۳۸۵ و ج ۵، ص ۲۱٦؛ ابن عبد البر، الاستیعاب (در حاشیہ الاصابۃ) ج ۲، ص ۸۵.

(۲) ابن اثیر، گزشتہ حوالہ، ج ٤، ص ۳۸۵؛ زینی دحلان، گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۹٦.

(۳) "وما لکم ان لا تنفقوا فی سبیل اللّٰہ و للّٰہ میراث السمٰوات والارض لایستو منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولٰئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلًّا و عد اللّٰہ الحسنی واللّٰہ بما تعملون خبیر" سورۂ حدید، آیت ۱۰.

باب ہے جس کے بعد یہ بالکل مسلم ہوگیا کہ اب یہاں بت پرستی کا کوئی وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف عرب کے دوسرے قبیلے بھی فتح مکہ اور قریش جیسے بڑے قبیلے کے اسلام لانے کے منتظر تھے اور جس وقت مکہ فتح ہوا اور قریش مسلمان ہوگئے تو ہر طرف سے تمام قبائل کے نمائندے یکے بعد دیگرے دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے[1] صرف دو قبیلوں، ہوازن اور ثقیف کے علاوہ تمام عرب قبائل نے اسلام کے مقابلے میں اطاعت کا اظہار کیا،[2] جن میں مندرجہ ذیل قبیلوں کے نمائندے شامل تھے:

قشیر بن کعب،[3] باھلہ،[4] ثعلبیہ،[5] صُدا،[6] بنی اسد،[7] بلّی،[8] عذرۃ،[9] ثمالہ،[10] اور حدّان[11]، ان سب نمائندوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر آپ کی اطاعت کا اعلان کردیا۔

---

(۱) شہاب الدین احمد نویری، نہایۃ الارب فی فنون الادب، ترجمۂ محمود مہدی دامغانی، (تہران: امیر کبیر، ۱۳۶۵) ج ۳، ص ۱۱.

(۲) حلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۳، ص ۶۱.

(۳) ابن سعد، طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج ۱، ص ۳۰۳.

(٤) گزشتہ حوالہ، ص ۳۰۷.

(٥) گزشتہ حوالہ، ص ۲۹۸؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ص ۳۷.

(٦) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۲۶.

(۷) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۲۹۲؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ۳۸.

(۸) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۰؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ۸۹.

(۹) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۳۱؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ۸۳.

(۱۰) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۳۵۲؛ نویری، گزشتہ حوالہ، ۱۰۳.

(۱۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ.

جنگ حنین (ھوازن) اور جنگ طائف کے بعد جو فتح مکہ کے بعد ہوئیں ، قبیلۂ ثقیف، جس کی حیثیت طائف میں وہی تھی جو مکہ میں قبیلۂ قریش کو حاصل تھی اس طاقتور قبیلے کے نمائندے بھی رسول اللہ کی خدمت میں پہونچے اور اسلام قبول کرنے کے لئے آپ کے سامنے کچھ شرائط رکھے لیکن آپ نے ان میں سے کوئی ایک شرط بھی قبول نہیں کی جس کے بعد وہ لوگ کسی شرط کے بغیر اسلام لے آئے[1] جو اسلام کی پیش رفت کے لئے ایک بڑی کامیابی تھی۔

جنگ حنین *

پیغمبر اسلا ﷺ م فتح مکہ کے بعد (جو بیس رمضان المبارک[2] کو حاصل ہوئی) دو ہفتہ تک اسی شہر میں قیام پذیر رہے۔[3] اور اس شہر کی صورت حال اور حالات کو درست کیا اور اپنے منادی کے ذریعے یہ اعلان کرایا کہ جس شخص کے گھر میں بھی کوئی بت ہو وہ اس کو توڑ دے۔[4] اس کے علاوہ آپ نے کچھ لوگوں کو مکہ اور اس کے اطراف کے بتوں اور بتکدوں کو توڑنے کے لئے مامور کیا۔[5]

---

(۱) واقدی، المغازی، ج ۱، ص ۹٦٦.

* ذو المجاز کے قریب ایک درہ جس کا نام حنین تھا۔ یا طائف کے قریب ایک پانی کی جگہ جس کا فاصلہ مکہ تک تین رات تک کا تھا۔ (المواهب اللدنیه، ج ۱، ص ۳۲۸.)

(۲) واقدی، المغازی، تحقیق مارسدن جونس (بیروت: مؤسسة الأعلی للمطبوعات)، ج ۳، ص ۸۸۹؛ طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج ۳، ص ۱۲۵.

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، طبری، گزشتہ حوالہ؛ قسطلانی، المواهب اللدنیه بالمنح المحمدیه (بیروت: دار الکتب العلمیه، ط ۱، ۱٤۱٦ھ) ج ۱، ص ۲۲٦.

(٤) ابن واضح، تاریخ، یعقوبی، (نجف: المکتبة الحیدریه، ۱۳۸٤ھ.)، ج ۲، ص ۵۰.

(۵) قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۷؛ نویری، نهایة الارب فی فنون الادب، ترجمہ محمود مهدوی دامغانی (تہران: امیر کبیر، ط ۱، ۱۳٦۵) ج ۲، ص ۲۸۱۔ ۲۸۰؛ ابن سعد، طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ص ۱٤۷۔ ۱٤۵۔

اسی دوران رسول خدا کو یہ اطلاع دی گئی کہ قبیلہ ہوازن، قبائل ثقیف، نصر، جشم، سعد بن بکر اور قبیلۂ بنی ہلال کے ایک گروہ کی پشت پناہی میں، مالک بن عوف نصری کی سرکردگی میں مکہ کے اوپر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں،[۱] جب تحقیق کی گئی تو یہ اطلاع بالکل صحیح نکلی کہ مذکورہ بالا قبائل پر مشتمل ایک بڑی فوج مکہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے اوطاس نامی سرزمین پر پڑاؤ ڈال چکی ہے۔ رسول خدا نے مزید تحقیق کے لئے اپنے ایک آدمی کو بھیجا اس نے خفیہ تحقیق کی جس کے نتیجے میں مکہ کی طرف ہوازن کی فوج کی پیش رفت مسلم ہوگئی۔[۲]

اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ نے یہ فیصلہ کیا کہ فوجی حکمت عملی کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ ترکیب اپنائی جائے کہ دشمن کو حملے کا موقع ہی نہ ملے اسی لئے آپ نے بڑی سرعت کے ساتھ عتاب بن اسید کو مکہ کا حکمراں قرار دیا[۳] اور بارہ ہزار کی فوج (جن میں دس ہزار آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے اور دو ہزار مکہ میں تازہ مسلمان ہونے والے شامل تھے)،[٤] لیکر دشمن کی فوج کی طرف چل پڑے اور قبیلۂ بنی سلیم کو اپنی فوج کا مقدمۃ الجیش قرار دیا۔[٥] راستے میں مسلمانوں کی فوج کی کثرت کو دیکھ کر بعض مسلمانوں کو غرور ہو رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے کہ اب ہم فوج کی قلت کی بنا پر نہیں ہاریں گے[٦]۔ لیکن عملاً بات اس کے برعکس ثابت ہوئی چنانچہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں اس امر کی صاف یاددہانی کرائی ہے[۷] کہ اس جنگ میں افراد کی کثرت اور فوجیوں کی زیادتی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

---

(۱) ابن ہشام، سیرۃ النبویہ (قاہرہ: مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی)، ج٤، ص ٨٠؛ تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج٣، ص ١٢٦.

(۲) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ٨٢؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج٢، ص ١٢٧؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ج٣، ص ٨٩٣۔

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٨٨٩؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ١٢٧.

(٤) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ٨٣؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ١٢٧؛ ابن سعد طبقات الکبریٰ (بیروت: دار صادر)، ج٢، ص ١٥٠؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ط ٣، المکتبۃ الاسلامیہ، ص ١١٣؛ ابن واضح، ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج٢، ص ٥٢

(٥) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٨٩٣؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ١٥٠.

(٦) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ٨٨٩؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ١٥٠؛ طبرسی، گزشتہ حوالہ، ص ١١٣؛ شیخ مفید، الارشاد (قم: مکتبۃ بصیرتی)، ص ٧٤.

(۷) سورۂ توبہ، آیت ٩.

آغاز جنگ میں مسلمانوں کی شکست اور عقب نشینی

اسلامی فوج صبح کی تاریکی میں وادی حنین پہونچی، وادی حنین میں پہنچتے ہی ہوازن کے جنگجو اور سپاہی جو پہلے ہی پتھروں کے پیچھے شگافوں اور درّو ںکے اندر چھپے ہوئے تھے اور وہاں سے مورچے سنبھال رکھے تھے انھوں نے اچانک مسلمانوں پر دھاوا بول دیا،[1] دشمن کا اچانک یہ حملہ اتنا کاری تھا کہ مسلمان بالکل وحشت زدہ ہوکر رہ گئے۔ پہلے قبیلۂ بنی سلیم نے جو مقدمۃ الجیش تھا عقب نشینی اور راہ فرار اختیار کی،[2] اس کے بعد دوسرے لوگ بھی فرار کرنے لگے۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ صرف حضرت علی دوسرے چند لوگوں کے ساتھ رسول خدا کے پاس باقی رہ گئے اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا[3] شیخ مفید کی نقل کے مطابق صرف بنی ہاشم سے نو افراد رسول خدا کے پاس باقی رہ گئے تھے جن میں ایک حضرت علی تھے، عباس بن مطلب آپ کے چچا آپ کے دائیں طرف اور فضل بن عباس رسول خدا کے بائیں طرف تھے اور حضرت علی آپ کے روبرو تلوار سے جہاد کر رہے تھے۔[4]

مسلمانوں کی عالیشان فتح

اتنے مسلمانوں کے فرار کر جانے کے باوجود پیغمبر اسلا ﷺ م صبر و استقامت، شجاعت اور بہادری کا بہترین نمونہ تھے چنانچہ آپ کے اندر کسی قسم کا ضعف و تزلزل یا گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی اور آپ سکون اور اطمینان کے ساتھ میدان جنگ میں ڈٹے رہے اور فرار ہونے والوں سے فرمایا: اے لوگو! تم لوگ

---

(۱) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۸۵؛ واقدی، گزشتہ، ص ۸۹۵؛ طبری، گزشتہ، ص ۱۲۸؛ طبرسی، اعلام الوریٰ، ص ۱۱٤؛ مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸٤ھ) ج ۲۱، ص ۱۶۹؛ شیخ مفید، گزشتہ، ص ۷۵۔

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۸۹۷؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۵۰.

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۰۰؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۵۲.

(٤) الارشاد، ص ۷٤، اس جنگ میں حضرت علی کی شجاعت کے متعلق، رجوع کریں: امالی، شیخ طوسی (قم: دار الثقافہ، ط ۱، ۱٤۱٤ھ)، ص ۵۷۵۔ ۵۷٤.

کہاں بھاگ رہے ہو؟ واپس آؤ کہ میں پیغمبر خدا محمد بن عبد اللہ ہوں اور اپنے چچا جناب عباس (جو اس وقت آپ کے ساتھ میدان جنگ میں بنی ہاشم کے بچے افراد میں سے تھے اور بلند آواز رکھتے تھے) سے فرمایا کہ لوگوں کو آواز دو اور پکارو اور انھوں نے مجھ سے جو عہد و پیمان اور بیعت کی ہے اس کو انھیں یاد دلاؤ، جناب عباس نے ان لوگوں کو بلند آواز سے پکار کر کہا: "اے اہل بیعت شجرہ! اے اصحاب سورہ بقرہ! تم کہاں فرار کر رہے ہو؟ تم نے پیغمبر اکرم ﷺ سے جو عہد اور پیمان کیا تھا اس کو یاد کرو"[1]

پیغمبر ﷺ کی استقامت آپ کی ثابت قدمی اور پائیداری نیز مسلمانوں کو بار بار واپسی کی دعوت دینے کا یہ اثر ہوا کہ بھاگ جانے والے مسلمان آہستہ آہستہ واپس پلٹنا شروع ہوئے اور رسول خدا کے پرچم تلے دوبارہ دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گئے، کچھ دیر نہ گزری تھی کہ دشمن کی فوج کا سپہ سالار اور علمبردار حضرت علی کے ہاتھوں مارا گیا[2] اور خداوند متعال کی غیبی امداد[3] کے ذریعہ ہوازن کی فوج کو بہت سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور چار ہزار اسیر، بارہ ہزار اونٹ اور بہت زیادہ مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔[4] جنگ کے اختتام پر جن قبائل کے سردار مسلمان ہوگئے تھے ان کی خواہش اور درخواست کی بنا پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے اسیروں کو آزاد کردیا۔[5] اس جنگ کے شہداء کی تعداد چار افراد ذکر ہوئی ہے۔[6]

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ۱۵۱؛ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۵۲؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۱۵۰۔

(۲) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۵۲۔

(۳) سورۂ توبہ، آیت ۲۶۔

(۴) طبرسی، اعلام الوریٰ، ج۲، ص ۱۱۶، کے مطابق اسیروں کی تعداد اور مال غنیمت کی مقدار چھ ہزار اسیر اور چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ گوسفند اور چار ہزار چاندی، (طبقات الکبریٰ، (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص ۱۵۲.)

(۵) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۵۵ ۔ ۱۵۳؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۲ اور ۱۳۵۔

(۶) ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱۰۱؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص ۱۵۲؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۲۲۹؛ ابن واضح، گزشتہ حوالہ، ص ۵۲؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ص ۱۳۲۔

خداوند عالم نے اس جنگ میں مسلمانوں کی ابتدائی شکست اور آخر میں امداد غیبی کے سہارے ان کی بہترین کامیابی کا تذکرہ اس طرح فرمایا ہے:

"پروردگار عالم نے بہت سارے مواقع پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی کہ جب تمہاری کثرت نے تم کو غرور میں بتلا کردیا تھا لیکن تم سے اس نے کوئی خطرہ دور نہیں کیا اور زمین اپنی تمام وسعتوں سمیت تمہارے اوپر تنگ ہوگئی اور تم دشمن کو پیٹھ دکھا کر فرار کر گئے"[(۱)] تب پروردگار عالم نے اپنے رسول اور مومنین کے اوپر اپنا سکون نازل کیا اور ایسے لشکر نازل کئے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا تھا ان پر عذاب نازل کیا اور کافرین کی سزا یہی تھی"۔

جنگ تبوک*

جنگ موتہ کے اسباب اور عوامل پر غور اور فکر کے درمیان ہم اس سے واقف ہوچکے ہیں کہ شہنشاہ روم کو اس تازہ اور جدید اسلامی حکومت سے کس قدر دشمنی تھی اور آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ رومی فوج سے مسلمانوں کی فوج کی پہلی مڈبھیڑ میں مسلمانوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا، اس زمانے میں روم اور

---

(۱) سورۂ توبہ، آیت ۲۶۔ ۲۵۔

* تبوک مدینہ اور دمشق کے بالکل درمیان ایک مشہور و معروف جگہ ہے (قسطلانی، المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۱۶ھ.ق)، ج ۱، ص ۳۴۶؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ (بیروت: دار المعرفہ، ج ۲، ص ۱۲۵) مدینہ سے اس کا فاصلہ نوے فرسخ ہے اور یہ مسافت بارہ (۱۲) رات میں طے ہوتی تھی۔ (مسعودی، التنبیہ والاشراف (قاہرہ: دار الصاوی للطبع والنشر، ص ۲۳۵) اور اس زمانہ میں جزیرہ نمائے عربستان کا سرحدی علاقہ تھا جو روم کی سرحد سے شام میں ملتا تھا آج تبوک سعودی عرب کا ایک شہر ہے جو اردن کی سرحد کے نزدیک ہے اور مدینہ سے اس کا فاصلہ تقریباً چھ سو کلو میٹر ہے۔

ایران دو بڑی طاقتیں تھیں اور ان میں آپس میں بہت طویل جنگیں بھی ہو چکی تھیں لیکن اس کے باوجود ان کو یہ ہرگز برداشت نہیں تھا کہ ان کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی تیسری طاقت سر ابھار سکے! اس لئے یہ فطری بات تھی کہ فتح مکہ میں مسلمانوں کی بے مثال کامیابی اور جنگ حنین میں ان کے ہاتھوں قبیلۂ ہوازن کی شکست ، رومیوں کے لئے (جو جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں شام کے علاقہ میں واقع تھا) ایک اچھی خبر نہ تھی، ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اور جنگ موتہ میں رومیوں کی کامیابی کو نظر میں رکھتے ہوئے شہنشاہ روم کی طرف سے فوجی نقل و حرکت ایک فطری بات تھی ۹ھ میں مدینہ اور شام کے درمیان تجارت کرنے والے قافلوں نے پیغمبر ﷺ کو یہ اطلاع دی کہ شہنشائے روم ہرقُل مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہے۔[۱]

حضرت ﷺ نے اس خبر کو سنجیدگی سے سنا اور اس سے مقابلہ کے لئے تیاریاں شروع کردیں کیونکہ شہنشاہ روم اپنی سیاسی اور فوجی قدرت اور طاقت اور مسلمانوں سے سابقہ دشمنی کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کا بدترین اور خطرناک ترین دشمن تصور کیا جاتا تھا۔[۲]

اطلاعات سے پتہ چلا تھا کہ ہرقل نے کچھ عرب قبائل جیسے لخم، جزام، عملہ اور غسان کو بھی اپنی اس نقل و حرکت میں اپنے ساتھ کر رکھا ہے اور اس کے لشکر کا مقدمۃ الجیش عنوان سے بلقاء نامی علاقہ تک پیش روی کر کے آگے بڑھ آیا تھا۔[۳] اور ہرقل نے خود حمص کے علاقہ میں پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔[٤]

---

(۱) واقدی، المغازی، تحقیق: مارسڈن جانس (بیروت: مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات)، ج۳، ص۹۹۰؛ ابن سعد، طبقات الکبری، (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص۱٦٥؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص ۳٤٦؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج۳، ص۹۹۔ یہ گزارش نبطی تاجروں کے ذریعے دی گئی تھی جو تیل اور سفید آٹا مدینہ لے جاتے تھے۔ (واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹۰۔ ۹۸۹۔

(۲)واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹۰۔

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ابن سعد، گزشتہ حوالہ۔

(٤)ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱٦٦۔

پیغمبر ﷺ تک یہ اطلاع اس وقت پہونچی جب گرمی اپنی شباب پر تھی،[۱] فصل کاٹنے اور پھلوں کے چنےّ کا زمانہ آچکا تھا لوگ بہت تنگی میں تھے اور اپنے گھروں اور کاروبار زندگی کو ترک کرنا ان کے لئے بہت دشوار تھا۔[۲] پیغمبر اسلا ﷺ م نے سب کی رضا کارانہ شرکت کا اعلان کردیا اور مکہ کے علاوہ عرب کے دوسرے بادیہ نشین قبیلوں سے مدد طلب کی اور مسلمانوں سے یہ خواہش بھی کی کہ جنگ کے وسائل او راخراجات پورا کرنے میں مدد کریں،[۳] اس سے پہلے حضرت ﷺ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ عام طور پر کسی بھی جنگ کے لئے نکلتے وقت اپنے مقصد اور اپنی منزل کا اعلان نہیں کرتے تھے لیکن اس بار آپ نے صاف طورپر یہ اعلان کردیا کہ ہماری منزل اور ہمارا مقصد تبوک ہے تاکہ لوگ اس طویل اور مشکل سفر کی زحمتوں کو نظر میں رکھ کر اس کے لئے تیاری کریں۔[٤]

ایسے نامناسب وقت اور حالات کے باوجود مسلمانوں نے بہت ہی اخلاص، لگن، انتہائی جوش اور جذبہ کے ساتھ آپ کی مدد کی۔[٥] تقریباً تیس ہزار[٦] کی فوج دس ہزار[٧] گھوڑوں، بارہ ہزار

---

(۱) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، قسطلانی، گزشتہ حوالہ؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، طبری، تاریخ الامم و الملوک (بیروت: دار القاموس الحدیث)، ج۳، ۱٤۲۔

(۲) واقدی، گزشتہ حوالہ، قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۹۲؛ طبری، گزشتہ حوالہ؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (قاہرہ: مکتبۃ مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۵۵ھ.ق)، ج٤، ۱٥۹۔

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۹۱۔ ۹۹۰؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ج۱، ص۳٤۷؛ حلبی، گزشتہ حوالہ؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص ۱٦۰؛ طبرسی، اعلان الوری، دار الکتب الاسلامیہ ص۱۲۲۔

(٤) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱٦٥ اور ۱٦۷؛ واقدی، گزشتہ حوالہ؛ قسطلانی، ص۳٤٦؛ طبرسی، گزشتہ حوالہ؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ص۱٥۹۔

(٥) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹۱؛ طبری، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۱٤۲۔

(٦) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱٦٦؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹٦ و ۱۰۰۲؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص۳٤۹؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۰۲

(۷) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۱۰۰۲؛ ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱٦٦۔

اونٹوں[1] کے ساتھ روانگی کے لئے تیار ہوگئی اس کے برخلاف منافقوں نے نہ صرف یہ کہ کسی عذر کے بغیر میدان جنگ کی طرف حرکت نہیں کی[2]، بلکہ انھوں نے دوسرے لوگوں کو بھی مختلف بہانوں، جیسے گرمی زیادہ ہے وغیرہ وغیرہ میدان میں جانے سے روک دیا۔[3] جن کی مذمت میں قرآن کی آیت بھی نازل ہوئی۔[4]

بعض مسلمان کسی معقول عذر کے بغیر، اسلامی لشکر کے ساتھ نہیں گئے ان کو قرآن کریم نے متخلفین (اپنی جگہ پر رہ جانے والا) قرار دے کر ان کی مذمت فرمائی ہے۔[5] کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو واقعاً جہاد میں جانے کا بے پناہ شوق تھا لیکن ان کے پاس جنگی سازو سامان نہیں تھا اس کی بنا پر وہ جنگ میں جانے سے محروم رہ گئے۔[6]

مدینہ میں حضرت علی کی جانشینی

مدینہ کے حالات بھی کچھ کم حساس نہ تھے جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلامی فوج کو بہت دور دراز علاقے کا سفر درپیش تھا اور دوسری طرف منافقین، اسلام کا اظہار کرنے کے باوجود، پیغمبر ﷺ کی ہمراہی سے سرپیچی کر چکے تھے اور عبد اللہ بن ابی جو منافقوں کا سرغنہ تھا اس نے کافی لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر رکھا تھا۔[7]

---

(۱) مسعودی، التنبیہ والاشراف (قاہرہ: دارالصاوی للطبع والنشر)، ص۲۳۵۔

(۲) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۶۶۔ ۱۶۵؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹۵۔

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۹۹۳؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص ۱۰٦؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص۳٤۲۔

(٤) سورۂ توبہ، آیت ۸۱۔

(۵) سورۂ توبہ، آیت ۸۱۔

(٦) سورۂ توبہ، آیت ۹۳۔ ۸۷۔

(۷) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۹۵؛ ابن ہشام، گزشتہ حوالہ، ج٤، ص ۱٦۲۔

نیز منافقین کے علاوہ مکہ کے شکست خوردہ دشمنان اسلام یا مکہ اور مدینہ کے اطراف میں بادیہ نشین قبیلوں کی طرف سے بھی فتنہ اور فساد کا امکان تھا اس بنا پر یہ ضروری تھا کہ پیغمبر ﷺ کی عدم موجودگی میں کوئی ایسا طاقت ور اور مضبوط شخص نئی اور تازہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالے اور کسی قسم کے فتنہ کا سر نہ ابھرنے دے کیونکہ بہت ممکن تھا کہ کچھ ناگوار حادثات پیش آجائیں، اسی بنا پر پیغمبر اسلا ﷺ م نے حضرت علی کو مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا اور فرمایا: "مدینہ کو سنبھالنے کے لئے یا میرا رہنا ضروری ہے یا تمہارا رہنا ضروری ہے"[۱]

مسعودی لکھتے ہیں: سب سے زیادہ مشہور قول یہی ہے کہ رسول خدا نے علی کو مدینہ میں اپنا جانشین اس لئے قرار دیا تاکہ جو لوگ پیغمبر ﷺ کے ساتھ سفر میں نہیں جارہے ہیں ان کی نگرانی کرتے رہیں اور انھیں قابو میں رکھیں۔[۲]

حضرت علی اس جنگ کے علاوہ تمام جنگوں میں پیغمبر اسلام کے ہمراہ[۳] اور آپ کے لشکر کے علمبردار رہ چکے تھے، [٤] اسی بنا پر منافقین نے یہ مشہور کردیا کہ رسول خدا نے حضرت علی کو مدینہ میں اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ آپ کو ان سے کوئی لگاؤ اور محبت نہیں رہ گئی ہے، یہ افواہ سننے کے بعد حضرت علی کو بہت ملال ہوا، آپ اسلحہ سجا کر منزل جرف* میں رسول خدا ﷺ کے پاس پہونچے اور منافقین

---

(۱) مفید، الارشاد (قم: مکتبہ بصیرتی)، ص۸۲؛ طبرسی، اعلام الوری، ص ۱۲۲۔

(۲) و الاشھر ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم استخلف علیاً علی المدینۃ لیکون مع من ذکرنا من المتخلفین۔ (التنبیہ و الاشرف۔ ص۲۳۶)۔

(۳) ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (حاشیہ الاصابہ میں)، ج۳، ص ۳٤؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص ۱۰٤؛ قسطلانی، المواہب اللدنیہ، ج ۱، ص۳٤۸۔

(٤) ابن عبد البر، گزشتہ حوالہ، ص ۲۷؛ جعفر مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، ۱٤۰۳ھ۔ق، ج٤، ص ۱۹٦۔ ۱۹۳.

*جرف، مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک محلہ تھا۔

کی افواہ کو آپ کی خدمت میں بیان کیا اور آپ کے سامنے اس بات کا شکوہ بھی کیا، رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "وہ لوگ جھوٹے ہیں میں نے تم کو اپنا جانشین قرار دیا ہے۔ تم واپس جاؤ اور میرے اہل او رعیال اور اپنے گھر والوں کے درمیان میرے جانشین رہو کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسی سے تھی فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہے"[1]۔

شیخ مفید کی روایت کے مطابق آپ نے یوں ارشاد فرمایا: "اے میرے بھائی! تم اپنی جگہ واپس پلٹ جاؤ؛ چونکہ مدینہ کا نظام میرے یا تمہارے بغیر نہیں چل سکتا، بیشک تم میرے اہل بیت، دار ہجرت اور میری قوم کے درمیان میرے خلیفہ ہو۔ کیا تم راضی نہیں ہو کہ ...[2]

ابن عبد البر قرطبی پانچویں صدی ہجری کے عالم اہل سنت تحریر کرتے ہیں کہ جنگ تبوک میں حضرت رسول خدا ﷺ نے حضرت علی کو مدینہ میں اپنے اہل خانہ کے درمیان اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ اور ان سے فرمایا تھا کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی..."[3]

بخاری اور مسلم کی نقل کے مطابق پیغمبر اسلا ﷺ م نے حضرت علی کے شکوہ کے بعد جناب موسیٰ کے بھائی، ہارون سے ان کی تشبیہ دی اور مذکورہ جملہ ارشاد فرمایا:[4]

---

(۱) افلا ترضی یا علی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسی الا انه لا نبی بعدی (ابن ہشام، السیرة النبویہ، ج٤، ص١٦٣؛ حلبی، السیرة الحلبیہ، ج٣، ص١٠٤.)

(۲) ارجع یا اخی الی مکانک، فان المدینة لاتصلح الا بی او بک، فانت خلیفتی فی اهل بیتی و دار هجرتی و قومی، اما ترضی... (الارشاد، ص٨٣)

(۳) خلفه رسول الله علی المدینه و علی عیاله بعده فی غزوة تبوک و قال له انت منی.. (الاستیعاب، ج٣، ص٣٤.)

(۴) صحیح بخاری، شرح و تحقیق: شیخ قاسم شماعی رفاعی، (بیروت: دار القلم، ط ١، ص١٤٠٧ھ.ق)، ج٦، ص٣٠٩؛ المغازی، باب ١٩٥، ح ٨٥٧؛ صحیح مسلم، بشرح النووی (بیروت: دار الفکر، ١٤٠١ھ.ق)، ج١٥،

ص ١٧٥؛ فضائل الصحابہ، فضائل علی بن ابی طالب۔ رسول اسلام ﷺ کی یہ حدیث منزلت، مذکور کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی آئی ہے: المواہب اللدنیہ، ج ١، ص٣٤٨؛ الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، (الاصابہ کے حاشیہ میں)، ج٣، ص٣٤؛ البدایہ والنہایہ، ج٥، ص٧ و ج٨، ص٧٧؛ مسند احمد، ج ١، ص١٧٩؛ کنز العمال، ح ١٤٢٤٢، ٣٢٨٨١، ٣٦٥٧٢؛ الجامع الصحیح، ترمذی، المناقب، باب ٢١، ح ٣٧٣٠؛ التنبیہ والاشراف، ص٢٣٥؛ الصواعق المحرقہ، ص ١٢١؛ الاصابہ، ج٢، ص٥٠٩، شمارۂ ٥٦٨٨؛ سیرۂ زینی دحلان، ج٢، ص١٢٦؛ مروج الذہب، ج٣، ص١٤؛ امالی شیخ طوسی، ص٥٩٩۔

رسول اکرم ﷺ کی یہ مشہور حدیث اور آپ کا یہ مشہور فرمان جو حدیث منزلت کے نام سے مشہور ہے یہ حضرت علی کی امامت اور جانشینی کی بہترین اور واضح دلیل ہے کیونکہ اگرچہ پیغمبر اسلا ﷺ م کا یہ فرمان صرف ایک خاص واقعہ یعنی سفر تبوک سے متعلق تھا لیکن اس میں مستثنی منقطع اس بات کی دلیل ہے کہ

بعض کتابوں کی نقل کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے اس سفر میں محمد بن سلمیٰ کو اور بعض دوسرے نقل کے مطابق سباع بن عرفطہ کو اپنا جانشین مدینہ میں مقرر کیا تھا۔ (رجوع کریں: ابن ہشام، سیرۃ النبویہ، ج٤، ص ١٦٢؛ السیرۃ الحلبیہ، ج٣، ص١٠٢؛

تاریخ الامم والملوک، ج٣، ص ١٤٣؛ طبقات الکبری، ج٢، ص١٦٥؛ المواہب اللدنیہ، ج١، ص ٣٤٨) لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ روایات کی کثرت اور تواتر کے باوجود علی کی جانشینی، کے متعلق جو شیعہ سنی کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں ان کی مخالف روایتوں کے اوپر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ابن عبد البر، پانچویں صدی کا بزرگ مورخ، رجال نویس اور فقیہ لکھتا ہے: حدیث "انت منی بمنزلۃ ہارون من موسی..." کو صحابہ کے ایک گروہ نے نقل کیا ہے۔ اور یہ حدیث صحیح ترین اور موثق ترین روایات میں سے ہے۔ اور اس کو سعد بن ابی وقاص، ابن عباس، ابو سعید خدری، ام سلمہ، اسماء بنت عمیس، جابر بن عبداللہ انصاری، اور بے شمار راویوں نے نقل کیا ہے کہ جن کے نام یہاں پر نقل کرنے سے بہت طویل فہرست بن جائے گی۔ (الاستیعاب، ج٣، ص٣٤)

حضرت علی صرف عہدۂ نبوت کے علاوہ دوسرے تمام عہدوں میں جس میں سے ایک پیغمبر ﷺ کی جانشینی بھی ہے جناب موسیٰ کے بھائی جناب ہارون کے مثل اور برابر ہیں۔[۱]

راستے کی دشواریاں

ان تمام زحمتوں اور مشکلات کے باوجود اسلامی فوج مدینہ سے کوچ کر گئی لیکن جیسا کہ پہلے سے ہی اس بات کا اندازہ لگایا جا رہا تھا مسلمانوں کو تبوک کے راستے میں چند وجوہ کی بنا پر مثلاً راستہ طولانی ہونے کی وجہ سے، سواریوں کی قلت (کہ ہر تین آدمیوں کے لئے ایک گھوڑا تھا) گرمی کی شدت، پانی کی کمی اور تشنگی جیسی بے پناہ مشکلات اور زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا اسی بنا پر تاریخ اسلام میں اس جنگ کو "غزوۃ العسرہ"[۲] یعنی مشکلات کی جنگ یا "جیش العسرۃ"[۳] یعنی زحمت اور مشکلات کے لشکر کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

---

(۱) اس واضح اور روشن بیان کے باجود علمائے اہل سنت کے درمیان حلبی شامی اور ابن تیمیہ نے تعصب کی بنا پر اس حدیث کی دلالت میں شک و شبہ ڈال دیا ہے۔ اس حدیث کی دلالت اور اس کے حوالوں اور تقریباً سو سے زیادہ طرق سے منقول اس حدیث کے بارے میں مزید آگاہی کے لئے، کتاب الغدیر، ج۳، ص ۲۰۱۔ ۱۹۷؛ احقاق الحق، ج۵، ص ۲۳۴۔ ۱۳۳ و کتاب پیشوائی از نظر اسلام، تالیف استاد آیت اللہ جعفر سبحانی (انتشارات مکتب اسلام، ۱۳۷۴ش)، پندرہویں فصل میں مراجعہ فرمائیں۔

(۲) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۲، ص۱۶۷؛ قسطلانی، المواہب اللدنیہ، ج۱، ص۳۴۶؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۱۰۶

(۳) صحیح بخاری، ج۶، ص۳۰۸؛ مسعودی، التنبیہ والاشراف، ص۲۳۵؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص۳۴۶۔ یہ نام اور عنوان، سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۷ "لقد تاب اللہ علی النبی والمهاجرین والانصار الذین اتبعوه فی ساعة العسرة..." سے لیا گیا ہے۔

بہرحال اسلامی فوج اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد سرزمین تبوک پہنچی، لیکن وہاں رومی فوج کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا. بعد میں معلوم ہوا کہ رومی فوج کی نقل و حرکت کی خبریں سب بے بنیاد تھیں۔[۱] اور یہ افواہ صرف مسلمانوں کے اندر رعب اور اضطراب پیدا کرنے کے لئے پھیلائی گئی تھی۔[۲]

اس علاقہ کے سرداروں سے پیغمبر ﷺ کے معاہدے

رسول خدا ﷺ نے بیس دن تک تبوک میں قیام فرمایا[۳] اور اس مدت میں "ایلہ" کے حاکم اور سرزمین "جربائ" اور "اذرخ" کے لوگوں سے صلح کا معاہدہ ہوا اور انھوں نے جزیہ ادا کرنے کا عہد کیا اس کے علاوہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ایک مختصر فوجی نقل اور حرکت کے ذریعہ دومۃ الجندل کے مقتدر بادشاہ کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط کئے اور وہ بھی جزیہ اور ٹیکس دے کر آپ کے سامنے تسلیم ہوگیا۔[٤]

غزوہ تبوک رجب ۹ھ میں پیش آیا۔[٥] جس کے کچھ مناظر سورۂ توبہ میں منعکس ہوئے ہیں خاص طور سے اس میں وہ دشواریاں مشکلات اور فوج کے کوچ کرنے سے پہلے یا اس کے بعد بعض مسلمانوں کی سستی، کاہلی، اور منافقین کی خیانت اور گڑبڑیاں شامل ہیں۔ مسجد ضرار کا مشہور واقعہ بھی غزوۂ تبوک کے ساتھ ہی پیش آیا جس کا ذکر سورۂ توبہ کی ۱۰۷ ویں آیت میں ہوا ہے۔

---

(۱) واقدی، المغازی، ج۳، ص ۱۱۹۱۔ ۱۹۹۰۔

(۲) حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۹۔

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص ۱٦٦، ۱٦۸؛ واقدی، گزشتہ حوالہ، ص ۱۰۱٥۔

(٤) طبرسی، اعلام الوری، ص ۱۲۳؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص ۳٥۰؛ طبری، تاریخ الامم والملوک، ج۳، ص ۱٤٦۔

(٥) ابن سعد، طبقات الکبری، ج۲، ص ۱٦٥؛ ابنہشام، سیرۃ النبویہ، ج٤، ص ۱٥۹؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص ۹۹؛ قسطلانی، گزشتہ حوالہ، ص ۳٤٦۔

غزوۂ تبوک کے آثار اور نتائج

اگرچہ اس رنج و مشکلات بھرے سفر میں کوئی جنگ نہ ہوئی لیکن اس کے بہت ہی مفید نتائج سامنے آئے جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس سفر میں حجاز اور شام کے سرحدی علاقوں کے قبائل اور سرداران قوم سے صلح کا معاہدہ کر کے ان علاقوں کی امنیت کو یقینی کردیا اور آپ کو یہ اطمینان ہوگیا کہ اب یہ لوگ قیصر روم سے ساز باز نہیں کریں گے۔

۲۔ آپ کی اس فوجی نقل و حرکت سے اسلامی فوج کے سپہ سالار اس علاقے کی مشکلات راہ و روش اور پانی کے ذخائر سے اچھی طرح واقف ہوگئے اور انھوں نے اس زمانے کی بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں لشکر کشی کا طریقہ بھی سیکھ لیا۔یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کی وفات کے بعد مسلمانوں نے سب سے پہلے سرزمین شام کو ہی فتح کیا۔

۳۔ اس عمومی رضا کارانہ مشن میں مومن اور منافق کی باقاعدہ پہچان ہوگئی اور مسلمانوں کی صفوں میں ایک طرح کا تصفیہ ہوگیا اور کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوگئی۔[۱]

٤۔ اسلامی فوج کے اندر اعتماد نفس پیدا ہوا اور ان کا اعتبار بڑھ گیا اور دوسرے عرب قبائل بھی اسلام کی طرف مائل ہوگئے اور ان کے نمائندے بھی پیغمبر اسلا ﷺ م کی اطاعت اور پیروی کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ بھی اس فوجی نقل و حرکت کا ایک بہترین اور اہم نتیجہ ہے جس کی وضاحت ہم مندرجہ ذیل سطروں میں پیش کر رہے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا نفوذ اور اس کا پھیلاؤ

جس طرح کہ فتح مکہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے نفوذ اور اس کی وسعت کا اہم ترین موڑ تھا اسی طرح جنگ تبوک بھی اس راستے میں دوسرا اہم قدم تھا۔ کیونکہ یہ نقل و حرکت جو در حقیقت ایک بڑی

---

(۱) جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، (قم: انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، ط۵، ۱۳۶۸)، ج۲، ص ٤۰٤۔ ٤۰۳۔

فوجی مشق کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے مسلمانوں کی فوجی قوت اور طاقت کے اعتماد میں اضافہ ہوا اور سب نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام کی فوجی طاقت اس منزل تک پہونچ چکی ہے کہ جو دور دراز علاقوں میں پہونچ کر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرلے سکتی ہے۔ اس فوجی نقل و حرکت کا سیاسی، فوجی اور نظامی اثر اتنا زیادہ تھا کہ پیغمبر اسلا ﷺ م کے واپس مدینہ پہونچ جانے کے بعد بہت سے قبیلوں کے وہ سردار جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے انھوں نے بھی سمجھ لیا کہ اب شرک اور بت پرستی کے خاتمہ کا دور آپہونچا ہے۔ چنانچہ وہ بھی مدینہ آئے اور پیغمبر اسلا ﷺ م کی اطاعت کا اعلان کردیا۔ اس سال جن قبیلوں کے نمائندے اور ان کے وفود پیغمبر اسلا ﷺ م کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ۹ ھ کو "سنة الوفود" یعنی قبیلوں کے وفد اور ان کے سفیروں کے آنے کا سال قرار دیا گیا ہے۔[۱]

مشرکین سے برائت کا اعلان

فتح مکہ کے بعد توحید کے پھلنے پھولنے اور شرک اور بت پرستی کے جڑ سے خاتمے اور دوسرے خرافات اور باطل افکار و خیالات جن کی بنیاد بھی بت پرستی ہی تھی سب کے خاتمے کا بہترین ماحول پیدا ہوچکا تھا اور اکثر شہروں اور دیہاتوں میں لوگ بت پرستی سے دور ہو کر اسلام کے پرچم تلے آگئے تھے لیکن کچھ متعصب، نادان اور ہٹ دھرم اب بھی اپنے جاہلانہ رسم و رواج سے دست بردار نہیں تھے اور پیغمبر ﷺ کے اس نئے دین کو قبول کرنا ان کے لئے بہت ہی دشوار تھا۔

دوسری طرف اگرچہ رسول خدا ﷺ نے اس زمانہ تک چند بار عمرہ کیا تھا۔ لیکن آپ کو ابھی تک حج کرنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا اور مشرکین مکہ، حج کو اپنے اسی پرانے طور طریقے اور خرافات کے

---

(۱) ابن ہشام، سیرة النبویہ، ج٤، ص ۲۰۵۔ سیرت لکھنے والوں نے ان فہرستوں کو ثبت کیا ہے اور ان کی تعداد کو ٦۰ سے زیادہ لکھا ہے۔ رجوع کریں: طبقات الکبری، ج۱، ص ۲۹۱؛ تاریخ پیامبر اسلام، محمد ابراہیم آیتی، ص٦٤۲۔ ٦۰۹۔

ساتھ بجالاتے تھے اور تیسرے یہ کہ فتح مکہ کے بعد رسول خدا اور مشرکین کے درمیان دو طرح کے معاہدے ہوئے تھے:

۱۔ ایک عام معاہدہ یہ تھا کہ حج میں ہر ایک کی شرکت آزاد ہے اور کسی کو حج سے نہیں روکا جائے گا اور محترم مہینوں میں ہر ایک کے لئے امنیت قائم رہے گی اور کسی سے کوئی برا سلوک نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ دوسرا معاہدہ بعض عرب قبیلوں سے ایک معین مدت تک کیا گیا تھا۔[۱]

غزوہ تبوک کے بعد سورۂ برائت نازل ہوا اور پیغمبر ﷺ کو خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ آپ مشرکین مکہ سے بیزاری کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ ان معاہدوں کی ایک آخری مدت معین کردیں اور اس کے علاوہ ان آیتوں میں جو دوسرے دستور العمل آئے ہیں ان کو بھی نافذ اور لاگو کریں۔

سورہ برائت کی ابتدائی آیات کا ترجمہ یہ ہے:

مسلمانوں جن مشرکین سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا اب ان سے خدا اور رسول کی طرف سے مکمل بیزاری کا اعلان ہے۔ لہٰذا کافرو! چار مہینے تک آزادی سے زمین میں سیر کرو اور یہ یاد رکھو کہ خدا سے بچ کر نہیں جاسکتے ہو اور خدا کافروں کو ذلیل کرنے والا ہے۔ اور اللہ و رسول ﷺ کی طرف سے حج اکبر کے دن انسانوں کے لئے اعلان عام ہے کہ اللہ اور اس کے رسول دونوں مشرکین سے بیزار ہیں لہٰذا اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر انحراف کیا تو یاد رکھنا کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے ہو اور پیغمبر آپ کافروں کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے، علاوہ ان افراد کے جن سے تم مسلمانوں نے معاہدہ کر رکھا ہے اور انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور تمہارے خلاف ایک دوسرے کی مدد نہیں کی ہے تو چار مہینے کے بجائے جو مدت طے کی ہے اس وقت تک عہد کو پورا کرو کہ خدا تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو کفار کو جہاں پاؤ قتل کردو اور گرفت میں لے لو اور قید کردو اور ہر راستہ اور گزرگاہ پر ان کے لئے بیٹھ جاؤ اور راستہ تنگ کردو۔ پھر اگر توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو کہ خدا بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔[۲]

---

(۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص ۱۹۰۔

(۲) سورۂ برائت، آیت ۵۔ ۱۔

پیغمبر اکرم ﷺ کا مخصوص نمائندہ اور سفیر

ان آیات کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اسلام نے اس سورہٴ برائت کی ابتدائی آیتوں کی تعلیم حضرت ابوبکر کو دی اور ان کو یہ ذمہ داری سونپی کہ ان آیتوں کو عید قربان کے دن حاجیوں کے درمیان پڑھ کر سنائیں حضرت ابوبکر مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اسی دوران وحی الٰہی نازل ہوئی اور پیغمبر کو حکم دیا گیا کہ یہ پیغام یا آپ خود پہنچائیں یا وہ شخص پہنچائے جو آپ سے ہو۔(۱)

یہ حکم الٰہی نازل ہونے کے بعد آپ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ مکہ کی طرف روانہ ہو جائیں اور راستے میں ابوبکر سے آیتوں کو لے لیں اور پھر حاجیوں کے مجمع میں ان کو مشرکین سامنے پڑھ کر سنادیں۔ حضرت علی رسول اکرم ﷺ کے مخصوص اونٹ پر سوار ہو کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور پیغمبر اکرم ﷺ کا پیغام ابوبکر تک پہنچایا، انھوں نے آیتیں حضرت علی کے حوالے کردیں اور مایوس و دل ملول اور ناراض و غمگین ہو کر مدینہ واپس پلٹ آئے اور پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر یہ عرض کیا کہ "آپ نے مجھے اس کام کے لئے لائق اور شائستہ سمجھا لیکن کچھ وقت نہیں گزرا تھا کہ آپ نے مجھے اس عہدے سے معزول کردیا۔ کیا اس بارے میں خدا کا کوئی پیغام آیا ہے؟"

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "ہاں! خدا کا نمائندہ آیا ہے جس نے یہ کہا ہے کہ میرے علاوہ یا جو شخص مجھ سے ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص میں اس کام کی صلاحیت نہیں ہے"۔

اعلان برائت کا متن اور پیغمبر اکرم ﷺ کا اَلٹی میٹم

حضرت علی مکہ میں داخل ہوئے اور دس ذی الحجہ کو سورہٴ برائت کی ابتدائی آیات کو حاجیوں کے عام مجمع کے درمیان پڑھ کر سنایا،(۲) اور پیغمبر ﷺ کا درج ذیل شرح کے ساتھ الٹی میٹم تمام حاجیوں کے گوش گزار کردیا۔

---

(۱) "لایؤدیھا عنک الا انت او رجل منک"۔

(۲) یہ واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مندرجہ ذیل کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ تاریخ الامم والملوک، ج۳، ص۱۵٤؛ سیرۂ ابن ہشام، ج٤، ص۱۹۰؛ الکامل فی التاریخ، ج۲، ص۲۹۱؛ تفسیر مجمع البیان، ج۵، ص ۳؛ تذکرة الخواص، ص۵۷؛ البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۳۷ اور ۳۸ اور ج۷، ص۳۵۸؛ تفسیر روح المعانی، ج۱، تفسیر سورۂ توبہ؛ تفسیر المنار، ج۱۰، ص۱۵۷۔

۱۔ خدا اور پیغمبر اسلا ﷺ م مشرکین سے بیزار اور دور ہیں۔

۲۔ آئندہ سال کسی مشرک کو حج کرنے کا حق نہیں ہے۔

۳۔ کسی شخص کو برہنہ ہوکر طواف کعبے کرنے کی اجازت نہیں ہے۔[۱]

٤۔ مشرکین کو آج سے لے کر چار مہینے تک یہ مہلت ہے کہ وہ اپنی پناہ گاہ اور اپنی سرزمین کی طرف لوٹ جائیں اور چار مہینے کے بعد کسی مشرک کیلئے کوئی عہد و پیمان نہیں رہے گا مگر وہ لوگ جو رسول اللہ سے عہد و پیمان رکھتے ہیں، ان لوگوں کا معاہدہ اس کی معینہ مدت تک اپنی پرانی شکل و صورت پر باقی رہے گا۔

۵۔ کوئی کافر جنت میں نہیں جاسکتا۔[۲]

آپ کے اس الٹی میٹم اور اعلان برائت کے بعد جب تمام مشرکین اپنے وطن واپس گئے تو انھوں نے ایک دوسرے کی ملامت کرنا شروع کردی اور یہ کہا کہ جب قریش ہی مسلمان ہوگئے تو اب ہم کیا کریں چنانچہ وہ لوگ بھی مسلمان ہوگئے۔[۳]اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کرنے نہیں آیا کسی شخص نے برہنہ ہوکر خانہ ء کعبہ کا طواف نہیں کیا۔[٤]

---

(۱) برہنہ ہوکر طواف کرنا مشرکوں کی دینی پستی کا ایک نمونہ تھا اور یہ قریش کی انحصار طلبی کی بنا پر تھا ۔ اس سلسلے میں اس کتاب کے پہلے حصہ کی تیسری فصل میں "پریشان کن" دینی حالات کے بحث میں توضیح دی گئی ہے۔

(۲) پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ الٹی میٹم اختصاریا تفصیل کے ساتھ مندرجہ ذیل کتابوں میں نقل ہوا ہے:

سیرۂ ابن ہشام، ج٤، ص ۱۹۱؛ تفسیر المیزان، ج۹، ص ۱٦۳ اور ۱٦۵؛ تفسیر المنار، ج ۱۰، ص۱۵۷؛ البدایہ والنہایہ، ج۷، ص ۵۸؛ الغدیر، ج٦، ص۳٤۷ اور ۳٤۸۔

(۳)طبری، تاریخ الامم والملوک، ج۳، ص۱۵٤؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲، ص ۲۹۱.

(٤) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج٤، ص ۱۹۱؛ ابن اثیر، البدایہ والنہایہ، ج۵، ص ۳۷۔

نجران کے عیسائی نمائندوں کی انجمن سے پیغمبر ﷺ کا مباہلہ*

پیغمبر اسلام ﷺ جس طرح دنیا کے مختلف بادشاہوں اوراہل حکومت کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے خطوط لکھتے تھے اسی طرح آپ نے ایک خط اسقف نجران کے پاس بھی لکھا. اس خط میں آپ نے جناب ابراہیم و اسماعیل، اسحاق و یعقوب کے خدا کی حمد و ثنا کیساتھ اس سے (اور دوسرے عیسائیوں سے) یہ تقاضا اور خواہش کی کہ بندوں کی عبادت سے پرہیز کرتے ہوئے خداوند عالم کی اطاعت کریں. اور بندوں کی ولایت و بندگی سے نکل کر خدا کی بندگی کریں اور اس کی ولایت کے سامنے سر تسلیم خم کردیں یا ٹیکس ادا کرو۔ ورنہ جنگ کیلئے تیار رہیں(۱) بعض روایات کے مطابق پیغمبر اسلا ﷺ م نے سورۂ آل عمران کی ٦٤ ویں آیت(۲) کو بھی اپنے خط میں ذکر کیا تھا۔(۳)

---

* نجران یمن کا ایک علاقہ تھا جو مکہ کی سمت تھا۔ (یاقوت حموی، معجم البلدان (بیروت: داراحیاء التراث العربی، ج٥، ص٢٦٦)، عماد الدین ابوالفدائ (٧٣٢- ٦٧٢) لکھتے ہیں کہ "نجران ایک چھوٹا سا شہر ہے جو نخلستان سے بھراپڑا ہے، معتدل راستہ کے ذریعے مکہ سے نجران تک کا فاصلہ تقریباً بیس دن میں طے ہوتا ہے۔ (تقویم البلدان، عبد المحمد آیتی، انتشارات فرہنگ بنیاد ایران، ١٣٤١، ص ١٢٧۔) یہ شہرچند صدیوں کے بعد وسیع و عریض ہوگیا تھا؛ کیونکہ زینی دحلان (١٣٠٤- ١٢٣١ھ-ق)، لکھتے ہیں: کہ نجران ایک بڑا شہر ہے جو مکہ سے سات منزلوں پر ہے۔ یمن کی سمت جس میں ٧٣ قریہ ہیں، سعودی عرب کے موجودہ نقشہ کے مطابق نجران اسی ملک کا ایک شہر ہے۔ جو یمن کی سرحد کے پاس ہے۔

(١) ابن واضح، تاریخ یعقوبی (نجف: مکتبۃ الحیدریہ، ١٣٨٤ھ.ق)، ج٢، ص ٧١-٧٠؛ رجوع کریں: البدایہ والنہایہ (بیروت: مکتبۃ المعارف، ١٩٧٧ئ)، ج٥، ص٥٣؛ بحار الانوار، ج٢١، ص ٢٨٥؛ وثائق، محمد حمید اللہ، ترجمہ: ڈاکٹر محمود مہدوی دامغانی، ص٣٤؛ علی احمدی، مکاتیب الرسول، (ط٣، ١٣٦٣ش)، ج١، ص ١٧٥۔

(٢) "قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا الله و لانشرک به شیئاً ولایتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون۔"

(٣) سید بن طاووس، الاقبال بالاعمال الحسنه فیما یعمل مرة فی السنه، تحقیق: جواد الفیومی الاصفهانی (قم: مرکز انتشارات دفتر تبلیغات حوزۂ علمیہ قم، ط٢، ص١٣٧٧)، ج٢، ص٣١١۔

پیغمبر اسلا ﷺ م کا خط ملنے کے بعد نجران کے پادری نے بزرگان نجران او روہاں کی مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کیا تاکہ ان سے اس موضوع کے بارے میں گفتگو کرسکے، کیونکہ عیسائی علماء کے پاس بعثت پیغمبر کی قریب الوقوع علامتیں موجود تھیں، لہٰذا ان کی میٹنگ میں یہ طے پایا کہ ایک وفد مدینہ جائے جو قریب سے پیغمبر سے گفتگو کرے اور آپ کی نبوت کے دلائل کے بارے میں تحقیق کرے۔

نصارائے نجران کا یہ وفد جب مدینے پہونچا۔ تو اس میں اس وقت کی ان کی تینبڑی شخصیتیں بھی موجود تھیں جس میں خود اسقف (پاپ) بھی موجود تھا، پیغمبر اسلا ﷺ م نے ان سے گفتگو کر کے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی نیز ان کے سامنے قرآن مجید کی بعض آیتوں کی تلاوت بھی فرمائی۔ عیسائیوں نے کہا: ہم آپ سے پہلے ہی مسلمان تھے۔

حضرت نے فرمایا: تم لوگ جھوٹ کہتے ہو اسلام لانے سے تمہارے لئے تین چیزیں مانع ہیں (یعنی تم لوگوں کو تین چیزوں کی بنا پر مسلمان نہیں کہا جاسکتا) تم لوگ صلیب کی عبادت کرتے ہو، سور کا گوشت کھاتے ہو اور خدا کو صاحب اولاد سمجھتے ہو (یعنی جناب عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو)۔

اس کے بعد جناب عیسیٰ کی بندگی اورالوہیت کے بارے میں بحث شروع ہوگئی انھوں نے جناب عیسیٰ کے معجزات کو دلیل بنا کر، جیسے آپ مردوں کو زندہ کرتے تھے، غیب کی خبر دیتے تھے، مریضوں کو شفا عطا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے لہٰذا آپ کو وہ لوگ خدا کہہ رہے تھے۔ جب کہ پیغمبر اسلا ﷺ م آپ کی بشریت اور آپ کے بشر ہونے کے بارے میں تاکید فرما رہے تھے، یہ بحث اور گفتگو کافی طولانی ہوگئی اور انھوں نے بالآخر جناب عیسیٰ کی بشریت کو قبول نہیں کیا، اسی دور ان خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر پر یہ وحی نازل ہوئی۔

جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ خدا وہی عیسی بن مریم ہے وہ کافر ہوگئے ہیں[1] در حقیقت جناب عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک خلقت آدم کی طرح ہے کہ جن کو خاک سے پیدا کیا او ران سے کہا ہو جاؤ تو وہ

---

(۱) سورۂ مائدہ، آیت ۱۷۔

وجود میں آگئے۔ * (اگر جناب عیسیٰ کا بن باپ کے متولد ہونا ان کے فرزند خدا ہونے کی دلیل ہے تو جناب آدم تو اس منصب کے لئے زیادہ اولیٰ اور برتر تھے کیونکہ نہ ان کا کوئی باپ تھا اور نہ ماں۔ (جو کچھ جناب عیسیٰ کے بارے میں کہا گیا وہ) حق (ہے جو) آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے پس آپ انکار کرنے والوں میں سے نہ ہوجائیں)، (۱) پیغمبر علم کے آجانے کے بعد جو لوگ تم سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزندوں، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں۔ (۲)

ان آیات کے نزول کے بعد پیغمبر اسلا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم م نے فرمایا: "خداوند عالم نے مجھے حکم دیا ہے کہ اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو میں تمہارے ساتھ "مباہلہ" (۳) کروں۔"

انھوں نے کہا کہ ہم اس بارے میں غور کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف واپس چلے گئے پھر آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا ان کے پادری اور وفد کے سردار نے ان کو اس خطرے کی طرف متوجہ کردیا کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور اگر تم ان سے مباہلہ کرو گے تو عذاب نازل ہو جائے گا لیکن اس کے ساتھیوں نے اس کی ایک نہ سنی، مباہلہ پر اصرار کرتے رہے۔ آئندہ روز، مباہلے کا

---

* طبری کے نقل کے مطابق سورۂ آل عمران کی تقریباً ستر (۷۰) آیتیں اسی مناسب سے نازل ہوئیں ہیں۔ (اعلام الوری، ص ۱۲۹.)

(۱) سورۂ آل عمران، آیت ۶۰.

(۲) سورۂ آل عمران، آیت ۶۱۔

(۳) حلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج ۳، ص ۲۳۶۔ ۲۳۵؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ، ج ۲، ص ۱۴۴؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۲۱، ص ۳۴۷ (تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ) علامہ مجلسی نے عیسائیوں کے وفود کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مناظرہ اور ملاقات کو بحار الانوار کی ۲۱ ویں جلد میں صفحہ ۳۱۹ سے ۳۵۵ تک مختلف کتابوں سے جمع کیا ہے۔

وقت طے پایا۔ اس وقت ان کے پادری نے کہا دیکھو کل یہ دیکھنا کہ محمد ﷺ مباہلہ کے لئے کس طرح آتے ہیں اگر اپنے بچوں اور اہل خانہ کے ساتھ آئیں تو ان سے مباہلہ نہ کرنا کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ انھیں اپنی بات پر یقین و اعتماد ہے او روہ اس راستے میں صرف اپنی ہی جان نہیں بلکہ اپنے قریب ترین بچوں اور خاندان والوں کی جان کو بھی خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور اگر بالفرض وہ اپنے ساتھیوں اور اصحاب کے ساتھ آتے ہیں تو ان سے مباہلہ کرلو او ریاد رکھو کہ ان کی بات اور دعویٰ بے بنیاد اور بے دلیل ہے۔ یعنی وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کو لاکر اپنے ظاہری عظمت و جلال کو ہمارے اوپر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔[۱]

آئندہ روز پیغمبر اکرم ﷺ مقررہ وقت پر اپنے ساتھ حضرت علی، جناب فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کو لیکر مباہلہ کے لئے روانہ ہوئے۔[۲]

پادری نے آپ کے ساتھ ان حضرات کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ جواب دیا گیا کہ پیغمبر کے ابن عم ہیں وہ آپ کی بیٹی ہیں اور یہ دونوں آپ کی بیٹی کے بیٹے ہیں۔[۳]

پادری نے کہا: میں اس وقت ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے دعا کریں کہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دے تو پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دے گا ان سے مباہلہ نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور روئے زمین پر ایک عیسائی بھی باقی نہ رہ جائے گا۔

---

(۱) طبرسی، اعلام الوری، (تہران: دار الکتب، الاسلامیہ، ط۳)، ص۱۲۹؛ مجمع البیان، ج۲، ص۴۵۲؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۱، ص۳۳۷۔

(۲) حلبی، سیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص۲۳۶؛ زینی دحلان، السیرۃ النبیویہ والآثار المحمدیہ، ج۲، ص۱۴۴۔

(۳) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۷۲؛ طبرسی، اعلام الوری، ص۱۲۹۔

پادری کی اس خطرے کی گھنٹی سے عیسائی مباہلہ کرنے سے باز رہے[۱] اور پیغمبر ﷺ کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے ٹیکس دینے کے لئے تیار ہو گئے جس کی تفصیل تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔[۲]

---

(۱) حلبی، گزشتہ حوالہ، زینی دحلان، گزشتہ حوالہ؛ زمخشری، تفسیر الکشاف، (بیروت: دار المعرفہ)، ج۱، ص۱۹۳؛ فخر رازی، مفاتیح الغیب، (التفسیر الکبیر) (بیروت: دار التراث الاسلامی)، ج۸، ص۸۲؛ سید محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۳، ص ۲۳۱ (تفسیر ثعلبی کی نقل کے مطابق)؛ قاضی بیضاوی، انوار التنزیل، ص۷۴۔

(۲) رجوع کریں: تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۷۲؛ طبقات الکبری، ج۲، ص ۳۵۸؛ فتوح البلدان، ص۷۶۔ ۷۵. وثائق، ترجمہ: محمود مہدوی دامغانی، ص۱۳۵۔ ۱۳۴؛ السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ، ج۲، ص۱۴۴؛ السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص۲۳۶؛ تفسیر کشاف، ج۱، ص۱۹۱؛ التفسیر الکبیر (مفاتیح الغیب)، ج۸، ص۱۸۲؛ المیزان فی تفسیران، ج۳، ص۲۳۲۔

تیسری فصل

حجۃ الوداع اور رحلت پیغمبر ﷺ

حجۃ الوداع

حج؛ اسلام کا ایک عبادی اور سیاسی رکن ہے جس کے بانی حضرت ابراہیم تھے، اس کتاب کے پہلے حصہ کی دوسری فصل میں ہم نے ظہور اسلام سے پہلے تک قدرت و طاقت اور قریش کے نفوذ اور ان کی دینی حالتوں کی بحث میں روشنی ڈالی ہے کہ قریش اور تمام مشرکین کس طرح حج اور عمرہ کیا کرتے تھے جو ایک واقعی حج نہیں تھا بلکہ انھوں نے حج ابراہیمی کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا تھا اور اس میں طرح طرح کی رسم و رواج اور خرافات کی آمیزش کردی تھی۔

یہاں پر یہ بھی بیان کرنا مناسب ہوگا کہ قریش اپنے کو "سکان حرم اللہ" (حرم نشین)، سمجھتے تھے[1] اور چونکہ سرزمین "عرفہ" حرم سے باہر ہے اس لئے قریش حج کے زمانے میں مشرکین کے برخلاف، میدان عرفات میں نہیں جاتے تھے بلکہ وہ لوگ مزدلفہ "مشعر" میں وقوف (ٹھہرا) کرتے تھے۔[2] اور وہاں سے منیٰ چلے جاتے تھے۔ دوسری طرف یثرب کے لوگ "منات" نامی بت کے

---

(۱) ازرقی، اخبار مکہ، تحقیق: رشدی (قم: منشورات الرضی، ط ۱، ۱۴۱۱ھ-ق)، ج ۱، ۱۷۶؛ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، (بیروت: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۳ھ-ق)، ج ۳، ص ۳۱۳۔

(۲) واقدی، المغازی، ج ۳، ص ۱۱۰۲؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ، ج ۲، ص ۱۴۳۔

پاس جو یثرب اور مکہ کے راستے میں سمندر کے کنارے پر موجود تھا۔ وہاں سے احرام باندھتے تھے۔[۱] اور جو لوگ وہاں مُحرِم ہوتے تھے وہ لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہیں کرتے تھے۔[۲]

اسی طرح مشرکین حج کرتے وقت سنت ابراہیمی کے برخلاف غروب سے پہلے ہی میدان عرفات سے مزدلفہ کی طرف کوچ کرجاتے تھے[۳] ان تمام باتوں کی وجہ سے حج ابراہیمی کا چہرہ بالکل تبدیل ہوگیا تھا اور یہ عظیم الٰہی اور توحیدی عبادت، شرک اورخرافات کا پلندہ بن گئی تھی وجوب حج کی آیت[٤] نازل ہونے کے بعد رسول خدا ﷺ اپنے پہلے سے اعلان شدہ پروگرام کے مطابق مدینہ او راطراف کے مسلمانوں کے ساتھ حج کی طرف روانہ ہوئے اور[٥] اس سفر میں آپ نے جناب ابراہیم کے حقیقی اورواقعی حج کی، عملی طور پر مسلمانوں کو تعلیم دی، حضرت، مناسک حج کے دوران مسلسل یہ تاکید فرماتے رہے کہ مسلمان مناسک حج کو آپ سے اچھی طرح سیکھ لیں کیونکہ شاید آئندہ سال آپ کو حج نصیب نہ ہو،[٦] آپ فرماتے تھے کہ مواقف اور مشاعر حج کو دھیان میں رکھو کیونکہ یہ جناب ابراہیم کی میراث ہے۔[٧]

---

(۱)ہشام کلبی، الاصنام، ترجمہ: سید محمد رضا جلالی نایینی، ۱۳٤۸ش، ص۱۳؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۱، ص۸۸؛ محمود شکری آلوسی، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب، تصحیح محمد بھجۃ الاثری، (قاہرہ: دار الکتب الحدیث)، ج۲، ص۲۰۲۔

(۲) حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ۳۱۷۔

(۳) واقدی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۱۱۰٤۔

(٤)سورۂ حج، آیت ۲۷۔

(٥)کلینی، الفروع من الکافی (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸٤ھ.ق)، ج۲۱، ص۳۹۰۔

(٦)ابن سعد، الطبقات الکبری، ج۲، ۱۸۱؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ج۳، ص۳۲۷۔

(۷)واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۱۱۰٤۔

آپ نے اس سفر میں، مشرکین، خاص طور سے قریش کی بدعتوں سے حج کو پاک اور صاف کردیا باوجودیکہ آپ خود قریش سے تعلق رکھتے تھے آپ نے عرفات میں وقوف کیا اور وہاں سے مزدلفہ تشریف لے گئے۔[۱] کیونکہ حکم خدایہی تھا کہ "پھر جہاں سے لوگ روانہ ہوتے ہیں وہیں سے آپ بھی روانہ ہوں"[۲] اسی طرح آپ نے میدان عرفات سے سورج غروب ہونے کے بعد مزدلفہ کی طرف کوچ کیا۔[۳] یہ حج مختلف اسباب اور مناسبتوںکی وجہ سے" حجۃ الوداع "" حجۃ الاسلام " اور "حجۃ البلاغ" کہا گیا۔[٤]

پیغمبر اسلا ﷺ م کا تاریخی خطبہ

پیغمبر اسلا ﷺ م نے مناسک حج کے دوران روز عرفہ، عرفات کے میدان میں حاجیوں کے جم غفیر میں ایک بہت ہی اہم اورتاریخی خطبہ ارشادفرمایا اور اس کے دوران بہت سے اہم مسائل پر روشنی ڈالی اور ان کے بارے میں باربارتاکید او روصیت فرمائی اس میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جب آپ نے ذی الحجہ اور خاص طور سے اس روزعرفہ کی عظمت اورقداست کا تمام حاضرین سے اعتراف لے لیا توفرمایا:

اے لوگو! جب تک تم لوگ خدا سے ملاقات نہ کرلو تم سب لوگوں کے خون، اموال ناموس اور آبرو بالکل اس مہینے اور اس دن کی حرمت اورقداست کی طرح محترم ہیں اور ان میں سے کسی پر تجاوزکرنا حرام ہے آپ نے فرمایا: جاہلیت میں بہائے جانے والے خون کا بدلہ، اسلام کے زمانہ میں

---

(۱) واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۱۱۰۲؛ زینی دحلان، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۱٤۳؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ج۲۱، ص۳۹۲۔

(۲)سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۹۔

(۳)واقدی، گزشتہ حوالہ، ص۱۱۰٤؛ مجلسی، گزشتہ حوالہ، ص۳۷۹۔

(٤)زینی دحلان، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۱٤۳۔

ناقابل اجراء ہے۔ اور ربا حرام ہے۔

اسی طرح آپ نے حرام مہینوں میں تبدیلی یا ان کے مؤخر کرنے کا سبب کفر میں افراط کو قرار دیا اور فرمایا کہ یہ بات بھی آج کے بعد ممنوع ہے۔(۱)

عورتوں کے حقوق کے بارے میں یہ تاکید اور وصیت فرمائی: "عورتوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو کیونکہ وہ تمہارے ہاتھوں میں خدا کی امانتیں ہیں اور قوانین الٰہی کے ذریعہ تمہارے اوپر حلال ہوئی ہیں" اس کے بعد فرمایا: "حاضرین، غائبین تک میرا یہ پیغام پہونچا دیں کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہے اور تم مسلمانوں کے بعد کوئی امت نہ ہوگی"۔ اس کے بعد آپ نے جاہلیت کی رسم و رواج اور عقائد کو بالکل باطل اور کالعدم قرار دیدیا۔(۲)

عظیم فضیلت

جیسا کہ بزرگ محدثین اور مفسرین نے بیان کیا ہے کہ آیۂ مباہلہ کے نزول کے بعد پیغمبر اسلا ﷺ م کے ساتھ چار لوگ مباہلہ کے لئے آئے تھے، یہ ان کے لئے بہت بڑی اور عظیم فضیلت ہے کیونکہ آیت اور واقعۂ مباہلہ نے یہ واضح کردیا کہ حسن و حسین رسول خدا کے فرزند اور حضرت علی آپ کا نفس ہیں اور آپ کی بیٹی جناب فاطمہ وہ تنہا خاتون ہیں جو مباہلہ میں تشریف لائیں آیت میں نساء کا مصداق آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

جناب عائشہ سے نقل ہوا ہے کہ روز مباہلہ، پیغمبر اسلام ﷺ نے ان چاروں افراد کو اپنی سیاہ (اور لکیر دار) عبا کے نیچے لیکر اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیراً﴾(۳)

اس بارے میں تمام علماء شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے کہ مباہلہ کے دن یہی چاروں حضرات

---

(۱) حرام مہینوں کی تبدیلی اوران کے ناموں میں الٹ پھیر اس کتاب کے پہلے حصہ میں "اسلام سے پہلے عرب کی معاشرتی صورت حال، کی بحث میں "حرام مہینوں" کے عنوان کے تحت کی ہے۔

(۲) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج۴، ص۲۵۲۔ ۲۵۰؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص۳۱۲؛ ابن سعد، طبقات الکبری، ج۲، ص۱۸۶؛ واقدی، المغازی، ج۳، ص۱۱۱۱؛ مجلسی، بحار الانوار، ج۲۱، ص۳۸۰۔ اس بات کا خیال رہے کہ ابن سعد اور واقدی کے کہنے کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ خطبہ میدان منی میں ارشاد فرمایا ہے۔

(۳) (سورۂ احزاب، آیت ۳۲)؛ زمخشری، گزشتہ حوالہ، ؛ فخر رازی نے عائشہ کا نام لئے بغیر، اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ جملہ بڑھایا ہے "جان لو کہ یہ روایت اہل تفسیر و حدیث کے درمیان صحیح حدیث کی طرح ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے" (تفسیر کبیر، ج۸، ص۸۲)؛ شبلنجی کہتا ہے: "یہ روایت متعدد صحیح سندوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

پیغمبر اسلا ﷺ م کے ساتھ آئے تھے اور کتب تاریخ و تفسیر و حدیث میں اس بارے میں بے شمار روایتیں نقل ہوئیہیں[1] اور تمام محققین نے ان حضرات کی اس عظیم فضیلت پر تاکید کی ہے۔

---

(۱) منجملہ مندرجہ ذیل منابع: تفسیر الکشاف، ج۱، ص۱۹۳؛ مفاتیح الغیب، (تفسیر الکبیر)، ج۸، ص۸۲؛ الدر المنثور، (دار الفکر)، ج۲، ص ۲۳۱ تا ۲۳۳؛ (کتاب الدلائل میں حاکم، ابن مردویہ، ابونعیم کے نقل کے مطابق؛ ترمذی، ابن المنذر، بیہقی، درکتاب السنن، و ابن جریر)، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص ۷۱؛ ابوسعید واعظ خرگوشی، شرف النبی، ترجمہ: نجم الدین محمود راوندی (تہران: انتشارات بابک، ۱۳۶۱)، ص۲۶۲؛ قاضی بیضاوی، انوار التنزیل، (ط قدیم رحلی)، ص۷٤؛ نور الابصار، ص ۱۱۱؛ مناقب علی بن ابی طالب، ابن مردویہ، تدوین و ترتیب و مقدمہ: عبدالرزاق حرز الدین، ص۲۲۶۔ لیکن اس ضمن میں وسیع ترین اور تفصیلی بحث مرحوم سید بن طاووس کی کتاب "الاقبال بالاعمال الحسنۃ فیما یعمل مرۃ فی السنہ"، ج۲، ص۳٤۸۔ ۳۱۰؛ میں پائی جاتی ہے۔ میدان مباہلہ میں اہلبیت کی موجودگی کے بارے میں ان تمام روایات کی حکایت کے باوجود بعض مورخین کی طرف سے تعصب کے تحت مباہلہ کی روایت میں خرد برد ہوئی ہے اور اپنے اپنے سلیقہ کے مطابق اس میں کمی اور زیادتی کی گئی ہے ان میں سے، بلاذری، ابن کثیر اور شعبی نے حضرت علی کے نام کو حدیث مباہلہ سے حذف کردیا ہے (رجوع کریں: فتح البلدان، ص۷۵، البدایہ والنہایہ، ج۵، ص٥٤؛ الدر المنثور، ج۲، ص ۲۳۲) اور حلبی و زینی دحلان نے عائشہ اور حفصہ کو میدان مباہلہ میں موجودگی کیلئے نامزد قرار دیتے ہوئے عمر سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: اگر عیسائیوں سے میں مباہلہ کرتا تو علی، فاطمہ، حسن، حسین، ٪ عائشہ اور حفصہ کو لیتا اور حاضر ہوتا۔ (السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص۲۳۶. السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ، ج۲، ص۱٤۵۔ ۱٤٤؛ اور سیوطی نے ابن عساکر سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مباہلہ کے لئے، ابوبکر اور ان کے لڑکوں کو، عمر اور ان کے لڑکوں کو، عثمان اور ان کے لڑکوں کو اور علی اور ان کے لڑکوں کو دعوت دی!! (الدر المنثور، ص۳۳۳.) ان روایات کا جعلی اور تحریف شدہ ہونا اس قدر واضح ہے کہ توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف بطور اشارہ یاددہانی کراتے ہیں کہ اگر کلمہ "نسائنا" پیغمبر ﷺ کی ازواج کو بھی شامل ہوتا تو کیوں اور کس طرح صرف ان میں سے دو بیویاں (دو خلیفہ کی لڑکیاں) مباہلہ میں حاضر ہونے کی لیاقت رکھتی تھیں؟!

اہل سنت و الجماعت کے عظیم محدث، "مسلم"، سعد وقاص سے نقل کرتے ہیں کہ ان کا بیان ہے کہ جس روز یہ آیت "فقل تعالوا ندع ابنائنا و ابنائکم" نازل ہوئی، رسول خدا ﷺ نے علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین کو بلایا اور فرمایا: "خدایا! یہ میرے اہل بیت ہیں"[۱]

زمخشری نے واقعۂ مباہلہ اور روایت عائشہ کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ واقعہ اصحاب کساء کی سب سے طاقتور دلیل ہے اور پیغمبر اسلا ﷺ م کی حقانیت کا سب سے واضح اور روشن برہان ہے۔[۲]

قاضی بیضاوی نے بھی واقعۂ مباہلہ کو نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ واقعہ پیغمبر کی نبوت کی حقانیت اور آپ کے ساتھ آنے والے آپ کے اہل بیت کی فضیلت کی بہترین دلیل ہے۔[۳]

سید بن طاوؤس نے کتاب سعد السعود میں تحریر کیا ہے کہ "محمد بن عباس بن مروان نے اپنی کتاب "ما نزل من القرآن فی النبی و اہل بیتہ" میں حدیث مباہلہ کو صحابہ اور غیر صحابہ کی ۵۱ سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے"[٤]

اس بحث کے اختتام پر صرف یہ یاددہانی ضروری ہے کہ واقعۂ مباہلہ کی تاریخ، سن اور مہینہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے[۵] کیونکہ اس مقام پر اس کی تحقیق کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا ہم نے مورخین کے طریقۂ کار اور سنت کے مطابق اس کو ۱۰ھ کے واقعات میں ذکر کردیا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، بشرح النووی، ج۱۵، ص۱۷٦۔

(۲) تفسیر الکشاف، ج۱، ص۱۹۳۔

(۳) انوار التنزیل، طبع قدیم، رحلی، ص۷٤۔

(٤) مجلسی، بحار الانوار، ج۲۱، ص۳۵۰۔

(۵) اس کے متعلق مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: مکاتیب الرسول، ج۱، ص۱۷۹ و فروغ ابدیت، ط۵، ج۲، ص٤٤۵۔ ٤٤۱۔

* یہ وہ جگہ تھی جہاں سے مختلف ممالک کے حاجیوں کے راستے الگ ہو جایا کرتے تھے۔ مصر عراق اور مدینے کا راستہ وہیں سے جدا ہوتا تھا۔

واقعۂ غدیر اور مستقبل کے رہنما کا تعارف

حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر ۱۸ ذی الحجہ کے دن حجفہ سے تین میل کے فاصلہ پر سرزمین "غدیر خم" * میں آیۂ (یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ...)(۱) کے نزول کے بعد پیغمبر اسلا ﷺ م نے بے آب و گیاہ میدان میں شدید گرمی کے باوجود ایک لاکھ حاجیوں کے کاروان کو رکنے کا حکم دیا اور نماز ظہر ادا کرنے کے بعد ایک بلند مقام پر تشریف لے گئے اور ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا: اس میں پہلے تو آپ نے اپنی عمر کے تمام ہونے کی اطلاع دی اور اس کے بعد اپنی تبلیغ او ررسالت سے متعلق مسلمانوں کے خیالات معلوم کئے تو سب نے ایک زبان ہو کر آپ کی تبلیغ، ہدایت اور ارشاد و راہنمائی کی تعریف کی۔ اس کے بعد آپ نے کتاب و عترت یعنی ثقلین کے بارے میں نصیحت فرمائی اور یہ تاکید کی کہ مسلمان دونوں سے متمسک رہیں تاکہ گمراہ نہ ہوں اور آپ نے مزید فرمایا کہ خداوند عالم نے ان کو یہ اطلاع دی ہے کہ یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے لہذا لوگ ان سے آگے نہ بڑھیں اور نہ ہی ان سے پیچھے رہ جائیں۔

اس موقع پر آپنے حضرت علی کا ہاتھ بلند کیا اور ان کو مسلمانوں کے آئندہ رہبر اور خلیفہ کے عنوان سے پہچنواتے ہوئے یہ فرمایا: خداوند عالم میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں (اور ان کے اوپر ان سے زیادہ اولویت رکھتا ہوں) اور جس کا میں مولا ہوں علی اس کے مولا ہیں۔ پروردگارا! تو اس سے محبت فرما جو علی سے محبت کرے اس کو دشمن رکھنا جو علی سے دشمنی رکھے۔ خدایا! علی کے مددگاروں کی مدد فرما ان کے دشمنوں کو خوار اورذلیل فرما، پروردگارا! علی کو حق کا محور قرار دے۔

---

(۱) اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا ، اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔ (سورۂ مائدہ، آیت ٦٧)

اسی وقت یہ آیۂ قرآن نازل ہوئی: ﴿الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً...﴾[۱] جس میں دین کی تکمیل اورہدایت کی نعمت کے اتمام کا اعلان پیغمبر ﷺ کے ہاتھوں حضرت علی کے خلیفہ منسوب ہو جانے کے بعد کردیا گیا اس کے بعد پیغمبر ﷺ کے اصحاب نے حضرت علی کو اس منصب کی مبارکبادی۔[۲]

یہ واقعۂ غدیر کا ایک مختصر سا خاکہ ہے اورچونکہ یہ اہم واقعہ اتنا مشہور اور متواتر ہے جس کی وجہ سے ہم نے اس پورے واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ دوسرے اسلامی محققین اوردانشوروں نے اس واقعہ کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو بیان کیاہے خاص طور سے علامہ امینی نے اپنی بیش قیمت اور اہم کتاب الغدیر میں اس واقعہ کی سند اور متن او ردلالت پر ہر اعتبار سے بحث کی ہے اور اس واقعہ کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں تحقیق اور جستجو فرمائی ہے لہٰذا اسی بنا پر ہم اس مقام پر صرف چند نکتوں کو بطور یاددہانی ذکر کرکے چند اہم سوالات کے جوابات دینا چاہتے ہیں۔

۱۔ واقعۂ غدیر، حضرت علی کی ولایت اور امامت کی اہم دلیل اور سند ہے او رزمانہ کی ترتیب کے اعتبار سے یہ آخری سند ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی امامت کی صرف یہی ایک تنہا دلیل ہے کیونکہ جیسا کہ آپ نے اس کتاب میں بھی ملاحظہ فرمایاکہ امت کی رہبری اور امامت کی اہمیت کے پیش نظر، پیغمبر اسلا ﷺ م نے بعثت کے ابتدائی ایام میں ہی اپنے اعزاء اور اقرباء کو اپنی رسالت اور اسلام کی طرف دعوت دیتے وقت واقعۂ ذوالعشیرہ میں اپ کی امامت کا بھی تذکرہ کیا تھا اور اس کے بعد بھی آپ مختلف مواقع پر (جیساکہ تبوک میں) اس بات کی مسلسل یاددہانی کراتے رہے۔

پیغمبر ﷺ کی جانشینی، ایک خدائی مسئلہ ہے اس کے بارے میں بھی آپ پہلے یہ پڑھ چکے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے علنی دعوت کے ابتدائی سالوں میں جب مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت دی تو قبیلۂ بنی عامر بن

---

(۱) آج کفار تمہارے دین سے مایوس ہوگئے ہیں لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کردیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کردیاہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنادیا ہے۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۳)

(۲)علامہ امینی، الغدیر فی الکتاب والسنہ و الادب (بیروت: دار الکتاب العربیہ)، ج ۱، ص ۱۱ ۔ ۱۰۔

صعصہ کے سردار کے جواب میں آپ نے فرمایا: "میری جانشینی خدا سے مربوط ہے اور وہ اس کو جہاں چاہے گا قرار دیدے گا"(۱)

اپنی جانشینی سے متعلق پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی تبلیغ کے دوران جو طریقۂ کار اپنایا تھا اور ایک ہی شخصیت پر آپ کی نگاہ مسلسل ٹکی ہوئی تھی اگر ہم اس کو انصاف کے ساتھ دیکھیں نیز اگر ہم علمی برتری، ایثار و فداکاری، لیاقت و شایستگی اور تجربہ کے لحاظ سے اصحاب پیغمبر ﷺ کے درمیان غور سے دیکھیں اور ان تمام باتوں اور فضیلتوں کو پیغمبر ﷺ کی جانشینی کا معیار قرار دیں تو ہم اس نتیجہ تک پہونچیں گے کہ حضرت علی ہر لحاظ سے بے مثال اور لاجواب نظر آتے ہیں کیونکہ پیغمبر کھلم کھلا اور علی الاعلان آپ کو اپنی جانشینی کے لئے پیش کرنے پر تاکید فرماتے تھے اور ہر موقع اور مناسبت پر کسی نہ کسی طرح آپ کی برتری، فضیلت اور افضلیت کو لوگوں کے گوش گزار کرتے تھے اور ان تمام فضائل اور کمالات میں پیغمبر کا کوئی صحابی بھی حضرت علی کے ہم پلہ نہیں تھا۔

۲۔ جیسا کہ اس بارے میں اشارہ کیا گیا ہے کہ حدیث غدیر کی شہرت اور تواتر کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں پایا جاتا اور علماء اہل سنت کے ایک گروہ نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔*

---

(۱) الامر للہ یضعہ حیث یشائ۔

* وہ لوگ حضرت علی کی امامت سے متعلق اس کی دلالت کی بارے میں شک و شبہ پیدا کرتے ہیں کہ جس کی وضاحت ہم پیش کریں گے۔ مثلاً ۱۳۷۱ ش، میں ترکی کے شہر استانبول میں شیعہ شناسی سے متعلق ایک بین الاقوامی کانفرس منعقد ہوئی تھی جس میں اسلامی ممالک کے علماء اوردانشوروں نے شرکت کی تھی اور اس میں ایک وفد ایران کے برجستہ علماء اور محققین پر مشتمل تھا اسی کانفرنس میں کسی مقرر نے جب حدیث غدیر کا انکار کیا تو سوریہ یونیورسٹی کے مشہور اور معروف دانشمند ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوتی نے یہ کہا تھا کہ حدیث غدیر پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے یہ آپ سے نقل ہوئی ہے اس میں کسی قسم کی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہ شیعوکے مدعا پر دلالت نہیں کرتی... البتہ اگرچہ اس کے بعد اس جملہ کا جواب بھی، ایران کے محقق نے اس طرح سے پیش کردیا کہ "یہ شیعہ عقیدہ پر دلالت کرتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: "منطق شیعہ ھا در کنکرھا و مجامع علمی" آیۃ اللہ سبحانی، انتشارات مکتب اسلام ط ۱، ۱۳۷۶۔ش، ص ۲۱، ۲۷۔

جیسا کہ علامہ امینی نے الغدیر میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس اہم تاریخی واقعہ کو ایک سو دس (۱۱۰) صحابیوں اور ۸۴ تابعیوں نے نقل کیا ہے اور ۳۶۰ علماء و محققین اہل سنت نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا اور ان میں سے کچھ لوگوں نے اس کی سند کی صحت کا بھی اعتراف کیا ہے[۱] اسلامی تاریخ کے اہم واقعات میں سے شاید ہی کوئی واقعہ ہو جس کی شہرت اور سند اتنی محکم اور مستحکم ہو۔

البتہ واقعۂ غدیر کو اکثر محدثین نے نقل کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ (مختلف اسباب کی بنا پر جو اہل علم اور تحقیق سے پوشیدہ نہیں ہے) مورخین نے اس واقعہ کو ہضم کر لیا ہے صرف مورخین کے درمیان یعقوبی نے اس کو حجۃ الوداع کے بعد مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔[۲]

---

(۱) الغدیر، ج ۱، ص ۱۵۱ ۔ ۱٤۔

(۲) ...و خرج صلی اللہ علیه و آله و سلم لیلاً منصرفاً الی المدینة فصار الی موضع بالقرب من الجحفة یقال له "غدیرخم" لثمانیة عشر لیلة من ذی الحجة و قام خطیباً و أخذ بید علی بن ابی طالب علیه السلام فقال:ألست اولی بالمؤمنین من أنفسهم؟ قالوا: بلی یا رسول اللہ، قال: فمن کنت مولاه فعلی مولاه، اللّٰهم و ال من والاه و عاد من عاداه۔ (ج ۲، ص ۱۰۲)

مسعودی نے (مشہور کے خلاف) اس کو حدیبیہ کے سفر سے پلٹتے وقت ذکر کیا ہے، وہ یوں رقمطراز ہے:

"... و فی منصرفه عن الحدیبیة قال لامیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنه بغدیر خم: من کنت مولاه فعلی مولاه و ذلک فی الیوم الثامن عشر من ذی الحجه..." (التنبیه و الاشراف (قاہرہ: دار الصاوی للطبع و النشر و التألیف)، ص ۲۲۱)

وہ مروج الذہب میں حضرت علی کے برجستہ فضائل کو شمار کرتے ہوئے حدیث ولایت کو اختصار کے ساتھ یوں نقل کرتے ہیں:

"الاشیاء التی استحق بها اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه و آله و سلم الفضل هی: السبق الی الایمان، والهجرة، والنصرة لرسول اللہ صلی اللہ علیه و آله و سلم، والقربی منه، والقناعةو بذل النفس له، والعلم بالکتاب و التنزیل، والجهاد فی سبیل اللہ، والورع، والزهد، والقضائ، والحکم، والفقه، والعلم، و کل ذلک لعلی علیه السلام، منه النصیب الاوفر، و الحظ الأکبر، الی ما ینفرد به من قول رسول اللہ ﷺ حین آخی بین اصحابه،: "انت أخی"وهو صلی اللہ علیه و آله و سلم لاضد له و لاند. و قوله صلوات اللہ علیه : "انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لانبی بعدی" و قوله علیه الصلاة والسلام : "من کنت مولاه فعلی مولا، اللّٰهم وال من والاه و عاد من عاداه..." (مروج الذهب، (بیروت: دار الاندلس، ط ۱، ۱۹۶۵)، تحقیق: یوسف اسعد داغر، ج ۲، ص ٤۲۵.)

اگر چہ تاریخ طبری میں جن کا طریقۂ کار ہی یہ ہے کہ وہ ہر واقعہ کی تفصیل اور گہرائی تک جاتے ہیں لیکن توقع کے برخلاف اس واقعہ کوذکر ہی نہیںکیا، اگر چہ انھوں نے غدیر کے اثبات کے لئے ایک مستقل کتاب "کتاب الولایۃ"(۱) کے نام سے تالیف کی کہ جو آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھی اور نجاشی(۲) {متوفی ۴۵۰ھ} اور شیخ طوسی(۳){ متوفی ۴۶۰- ۳۸۵ ہجری قمری} نے اس کتاب کا تذکرہ کیاہے اور اس کتاب تک اپنی سند کو بھی ذکر کیا ہے۔

---

(۱)ابن شہر آشوب، معالم العلماء (نجف: المطبعۃ الحیدریہ، ۱۳۸۰ھ.ق)، ص۱۰۶؛ ابن طاووس، الطرائف فی معرفۃ مذاہب الطوائف (قم: مطبعۃ الخیام، ۱۴۰۰ھ.ق)، یہ بطریق، عمدۃ عیون صحاح الاخبار، تحقیق: مالک المحمودی و ابراہیم البھادری (قم: ۱۴۱۲ھ.ق)، ج۱، ص۱۵۷۔

اس کتاب کے دوسرے نام بھی ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے: کتاب الفضائل، حدیث الولایہ اور کتاب غدیر خم، گویا انمیں سے کچھ عنوان ایسے ہیں جو کتاب کے مطالب کے لحاظ سے کتاب شناس لوگوں کے ذریعہ سے رکھے گئے ہیں۔ اور کچھ دوسرے نام شاید کتاب کے ایک خاص حصہ کا ہے جو مستقل طور پر شائع ہوا ہے جیسا کہ بعد کے حاشیہ میں آیا ہے نجاشی نے اس کو "الرد علی الحرقوصیہ" کے نام ذکر کیاہے۔ "حرقوص بن زہیر" خوارج کا ایک سردار تھا۔ گویااس نام گزاری کا مقصد یہ تھا کہ مخالفین ولایت علی کو ناصبی اور خارجی بتائیں۔

(۲)محمد بن جریر ابوجعفر الطبری عامی لہ کتاب الرد علی الحرقوصیۃ ذکر طرق خبر یوم الغدیر اخبرنا القاضی ابواسحاق ابراہیم بن مخلد قال حدثنا ابی قال حدثنا محمد بن جریر بکتابہ "الرد علی الحرقوصیۃ" (نجاشی، فہرست مصنفی الشیعہ، قم: مکتبۃ الداوری، ص۲۲۵؛) "سید ابن طاووس" نے بھی کتاب الاقبال، ج۲، ص۲۳۹، میں اسی نام سے ذکر کیا ہے۔

(۳) محمد بن جریر طبری، ابوجعفر صاحب التاریخ، عامی المذہب لہ کتاب غدیر خم و شرح امرہ بصفتہ اخبرنا بہ احمد بن عبدون عن الدوری عن ابن کامل عنہ (طبرسی، الفہرست، مشہد: مشہدیونیورسٹی ۱۳۵۱ش، ص۲۸۱.)

ابن کثیر متوفی ۱۷٤ھ نے بھی واقعہ غدیر کو حجۃ الوداع کے بعد ذکر کر کے یہ کہا ہے: ابو جعفر محمد بن جریر طبرسی مولف تفسیر اور تاریخ نے اس حدیث پر توجہ کی ہے اور اس کی سند اور الفاظ کو دو جلدوں میں جمع کیا۔[۱] اس کے بعد انھوں نے طبری کی کچھ روایات کو حدیث غدیر سے متعلق نقل کیا وہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: میں نے طبری کی ایک کتاب دیکھی ہے جو دو بڑی جلدوں پر مشتمل تھی اور اس میں انھوں نے حدیث غدیر کو جمع کیا ہے۔[۲]

ابن شہر آشوب متوفی ۵۸۸ھ لکھتے ہیں اس (طبری) نے کتاب غدیر خم کو تالیف کی اور اس میں اس واقعہ کی شرح کی اور اس کتاب کا نام "الولایۃ" رکھا۔[۳]

ابن طاوؤس بھی راوۃ حدیث غدیر کو شمار کرتے وقت کہتے ہیں: حدیث غدیر کو محمد بن جریر مولف تاریخ نے ۷۵ سندوں کے ساتھ روایت کیا اور اس بارے میں ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے جس کا نام حدیث الولایہ ہے۔[٤]

یحییٰ بن حسن معروف جو "ابن بطریق" کے نام سے معروف ہیں (۶۰۰ھ - ۵۲۳ھ) تحریر کرتے

---

(۱) وقد اعتنی بأمرہذا الحدیث ابوجعفر محمد بن جریر طبری صاحب التفسیر و التاریخ فجمع فیہ مجلدین اورد فیہما طرقہ و الفاظہ... (البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۲۰۸.) یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن کثیر نے عین حادثۂ غدیر کو نقل کرتے وقت اس میں خدشہ ظاہر کیا ہے انشاء اللہ ہم بعد میں اس کے متعلق بحث کریں گے۔

(۲) و قدرأیت له کتاباً فجمع فیهااحادیث غدیر خم فی مجلدین ضخمین۔ (گزشتہ حوالہ، ج ۱۱، ص۱٤۷، حوادث سال ۳۱۰ کے ضمن میںجو کہ طبری کے مرنے کا سال ہے،)

(۳) لہ (طبری) کتاب غدیر خم و شرح امرہ و سماہ کتاب الولایۃ۔ (معالم العلمائ، ص۱۰۶)

(٤) و قد روی الحدیث فی ذالک محمد بن جریر الطبری صاحب التاریخ من خمس و سبعین طریقاً و افرد لہ کتاباًسماہ حدیث الولایۃ. (الطرائف، ج ۱، ص۱٤۲.)

ہیں: محمد ابن جریر طبری مولف کتاب تاریخ نے روایت غدیر کو ۷۵ سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام کتاب "الولایہ" ہے۔[۱]

جن محققین اور مورخین کے نام ہم نے ذکر کئے ہیں ان لوگوں نے کتاب الولایہ کا ایک مختصر اور اجمالی خاکہ ہی بیان کیا ہے اور بعض حضرات جیسے ابن کثیر نے اس کی صرف بعض روایات نقل کرنے پر اکتفا کی ہے، قاضی نعمان مغربی مصری (ابو حنیفہ نعمان بن محمد تمیمی متوفی ۳٦۳ھ) وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے طبری کی روایات میں سے ۷۵ روایتیں حضرت علی کے فضائل میں اپنی کتاب "شرح الاخبار فی فضائل الائمۃ الاطہار" میں نقل کی ہیں اور اسی طرح انھوں نے طبری کی باتوں کو آئندہ نسلوں کے لئے منتقل کردیا۔[۲]

وہ کہتے ہیں کہ: "یہ کتاب بہت ہی دلچسپ کتاب ہے جس میں طبری نے حضرت علی کے فضائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔[۳]

طبری نے اس کتاب کو کس بنا پر تالیف کیا ہے۔[٤] قاضی نعمان اس سبب اور وجہ کو بیان کرنے

---

(۱) وقد ذکر محمد بن جریر الطبری، صاحب التاریخ خبر یوم الغدیر و طرقہ من خمسۃ و سبعین طریقاً و افرد لہ کتاباً سماہ کتاب الولایۃ۔ (عمدۃ عیون صحاح الاخبار، ج ۱، ص ۱۵۷.)

(۲) یہ کتاب ۱٤۱٤ھ.ق. میں مؤسسہ نشر اسلامی در قم، کے توسط سے تین جلدوں میں طبع ہوچکی ہے اور پہلی جلد میں صفحہ ۱۳۰ کے بعد طبری کی روایات نقل ہوئی ہیں۔

(۳) و ہو کتاب لطیف بسط فیہ ذکر فضائل علی علیہ السلام (گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۱۳۰.)

(٤) گزشتہ حوالہ، ج ۱، ص ۳۱۰؛ ان کے کتاب تالیف کرنے کا سبب یہ تھا کہ انھیں اطلاع ملی کہ علمائے بغداد میں سے ایک نے حدیث غدیر کا انکار کیا ہے اور یہ دعوی کیا ہے کہ حضرت علی حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر رسول خدا ﷺ کے ساتھ نہیں تھے بلکہ یمن میں تھے، طبری کو یہ بات سن کر بہت غصہ آیا اور انھوں نے اس کی رد میں کتاب الولایہ تحریر کی اور اس میں حدیث غدیر کو مختلف سندوں کے ساتھ ذکر کر کے اس کی صحت کو ثابت کیا۔ حافظ ابن عساکر اور شمش الدین محمد ذہبی کے بقول مذکورہ شخص ابوبکر ابوداؤد {سلیمان بن اشعث} سجستانی مؤلف {سنن} تھا۔ اور یہ حضرت علی کے بغض و دشمنی میں مشہور تھا۔ (تاریخ مدینہ دمشق، ج ۲۹، ص ۸۷؛ میزان الاعتدال، ج ۲، ص ٤۳٤؛ تاریخ بغداد، ج ۹، ص ٤٦۸ ٤٦۷.)

کے بعد مزید یہ کہتے ہیں کہ طبری نے اس کتاب میں ولایت علی سے متعلق ایک باب مختص کیا ہے اور اس میں پیغمبر اسلا ﷺ م سے مروی صحیح روایات کو ذکر کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خواہ حجۃ الوداع سے پہلے یا حجۃ الوداع کے بعد فرمایا:

"من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ و انصر من نصرہ و اخذل من خذلہ" اور یہ بھی فرمایا: علی امیر المومنین ، علی اخی، علی وزیری، علی وصیی، علی خلیفتی علی امتی من بعدی، علی اولی الناس بالناس من بعدی"

اور اس کیعلاوہ دوسری روایتیں بھی ہیں جو حضرت علی کی جانشینی کو ثابت کرتی ہیں اور جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امت کی رہبری اور اس کی قیادت کی باگ ڈور آپ کو ہی ملنا چاہئے تھی اور کسی کو آپ سے آگے بڑھنے کا یا آپ کے اوپر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے"۔[۱]

۳۔ اس بارے میں جو لائق ذکر شبہ ایجاد کیا گیا ہے وہ بعض علمائے اہل سنت جیسے فخر رازی اور قاضی عضد ایجی کی طرف سے اس کے مفاد میں شک و شبہہ پیدا کرنا ہے۔ انھوں نے اصل واقعہ کو تو قبول کیا ہے لیکن رسول خدا ﷺ نے خطبۂ غدیر میں حضرت علی کے بارے میں جو کلمۂ مولیٰ استعمال کیا ہے اور اس سے ولایت الٰہیہ اور امامت کے معنی سمجھ میں آتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ کلمۂ مولا، دوست اور ناصر وغیرہ کے معنی میں ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت علی کی ولایت اور خلافت پر دلالت نہیں کرتا ہے بلکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس خطبہ میں حضرت علی کی دوستی اور محبت کا حکم دیا تھا یہ لوگ کہتے ہیں کہ مَفعَل (مولیٰ) لغت میں اَفعل (اولیٰ) کے معنی میں نہیں آیا ہے اس بنا پر پیغمبر اکرم ﷺ کے اس خطبہ میں لفظ مولیٰ کے معنی دوست کے ہیں۔[۲]

---

(۱) شرح الاخبار، ج۱، ص۱۳۵۔ ۱۳۴۔ اسی طرح کتاب الولایہ کے متعلق مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: پارہ ھای بر جای ماندۂ کتاب فضائل علی بن ابی طالب، رسول جعفریان، فصلنامۂ میقات حج، شمارۂ ۳۴۔

(۲) الغدیر، ج۱، ص۳۵۰، ۳۵۴ و ۳۵۶۔

علامہ امینی نے اپنی بہت ہی علمی، تحقیق اور جستجو کے بعد قرآنی، حدیثی، لغوی اور دوسرے شواہد ذکر کرنے کے بعد ادیبوں اور بڑے بڑے لغت شناس کے کلام سے استشہاد کرنے کے بعد اس دعویٰ کی بے مائیگی اور کمزوری کو ثابت کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان تینوں مقامات پر لفظ مولا، اولیٰ کے معنی میں شائع اور رائج تھا۔ نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل آیتوں میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھتے ہوئے لفظ مولا کے معنی ولی یا متولی امر یا صاحب اختیار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتے۔

آیہ: ﴿فاليوم لايؤخذ منكم فدية و لا من الذين كفروا مأويكم النار هي موليٰكم و بئس المصير﴾۔[1] ﴿واعتصموا بالله هو موليٰكم فنعم المولىٰ و نعم النصير﴾۔[2] ﴿ذٰلک بأن الله مولى الذين آمنوا و ان الكافرين لا مولىٰ لهم﴾۔[3] ﴿بل الله موليٰكم و هو خير الناصرين﴾۔[4] ﴿قل لن يصيبنا الا ماكتب الله لنا هو مولٰينا﴾۔[5] ﴿يدعوا لمن ضره أقرب من نفعه لبئس المولى و لبئس العشير﴾[6]

مفسرین نے ان آیات میں "مولیٰ" کے معنی کی تفسیر اور اس کے معنی "اولیٰ" ہی ذکر کئے ہیں۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے "ايما امرأة نكحت بغير اذن مولاه فنكاحها باطل"[7]۔

---

(۱) سورۂ حدید، آیت ۱۵۔

(۲) سورۂ حج، آیت ۷۸۔

(۳) سورۂ محمد، آیت ۱۱۔

(٤) سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۰۔

(۵) سورۂ توبہ، آیت ۵۱۔

(٦) سورۂ حج، آیت ۱۳۔

(۷) ابو جعفر محمد بن الحسن طوسی، الاقتصاد الهادی الی طریق الرشاد (تہران: مکتبہ جامع چہل ستون، ۱٤۰۰ھ-ق)، ص۲۱۷۔ مسند احمد کے نقل کے مطابق، ج٦، ص٤٤؛ یہ بطریق، عمدة عیون صحاح الاخبار، ج۱، ص۱۵۹؛ ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد، المحلی، تحقیق: احمد محمد شاکر، (بیروت: دار الآفاق الحدیثہ)، ج۹، ص٤۷٤، مسألة۱۸۳۸۔

(جو عورت اپنے مولا کی اجازت کے بغیر، نکاح کرلے تو اس کا نکاح باطل ہے)، محدثین اور فقہاء نے اس حدیث میں مولیٰ کے معنی بھی عورت کا ولی اور سرپرست بیان کئے ہیں۔

علامہ امینی نے "لفظ مولا" کے ستائیس احتمالی معنی گنوائے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ بروز غدیر خطبۂ پیغمبر ﷺ میں ان معانی میں سے بعض معنی کا مراد لینا مستلزم کذب ہے اور بعض کا ارادہ کرنا مستلزم کفر ہے ، بعض دوسرے معنی کامراد لینا ناممکن اور بعض کا مراد لینا لغو اور بے فائدہ ، یا بالکل ہلکا اور سبک ، لہٰذا صرف اور صرف "اولیٰ بالشیئ" ہی مراد لیا جا سکتا ہے۔(۱)

اس کے بعد علامہ امینی نے ان چودہ جید علماء اور محدثین اہل سنت کی گفتگو کو بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے "خطبہ غدیر" میں لفظ مولیٰ سے اولیٰ بالشیء کے معنی مراد لیئے ہیں جن میں شمس الدین ابو المظفر سبط ابن جوزی حنفی (٦٥٤۔ ٥١١ ہجری قمری) بھی ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں:

"اہل سیرت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ واقعۂ غدیر حجۃ الوداع سے پیغمبر ﷺ کی واپسی کے موقع پر ۱۸ ذی الحجہ کو اصحاب کی کثیر تعداد اور ایک کثیر مجمع کے درمیان جنکی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی پیش آیا اور رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "جس کا میں مولا ہوں اس کے علی مولا ہیں"

اس کے بعد انھوں نے لفظ مولا کے دس احتمالی معنی ذکر کئے اور پھر اس کے نو معنی میں رد وقدح کرنے کے بعد صرف دسویں معنی یعنی وہی اولیٰ بالتصرف کے معنی کی تصدیق کی ہے اور اس کے لئے سورۂ حدید کی ۱۵ ویں آیت کو شاہد اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور تعبیر مولیٰ کو، حضرت علی کی امامت اور آپ کی اطاعت کو قبول کرنے کے بارے میں صریح اور واضح نص قرار دیا ہے۔(۲)

---

(۱) الغدیر، ج ۱، ص ۳۷۰۔ ۳٦۷۔

(۲) ۔۔۔فتعین الوجه العاشر و هو "الاولی" و معناه من کنت اولی به من نفسه فعلی اولی به فعلم ان جمیع المعانی راجعة الی الوجه العاشر ودل علیه ایضاً قوله صلی الله علیه وآله وسلم، الست اولی بالمؤمنین من أنفسهم و هذا نص صریح فی اثبات امامته و قبول طاعته۔۔۔ (تذکرۃ الخواص، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸۳ھ ـ ق)، ص ۳۳۔ ۳۰۔

اس کے بعد اس زمانے کے کچھ شعراء کے اشعار منجملہ حسان بن ثابت (جو خود واقعۂ غدیر میں موجود تھے) کے اشعار نقل کئے ہیں کہ انھوں نے کلمۂ مولیٰ سے لفظ "امام" سمجھا ہے اور اس کو اپنے اشعار میں نظم بھی کیا ہے۔

شواہد اور قرائن

خطبہ کے اندر اور اس سے الگ ایسے متعدد شواہد و قرائن بھی موجود ہیں جن سے معنیٰ مذکور کی تائید ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسئلہ حضرت علی کی دوستی اور محبت کے اعلان سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

الف: ایک لاکھ حاجیوں کو اس چلچلاتی دھوپ میں، صرف حضرت علی کی دوستی اور محبت کے اعلان کے لئے رکنے کا حکم دینا کوئی معقول بات نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کی برادری اور بھائی چارگی اور آپسی محبت کوئی ایسے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی جو مسلمانوں سے پوشیدہ ہو اور اس کے لئے پیغمبر ﷺ کو اعلان کی ضرورت پیش آئے خاص طور سے حضرت علی کی شخصیت سے دوستی اور محبت، کس سے پوشیدہ رہ سکتی ہے۔

ب: خطبے کا مقدمہ جو پیغمبر کی رحلت کے قریب ہونے کے بارے میں ایک طرح کی پیشین گوئی ہے آنحضر ﷺ ت کی جانشینی سے ارتباط اور مناسبت رکھتا ہے نہ کہ حضرت علی کی دوستی سے۔

ج: پیغمبر اسلا ﷺ م نے پہلے اپنے بارے میں "اولیٰ بالنفس" کی تعبیر استعمال کی اس کے بعد حضرت علی کو دوسروں سے اولیٰ ہونے کے طور پر پہچنوایا یہ مقارنت واضح اور روشن دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ ، حضرت علی کے لئے اسی مقام ولایت امر مسلمین کو ثابت کر رہے تھے جس منصب پر آپ خود فائز تھے*۔

---

* احمد بن حنبل نے اپنی مسند جلد۱، ص۱۱۹، پر اور ابن اثیر نے اسد الغابہ، ج۴، ص۲۸۔ پر ایک روایت نقل کی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "الست اولی من المومنین من انفسھم و ازواجی وأمّھاتھم" کیا میں مومنین پر ان کی جانوں کی بہ نسبت اولی بالتصرف اور مقدم نہیں ہوں اور کیا میری بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں۔ یہ بالکل واضح اور طے شدہ بات ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بیویوں کا مسلمانوں کی ماں ہونا، سورہ احزاب کی چھٹی آیت کے مطابق صرف حضرت سےمخصوص ہے جو آپ کے منصب سے مناسبت رکھتا اور اس مقام پر اس کو مسلمانوں کی جان و مال پر اولویت کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ پیغمبر ﷺ اپنے عہدہ نبوت کو پہچنوانا چاہتے تھے اور پھر اسی کے مثل یعنی حضرت علی کی ولایت اور خلافت کا اعلان کرنا مقصود تھا۔ واضح رہے کہ ابن کثیر کہ جس کا ایک خاص نظریہ اور عقیدہ ہے اور اس نے مذکورہ حدیث کو نقل کرنے کے بعد کسی وضاحت اور دلیل کے بغیر اس روایت کو ضعیف اور غریب کہا ہے۔ البدایہ والنہایہ، ج۵، ص۲۱۱۔ جبکہ اس کے پہلے راوی یعنی عبد الرحمان بن ابی لیلی علماء اہل سنت کے مطابق موثق ہیں اور یہ روایت دوسری سندوں سے بھی نقل ہوئی ہے۔ رجوع فرمائیں: الغدیر، ج۱، ص۱۷۸ ۔ ۱۷۷۔

د: خطبۂ پیغمبر ﷺ کے بعد مسلمانوں کا حضرت علی کو "مولائے مومنین" کے عنوان سے مبارکباد پیش کرنا یہ صرف امامت سے مناسبت رکھتا ہے۔ خداوند عالم کی طرف سے دین کے اکمال اور نعمت کے اتمام کا اعلان دوستی کے موضوع اور عنوان سے کسی طرح میل نہیں کھاتا ہے۔

و: حسان بن ثابت شاعر رسول خدا ﷺ اور اس زمانہ یثرب کا مشہور شاعر اور ادیب جو خود واقعۂ غدیر میں موجود تھا اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی اجازت سے پیغمبر ﷺ کے خطبہ کو نظم میں پیش کیا اور اس میں کلمۂ مولیٰ کو "امام" اور "ہادی" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ایک شعر:

و قال له قم یا علی فاننی

رضیتک من بعدی اماماً و ھادیاً

امیر المومنین نے معاویہ کو جو اشعار لکھ کر بھیجے تھے، اس میں اس طرح لکھا ہے:

واوجب لی ولایته علیکم

رسول اللہ یوم غدیر خم[۱]

---

(۱) مکمل طور سے ان قرائن اور شواہد کے بارے میں آگاہی کے لئے رجوع کریں: الغدیر، ج۱، ص۳۸۵۔ ۳۷۰؛ پیشوائی از نظر اسلام، جعفر سبحانی، ص۲۳۸۔ ۲۳۴۔

۴۔ ابن کثیر نے واقعۂ غدیر کو حضرت علی کے سفر یمن سے مربوط قرار دیا ہے جو حجۃ الوداع سے پہلے پیش آیا تھا اور اس میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ اس سفر میں حضرت علی نے اپنے ہم سفر ساتھیوں کے مال غنیمت میںبے جا اور غیر شرعی استعمال کی (قبل اس کے کہ اس کو رسول اسلام ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے) مخالفت کی تھی اور آپ کے ساتھی آپ کی اس عدالت پر رنجیدہ ہوئے تھے۔[۱] اسی بنا پر پیغمبر اسلام ﷺ نے غدیر خم میں حضرت علی کی فضیلت اور امانتداری اور عدالت کو بیان کیا اور آپ کے نزدیک جو قرب و منزلت ان کو حاصل تھی اس کو بیان کیا۔ اور بہت سارے لوگوں کے دلوں میں جو آپ کے تئیں کینہ و کدورت اور حسد تھا اسے ختم کیا۔[۲]

یہ تاویل اور توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یمن کے سفر سے متعلق، پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلی ملاقات میں حضرت علی کے ہم سفر ساتھیوں کا جواب مکے میں (حج سے پہلے) دیدیا تھا۔ اور فرمایا تھا: لوگ علی کی شکایت نہ کریں۔ خدا کی قسم وہ حکم الٰہی کے نافذ کرنے میں بہت سخت اور بے خوف ہیں۔[۳]

رسول خدا ﷺ کے اس صریحی بیان سے مسئلہ ان لوگوں کے لئے تمام ہوگیا جو آنحضرت ﷺ سے کچھ سننا چاہتے تھے اور پھر کوئی بات نہیں رہ جاتی کہ تین سو (۳۰۰) افراد[۴] کے لئے جو رنجش حضرت علی سے پیدا ہوگئی تھی اور اس کو آپ نے بھی دور کردیا تھا۔ دوبارہ اس کو پیغمبر اسلام ﷺ ایک لاکھ کے مجمع میں بیان فرماتے۔

---

(۱) اس واقعہ کی مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: واقدی، مغازی، ج۳، ص ۱۰۸۱؛ البدایہ والنہایہ، ج۵، ص ۲۰۹۔ ۲۰۸۔

(۲) فبین فیها فضل علی بن ابی طالب و براء ة عرضه مماکان تکلم فیه بعض من کان معه بأرض الیمن، بسبب ماکان صدر منه الیهم من المعدلة التی ظنها بعضهم جوراً و تضییقاً و بخلاً، و الصواب کان معه و ذکر من فضل علی و امانته و عدله و قربه الیه ما ازاح به ماکان فی نفوس کثیر من الناس منه (البدایہ والنہایہ، ج۵، ص ۲۰۸۔)

(۳) یا ایها الناس لاتشکوا علیاً فو الله انه لاخشن فی ذات الله او فی سبیل اللّه {من ان یشکی}۔ (تاریخ الامم والملوک، ج۳، ص ۱۶۸؛ (نہایۃ الارب فی فنون الأدب، ترجمۂ: محمود مہدوی دامغانی، ج۲، ص ۳۲۹؛ الدایہ والنہایہ، ج۵، ص ۲۰۹؛ رجوع کریں: ترجمۃ الامام علی من تاریخ مدینۃ دمشق، تالیف: حافظ ابن عساکر، تحقیق: الشیخ محمد باقر المحمودی (بیروت: دار التعارف للمطبوعات، ۱۳۹۵ھ۔ق)، ج۱، ص ۳۸۶۔

(۴) مورخین اور سیرت نگاروں نے یمن کی ماموریت میں حضرت علی کی سپہ سالاری کے ماتحت سپاہیوں کی تعداد تین سو (۳۰۰) افراد لکھی ہے۔ رجوع کریں: واقدی، مغازی، ج۳، ص ۱۰۱۹؛ طبقات الکبری، ج۲، ص ۱۶۹۔

۵۔ اگر حضرت محمد ﷺ نے حضرت علی کو غدیر میں امام بنایا ہوتا تو اصحاب آپ کے بعد آپ کے اس حکم کی مخالفت نہ کرتے اور آپ کی صریحی تاکید اور وصیت سے منہ نہ موڑتے کیونکہ آپ کے اصحاب صالح اور با ایمان لوگ تھے۔ جنھوں نے راہ اسلام میں اپنی جان اور مال کے ذریعے کامیاب امتحان دیا تھا لہذا یہ بہت ہی بعید بات ہے کہ اتنا عظیم واقعہ پیش آئے اور وہ لوگ اس کی مخالفت کر بیٹھیں خاص طور سے جبکہ آنحضرت ﷺ کی رحلت اور غدیر کے درمیان میں تقریباً ستر (۷۰) دنوں کا مختصر سا فاصلہ پایا جاتا ہے لہذا یہ بہت بعید ہے کہ اتنی جلدی لوگ ایسے واقعہ کو فراموش کر دیں۔

اس سوال کے جواب کے لئے اگر ہم رسول خدا ﷺ کے دور کے حادثات اور واقعات پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو اگرچہ اصحاب کے روحانی مراتب اور درجات مجموعی طور سے اپنی جگہ پر مسلم ہیں مگر پھر بھی پیغمبر اکرم ﷺ کے فرمان سے سرپیچی کرنا ان لوگوں کے درمیان کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ اس دور میں بھی کچھ مسلمانوں کا ایمان ایسا ناپختہ تھا کہ وہ لوگ خدا و پیغمبر ﷺ کے احکام کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے خاص طور پر جب پیغمبر ﷺ کا حکم ان کے ذاتی مفادات، قبیلہ کے رسم و رواج اور ان کے سیاسی افکار سے میل نہیں کھاتا تھا تو پھر وہ لوگ ایک طرح سے اپنی رائے اور اجتہاد کے ذریعہ یہ کوشش کرتے تھے کہ پیغمبر ﷺ کی رائے کو تبدیل کردیں ورنہ خود ہی اس پر عمل پیرا ہونے میں کوتاہی کرتے تھے اور بسا اوقات آپ کے اوپر اعتراض بھی کرتے تھے۔ اس طرح کے حادثات اور مخالفتوں کے نمونے، جیسے صلح حدیبیہ میں صلح نامہ لکھتے وقت، حجۃ الوداع میں احرام سے خارج ہونے کا مسئلہ، لشکر اسامہ کی روانگی اور حیات پیغمبر ﷺ کے آخری ایام میں قلم و دوات جیسے مشہور واقعات بھی تاریخ میں ثبت ہیں ایسے تمام واقعات کو علامہ سید شرف الدین نے اپنی گراں قدر کتاب "النص و الاجتہاد" میں ذکر فرمایا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات، پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم کی پیروی کے واجب و لازم ہونے کے اوپر تاکید کرتی ہیں اور اس کو ایمان کا جز قرار دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اس خطرہ کی طرف متوجہ بھی کیا ہے کہ حکم پیغمبر ﷺ سے سرپیچی یا آپ کے اوپر سبقت نہ کریں اور یہ امید نہ رکھیں کہ پیغمبر ﷺ ، ان کی اطاعت کریں گے۔ مندرجہ ذیل آیات سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی پیغمبر ﷺ کی مخالفت ہوتی رہتی تھی جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ أن تصیبھم فتنة او یصیبھم عذاب الیم﴾(١)

"جو لوگ حکم خدا کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس امر سے ڈریں کہ ان تک کوئی فتنہ پہنچ جائے یا کوئی دردناک عذاب نازل ہوجائے"

﴿یاایھا آمنوا لاتقدموا بین یدی اللہ و رسولہ و اتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم﴾(٢)

"ایمان والو! خبردار خدا و رسول کے سامنے اپنی بات کو آگے نہ بڑھاؤ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ ہر بات کا سننے والا اور جاننے والا ہے"

﴿واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم﴾(٣)

"اور یاد رکھو کہ تمہارے درمیان خدا کا رسول موجود ہے یہ اگر بہت سی باتوں میں تمہاری بات مان لیتا تو تم زحمت میں پڑ جاتے"

﴿و ما کان لمومن و لا مومنة اذا قضی اللہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم و من یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالاً بعیداً﴾(٤)

"اور کسی مومن مرد یا عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا و رسول کسی چیز کا فیصلہ کردیں (یا کوئی حکم دیں) تو وہ بھی اپنے امر کے بارے میں صاحب اختیار بن جائے اور جو بھی خدا و رسول کی نافرمانی

---

(١) سورۂ نور، آیت ٦٣۔

(٢) سورۂ حجرات، آیت ١۔

(٣) سورۂ حجرات، آیت ٧۔

(٤)سورۂ احزاب، آیت ٣٦۔

کرتا ہے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے"

﴿و ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ فلا و ربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیماً﴾(۱)

"اور ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا ہے مگر صرف اس لئے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے پس آپ کے پروردگار کی قسم کہ یہ ہرگز صاحب ایمان نہ بن سکیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حَکَم نہ بنائیں۔ اور پھر جب آپ فیصلہ کردیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلہ کے سامنے سراپا تسلیم ہوجائیں"

﴿یأ ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ و لاتولوا عنہ و انتم تسمعون﴾(۲)

"ایمان والو! اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو جب کہ تم سن بھی رہے ہو"

ان تمام باتوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر چہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے بے پناہ محنت و مشقت اور زحمتیں اٹھا کر قبیلہ یا قوم پرستی کے نظام اور اس کے خطرناک اثرات جیسے قبیلہ جاتی تعصب، ایک دوسرے سے رقابت، یا قبیلوں کے درمیان میں رقابتیں جو خوددور جاہلیت کے لوگوں کے لئے ایک دردسر تھا، ان سب کو ختم کردیا تھا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یہ تمام رسم و رواج بعض مسلمانوں کے اندر اسی طرح چھپے ہوئے تھے جس طرح سے راکھ کے نیچے آگ دبی ہوتی ہے اور اسی لئے مختلف اوقات میں وہ ابھر کے سامنے آجاتے تھے۔

جیسا کہ پیغمبر ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد اوس اور خزرج دونوں قبیلے والوں نے اپنے پرانے قبیلہ جاتی

---

(۱)سورۂ نسائ، آیت۶۵۔ ٦٤۔

(۲) سورۂ انفال، آیت ۲۰۔

نظام کو زندہ کردیا اوردونوں طرف سے یہ آوازیں بلند ہوگئیں "نحن الامراء و انتم الوزراء و منا امیر و منکم امیر"ہم لوگ حاکم اور امیرہیں اور تم لوگ وزیر ہو یا ایک امیر اور حاکم ہمارے درمیان سے ہوجائے اور ایک امیر و حاکم تمہارے درمیان سے ہوجائے۔[1] جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق "میں اور ہم" کی حدوں کو قبیلوں کی سرحدوں سے اٹھا دیا گیا تھا اور سب کے سب ایک "ہم" کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ایمانی بھائی تھے جیسا کہ ارشاد ہے "انما المومنون اخوة"

اس بنا پر یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ چاہے کتنی ہی خوش فہمی اور حسن ظن کیا جائے پھر بھی قریش کے بعض سیاسی لوگ مکہ کے زمانہ کی طرح بنی ہاشم سے رقابت کا احساس رکھتے تھے اور اس طرح کے معیاروں کی بنا پر انھیں ایک ہاشمی کی خلافت قبول نہیں تھی۔

٦۔ سورۂ مائدہ کی تیسری اور ٦٧ ویں آیت کی شان نزول کے بارے میں کتب تفسیر و حدیث میں دوسرے اور بھی احتمالات ذکر کئے گئے ہیں لیکن ان کی اسناد اوردوسرے فراوان شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ دو آیتیں غدیر خم میں نازل ہوئیں ہیں۔[2]

ان دونوں آیتوں کا مضمون بھی گواہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کا تعلق پیغمبر ﷺ کے بعد امت کی رہبری اور امامت جیسے اہم کام سے ہے اور وہ دوسرے واقعات جنھیں بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے ان سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہے مثلاً تیسری آیت میں مندرجہ ذیل جن چار باتوں کی تاکید کی گئی ہے اور اس میں ان پر تکیہ کیا گیا ہے یہ صرف امامت ہی سے مناسبت رکھتی ہیں۔

الف: کفار کی مایوسی کیونکہ وہ لوگ یہ تصور کرتے تھے کہ اسلام صرف اور صرف پیغمبر ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کی زندگی تک باقی ہے اور آپ کی وفات کے بعد اسلام کی بساط خود بخود الٹ جائے گی لیکن حضرت علی جیسی ایک مضبوط، مستحکم، عادل اور برجستہ شخصیت کی جانشینی کے اعلان کے بعد یہ طے ہوگیا کہ

---

(١) ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ و السیاسۃ (قم: منشورات الشریف الرضی)، ص٢٥۔ ٢٤۔

(٢) اس مضمون سے مزید آگاہی کے لئے، رجوع کریں: الغدیر، ج١، ص٢٤٧۔ ٢١٤۔

اسلام باقی رہے گا لہٰذا وہ لوگ اس سے مایوس ہو گئے۔

ب: تکمیل اسلام، کیونکہ پیغمبر ﷺ کا جانشین معین ہوئے بغیر اور امت کی رہبری کا سلسلہ جاری رہے بغیر یہ دین و مذہب منزل تکمیل تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔

ج: تکمیل رہبری کے تسلسل کے ساتھ، ہدایت کی نعمت کا اتمام۔

د: خداوندعالم کی طرف سے اسلام کی تکمیل کے اعلان کے علاوہ اس کو آخری مذہب اوردین قرار دیا جانا۔[۱]

لشکر اسامہ

پہلے آپ پڑھ چکے ہیں کہ ۸ھ میں جنگ موتہ میں اسلامی فوج کے ایک سپہ سالار جناب زید بن حارثہ بھی تھے اور اس میں مسلمانوں کو رومیوں سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اوراس لشکر کے تینوں سردار سمیت بعض دوسرے اسلامی سپاہیوں نے بھی جام شہادت نوش کیا تھا۔

۹ ھ میں بھی رسول خدا نے سرزمین تبوک تک اسلامی فوج کے ساتھ پیش قدمی کی تھی لیکن وہاں کوئی جنگ نہیں ہوئی اور آپ کا یہ اقدام ایک قدرتمند فوجی مشق کی حدتک ہی رہ گیا اسی لئے گزشتہ واقعات کی بنا پر شہنشاہ روم کی دشمنی اور اس کی فوجی قدرت و طاقت آپ کے لئے ہمیشہ ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی اور آپ مسلسل رومیوں سے ٹکراؤ اور جنگ کے بارے میں متفکر رہتے تھے اسی بنا پر جب آپ حجۃ الوداع سے لوٹ کر مدینہ واپس آئے تو آپ نے زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کی سپہ سالاری میں ایک لشکر منظم کیا اور ایک فوج بنائی اوران کو یہ حکم دیا کہ سرزمین

---

(۱) اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے اور سورۂ مائدہ کی ان دو آیتوں کے درمیان ایک آیت کے فاصلہ کے بارے میں اور یہ کہ، یہ تیسری آیت حرام گوشت کے احکام سے متعلق ہے اور یہ ولایت کے مسئلہ سے مناسبت نہیں رکھتی ان تمام چیزوں کے بارے میں رجوع کریں تفسیر نمونہ، ج٤، ص ٢٧١۔ ٢٦٣۔

"اُبنیٰ" * جوان کے والد کی شہادت کی جگہ ہے وہاں تک پیش قدمی کریں اور رومیوں سے جنگ کریں۔

رسول خدا ﷺ نے فوج کی سربراہی کا پرچم اسامہ[۱] کے حوالے کیا اور ان کو فوجی اور نظامی احکامات کے متعلق نصیحتیں بھی کیں، انھوں نے مقام جُرف * کو اپنی فوج کے قیام کے لئے منتخب کیا تاکہ باقی فوج بھی وہاں آکر جمع ہو جائے۔[۲]

اس فوج میں انصار و مہاجرین کے کچھ شناختہ اور مشہور و معروف افراد جیسے ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ جراح، سعد بن ابی وقاص[۳]، عبد الرحمان بن عوف، طلحہ، زبیر، اسید بن حضیر، بشیر بن سعد[٤] (ابو الاعور) سعید بن زید[٥]، قتادہ بن نعمان اور سلمہ بن اسلم[٦]، بھی موجود تھے۔

---

* ابنی، دنیا کے وزن پر ہے۔ سرزمین شام کا ایک علاقہ ہے جو عسقلان اور رملہ کے درمیان، موتہ سے نزدیک ہے۔ (حلبی، السیرۃ الحلبیہ (بیروت: دار المعرفہ)، ج۳، ص۲۲۷)۔

(۱) اسامہ کا سن اس وقت ۱۷ ، ۱۸ یا ۱۹ سال لکھا ہے اور کسی تاریخ میں بھی ان کا سن ۲۰ سال سے زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔

* شام کی جانب مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے۔

(۲) ابن سعد، طبقات الکبری، (بیروت: دار صادر)، ج۲، ص۱۹۰؛ شیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، تالیف حافظ ابن عساکر (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱٤۰۷ھ-ق)، ج ۱، ص ۱۲۱؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ والآثار المحمدیہ، ج۲، ص۱۳۸؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص۲۲۷۔

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۹۰؛ حلبی، السیرۃ الحلبیہ، (بیروت: دار المعرفہ)، ج۳، ص۲۲۷؛ زینی دحلان، السیرۃ النبویہ و الآثار المحمدیہ، ج۲، ص۱۳۸۔

(٤) ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم، دار الکتب العربیہ، ج٦، ص٥۲؛ سقیفۂ ابوبکر احمد بن عبد العزیز جوہری کے نقل کے مطابق۔

(٥) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۹۰؛ شیخ عبد القادر بدران، تہذیب تاریخ دمشق، تالیف حافظ ابن عساکر، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱٤۰۷ھ-ق)، ج۱، ص۱۲۱۔

(٦) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، ص۱۹۰؛ تقی الدین احمد بن علی مقریزی، امتاع الاسماع، تحقیق: محمد عبد الحمید النمیسی (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ط ۱، ۱٤۲۰ھ-ق)، ج۲، ص۱۲٤؛ تہذیب تاریخ دمشق، ج۱، ص۱۲۱۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے جب اسامہ کی فوج کو حرکت کرنے کا حکم دیا تھا اس وقت تک آپ بالکل صحت مند اور تندرست تھے لیکن اگلے ہی دن آپ کو بخار عارض ہوا اور بالآخر یہی آپ کے مرض الموت میں تبدیل ہوگیا۔ بستر بیماری پر رسول خدا ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ کچھ لوگ اسامہ کی کم عمری کی بنا پر ان کی سپہ سالاری پر معترض ہیں اسی لئے ابھی اسامہ کی فوج مدینہ سے حرکت نہیں کرپائی ہے. رسول خدا ﷺ اسی بیماری کی حالت میں اور رنج والم کے ساتھ مسجد میں تشریف لے گئے اور ایک خطبہ میں لوگوں کواسامہ کی فوج کے ساتھ تعاون اور ان کے ساتھ روانہ ہونے کی ترغیب دلائی اور فرمایا:

ایہا الناس! اے لوگو! یہ کیا باتیں ہیں جو میں نے اسامہ کی سپہ سالاری کے بارے میں بعض لوگوں سے سنی ہیں؟ آج تم اسامہ کی سپہ سالاری کے بارے میں گلہ مند ہو اور اس سے پہلے ان کے والد کی

سپہ سالاری کے بارے میں بھی تمہیں گلہ تھا جب کہ خدا کی قسم زید، سپہ سالاری کے لائق تھے اور ان کا بیٹا بھی ان کے بعد اس منصب کے لائق اور اس کا سزاوار ہے۔ الخ۔(۳)

رسول خدا ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں آپ کی صحت بہت ہی زیادہ ڈھل گئی اور آپ پر مسلسل غش طاری ہو رہا تھا جب ایک بار آپ کو بے ہوشی سے افاقہ ہوا تو آپ نے لشکر اسامہ کے بارے میں پوچھا، تو لوگوں نے کہا کہ روانگی کے لئے تیار ہو رہاہے۔ حضرت ﷺ نے فرمایا کہ: "اسامہ کی فوج کو

---

(۳) ابن سعد، گزشتہ حوالہ، مقریزی، گزشتہ حوالہ، ج۲، ص۱۲٤؛ زینی دحلان، گزشتہ حوالہ؛ شیخ عبدالقادر بدران، گزشتہ حوالہ؛ حلبی، گزشتہ حوالہ، ص۲۲۸۔ بخاری اور مسلم میں رسول خدا ﷺ کا فرمان اس طرح سے نقل ہوا ہے:

"ان تطعنوا فی امارتہ فقد کنتم تطعنون فی امارۃ ابیہ من قبل و ایم اللہ ان کان لخلیقا للامارۃ وان کان لمن احب الناس الی و ان ھذا لمن احب الناس الی بعد"۔ (صحیح بخاری، تحقیق: شیخ قاسم الشماعی الرفاعی، (بیروت: دار القلم، ۱٤۰۷ھ-ق)، ج٦، ص۳۲٦؛ المغازی، باب ۲۰۳، حدیث۹؛ صحیح مسلم، بشرح النووی، (قم: دار الفکر، ۱٤۰۱ھ-ق)، ج۱۵، فضائل الصحابۃ، ص۱۹۵۔)

روانہ کرو خدا ان لوگوں پر لعنت کرے"[۱] جو اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہ جائیں، پیغمبر ﷺ کی ان تمام تاکیدوں کے بعدچودہ روز تک جن میں آپ مریض رہے[۲] مختلف لوگوں کے متعدد بہانوں کی وجہ سے اسامہ کی فوج کی روانگی اسی طرح تعطل کا شکار رہی اور اس فوج نے حرکت نہیں کی یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ کی رحلت ہوگئی، جیسا کہ ہم نے غدیر خم کے واقعہ کے ذیل میں وضاحت کی تھی کہ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض مسلمان پیغمبر ﷺ کے صریحی احکام اور فرامین سے سرپیچی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

پیغمبر ﷺ کا اعلیٰ مقصد

اسامہ کی فوج کو روانہ کرنے کے لئے پیغمبر ﷺ کی مسلسل کوششوں اور محنتوں کے اندر بعض اہم نکات اور موضوعات پائے جاتے ہیں جن کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔

۱۔ اتنی عظیم اسلامی فوج کو روانہ کرتے وقت اس کی سپہ سالاری ایک ایسے سردار کے حوالے کرنا جس کی عمر بیس سال سے کم تھی جبکہ یہ فوج اس وقت کے قوی ترین دشمن اور اسلامی دارالحکومت سے بہت دور اور حساس علاقہ میں جنگ کے لئے بھیجی جارہی تھی۔

۲۔ اس فوج میں اسامہ کی سپہ سالاری کے تحت ایسے تجربہ کار اور ماہرین جنگ سپہ سالار اور کمانڈر بھی رکھے گئے تھے نیز اس میں ایسے قبیلوں کے سردار اور پیغمبر ﷺ کے مشہور اصحاب بھی موجود تھے جو اپنے

---

(۱) "جهزوا جيش اسامة، لعن الله من تخلف عنه۔ (محمد بن عبد الكريم شهرستانى (قم: منشورات الشريف الرضى)، ص۲۹؛ اگرچہ شہرستانی نے اس گروہ کے بارے میں رسول خدا کی لعنت کو حدیث مرسل کہا، لیکن ابی الحدید، ابوبکر احمد بن عبد العزیز جوہری نے "سقیفہ" کتاب میں اس لعنت کو حدیث مسند کے طور پر عبداللہ بن عبد الرحمان سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت نے کئی مرتبہ فرمایا: انفذ وابعث اسامہ، لعن اللہ من تخلف عنہ (شرح نہج البلاغہ، ج٦، ص ٥٢)۔

(۲) ابو واضح، تاریخ یعقوبی (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۲۳۸٤ھ۔ق)، ج۲، ص۱۷۸۔

کو مقام و منزلت اور ایک خاص عظمت کا حامل سمجھتے تھے اور وہ لوگ اس نوجوان سپہ سالار کا یہ منصب خود حاصل کرنے کے لئے تیاری کر رہے تھے۔

۳۔ پیغمبر اسلا ﷺ م اگرچہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ اب یہ آپ کی عمر مبارک کے آخری ایام ہیں (اور خطبۂ غدیر میں آپ نے اس کی طرف اشارہ بھی فرما دیا تھا) اور اسی کے ساتھ تاریک فتنہ اور خطرناک حوادث کے بادل امت اسلامیہ کے سر پر منڈلا رہے ہیں آپ نے اسلامی فوج کو ایک دور ترین خطے کی طرف روانہ فرمایا اور انصار و مہاجرین کے سر کردہ افراد کو ان کے ساتھ کردیا آپ کی اس تدبیر اور دور اندیشی اور الٰہی سیاست کو نظر میں رکھنے کے بعد اس میں کوئی تردید نہیں رہ جاتی کہ آپ نے اتنے عظیم اقدام کو یقیناً کسی اہم مقصد کے لئے انجام دیا تھا کہ ان تمام مشکلات اور خطرات کو سہہ لینا اس کے مقابلہ میں بہت آسان تھا۔

ان تمام نکات کی تحقیق اور ان پر توجہ کرنے کے بعد بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ رومیوں سے فوجی ٹکراؤ کے علاوہ آپ کی نظر میں دو اہم مقصد اور بھی تھے۔

(الف) پیغمبر ﷺ نے اسامہ کو اسلامی لشکر کا سپہ سالار اس لئے بنایا تھا تاکہ مسلمانوں کو عملاً اس حقیقت کی طرف متوجہ کردیں کہ کسی عہدے اور مقام تک پہنچنے کے لئے صلاحیت اور لیاقت معیار ہوتی ہے اور کسی کی کم عمری اور جوانی سے اس کی لیاقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جس طرح کسی انسان کے سن کی زیادتی سے اس کے اندر لیاقت پیدا نہیں ہوجاتی اسی لئے پیغمبر اسلا ﷺ م نے اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب دیا تھا کہ: "زید بھی سپہ سالاری کے لائق تھے اور اب ان کا بیٹا ان کے بعد اس منصب کے لائق ہے"

پیغمبر اسلا ﷺ م نے اپنے اس واضح اور دو ٹوک بیان سے اسامہ کی لیاقت اور شائستگی کو واضح کردیا اور جو لوگ عمر کی زیادتی یا قبیلہ وغیرہ کو ایسے عہدے اور مقام میں دخیل سمجھتے ہیں ان کے باطل افکار کی وضاحت فرمادی ۔ کیا اس کے علاوہ اس کی اور کوئی وجہ ہوسکتی ہے کہ آپ نے اسامہ کی سپہ سالاری کے

بارے میں جو اتنی تاکید کی تھی اس کے ذریعہ آپ عملاً حضرت علی کی خلافت کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے اور جو لوگ حضرت علی کی جوانی کو بہانہ بنا کر خلافت سے متعلق آپ کی لیاقت اور صلاحیت کے بارے میں انگلی اٹھانا چاہتے تھے آپ ان کا جواب دے رہے تھے۔

(ب) پیغمبر ﷺ کا ارادہ یہ تھا کہ آپ کی وفات کے وقت حضرت علی کے وہ سیاسی رقباء جن کے دل میں خلافت کی لالچ تھی مدینہ سے دور رہیں (اسی لئے مہاجرین و انصار کے چنندہ افراد کو آپ نے اسامہ کی فوج میں شامل کیا تھا تاکہ ان لوگوں کے جانے کے بعد ان کے عدم موجودگی میں حضرت علی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور مخالفین کے لئے کوئی صورت باقی نہ رہے اور جب وہ لوگ میدان جنگ سے واپس پلٹیں تو حضرت علی کی حکومت مستحکم ہوچکی ہو۔[1]

اسی سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیغمبر کی اتنی تاکید اور اصرار کے باوجود بھی کچھ لوگ اسامہ کے ساتھ جانے سے کیوں جان چرا رہے تھے؟ اور آج یا کل پر ٹال مٹول کے ذریعہ، انھوں نے لشکر اسامہ کو روانہ ہونے سے کیوں روک دیا؟ یہاں تک کہ رسول اللہؐ ﷺ کی وفات ہوگئی۔

---

(۱) ابن ابی الحدید، (۶۵۶ھ) نے اس تحلیل پر جو ناقابل قبول تنقید کی ہے (شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۱۶) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کی یہ تحلیل قدیم زمانہ سے مورخین کے درمیان پائی جاتی تھی۔

وہ وصیت نامہ جو لکھا نہ جاسکا!

پنجشنبہ کے دن (رحلت سے چار دن پہلے) جب پیغمبر ﷺ بستر علالت پر تھے آپ نے فرمایا: "قلم اور کاغذ لے آؤ تاکہ میں تمہارے لئے کچھ لکھ دوں جس سے تم لوگ میرے بعد گمراہ نہ ہو" حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا آپ کے اوپر درد اور مرض کا غلبہ ہے اور آپ ہذیان بک رہے ہیں قرآن ہمارے پاس ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ اسی دوران حاضرین کے درمیان اختلاف ہوگیا بعض لوگوں نے اُس کی بات کی تائید کی اور کچھ لوگ پیغمبر ﷺ کے فرمان کی تائید کر رہے تھے اسی میں شور و ہنگامہ بڑھتا گیا

اسی دوران پیغمبر ﷺ سے کہا: آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے آپ نے فرمایا: "یہ سب کچھ ہونے کے بعد؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو (جو مجھے درد و غم اور تکلیف ہے) مجھے اسی حالت پر رہنے دو اور تم لوگ میرے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو (میری طرف ہذیان کی جو نسبت دے رہے ہو) میری یہ حالت اس سے کہیں بہتر ہے، یہاں سے باہر نکل جاؤ"۔

جو کچھ آپ نے پڑھا یہ اس قصے کا خلاصہ ہے جو اہل سیرت اور محدثین نے پیغمبر ﷺ کی عمر کے آخری ایام کے واقعات کے ذیل میں نقل کیا ہے۔[۱]

اگرچہ یہ واقعہ بعض کتابوں میں تحریف کر کے یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے کچھ لوگوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا نام ہی غائب کردیا، یا صرف اس کی بات کے مضمون کو نقل کیا ہے اور بعض اوقات اس کی طرف سے عذر تراشی کی کوشش کی گئی ہے لیکن تمام شواہد و قرائن اس بات کے گواہ ہیں کہ پیغمبر کا یہ اقدام در اصل اپنی جانشینی کے لئے حضرت علی کی شناخت کرانا اور مسلمانوں کو رہبری اور قائد کے بغیر نہ چھوڑ دینے کے سلسلے کی ایک کڑی تھی اور اگر بعض حاضرین نے کسی نہ کسی طریقے سے آپ کو وصیت نامہ لکھنے نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ آپ کیا تحریر کرنا چاہتے ہیں۔

جیساکہ عبد اللہ بن عباس اس نکتہ پر توجہ اور مذکورہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد افسوس بھرے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں۔ (پنجشنبہ کا دن کتنا دردناک تھا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: "میرے لئے کاغذ اور دوات لے آؤ تاکہ تمہارے لئے کچھ لکھ دوں اور تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو لیکن انھوں نے

---

(۱) نمونہ کے طور پر ملاحظہ کریں: صحیح بخاری، تحقیق: الشیخ قاسم السماعی الرفاعی؛ (بیروت: دار القلم، ط ۱، ۱۴۰۷)، ج ۱، کتاب العلم، باب کتابۃ العلم (باب ۸۲،)، ج ۱۲، ص ۱۲۰ و ج ۶؛ المغازی، باب ۱۹۹، ص ۳۱۸۔ ۳۱۷؛ صحیح مسلم، بشرح النووی، ج ۱۱، باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شیء یوصی فیہ، ص ۸۹؛ طبقات الکبری، (بیروت: دار الصادر)، ج ۲، ص ۲۴۲، ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ابوبکر جوہری کے نقل کے مطابق۔

نہیں سنا....."[1] کیونکہ یہ واقعہ بہت مشہور بلکہ تاریخ اسلام کے مسلمات میں سے ہے اور گزشتہ اور موجودہ تمام لوگوں نے اس کو نقل کیا ہے اور کافی حدتک اس کے بارے میں بحث کی ہے لہٰذا اسی مقدار پر ہم اکتفا کر رہے ہیں اور اس کے بارے میں مزید تحقیق و جستجو اور اس سے متعلق عذر تراشیوں پر تنقید یا بعض ابہامات کا جواب دینے یا اس بارے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کو ذکر کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے لئے اس کی متعلقہ کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔[2]

پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت

پیغمبر اسلام ﷺ ۲۳ سال تک الٰہی پیغام کو پہنچا کر اور اس راہ میں مسلسل دعوت و جہاد اور اپنی رسالت کی انجام دہی کے راستے میں مختلف نشیب و فراز سے گزر کر آخر کار روز دوشنبہ ۲۸ صفر ۱۱ ھ[3] کے دن ۱٤

---

(۱)"لما اشتد النبی ﷺ وجعه قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتاباً لاتضلوا بعده قال عمر ان النبی ﷺ غلبه الوجع و عندنا کتاب الله حسبنافاختلفوا و کبر اللغط قال قوموا عنی ولاینبغی عندی التنازع فخرج ابن عباس یقول ان الرزیة کال الرزیة ماحال بین رسول الله ﷺ و بین کتابه۔(صحیح بخاری، ج۱، ص۱۲۰؛ رجوع کریں: الطبقات الکبری، ج۲، ص۲٤٤۔)

(۲) مثال کے طور پر ذکر شدہ کتب کی طرف رجوع کریں: الطرائف، ابن طاووس، علی بن موسی، (قم: مطبعۃ الخیام)، ج۲، ص٤۳۵۔ ٤۳۱؛ النص والاجتہاد، شرف الدین، سید عبد الحسین موسوی (بیروت: دار النعمان، ط۳، ۱۳۸٤ھ۔ق)، ص۱۷۷۔ ۱٦۲؛ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، (قم: مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، ط۵، ۱۳٦۸)، ج۲، ص۵۰۰۔ ٤۹۳؛ مصطفوی، حسن الحقائق فی تاریخ الاسلام والفتن والاحداث، ص ۱۳۵۔ ۱۲۹؛ یوسف غلامی، پس از غروب (قم: دفتر نشر معارف، ج۱، ۱۳۸۰)، ص۵۳۔ ۳۸۔ محمد حسین ھیکل، حیات محمد (قاہرہ: مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ط۸، ۱۹٦۳)، ص۵۰۱؛ شرح امام نووی بر صحیح مسلم (طبع شدہ با اصل صحیح مسلم) ج۱۱، ص۹۳۔ ۸۹۔

(۳) محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۵ھ۔ق)، ج۲۲، ص۵۱٤، تاریخ وفات رسول اکرم ﷺ کے بارے میں دوسرے اقوال بھی نقل ہوئے ہیں۔ رجوع کریں: گزشتہ حوالہ، ص ۵۲۱۔ ۵۱٤؛ ابن سعد، طبقات الکبری، ج۳، ص۲۷٤۔ ۲۷۲؛ السیرۃ الحلبیۃ، ج۳، ص٤۷۳۔

روز بیمار[۱] رہنے کے بعد عالم بقا کی طرف رحلت فرما گئے اور مسجد کے برابر میں آپ کا جو حجرہ تھا اسی میں آپ کو دفن کیا گیا بعد میں جب بعض خلفاء کے دور میں اس مسجد کی توسیع کی گئی تو آپ کا مرقد مطہر مسجد (مشرقی سمت) میں شامل ہوگیا۔

اگرچہ ہجرت کے کچھ دنوں بعد مسلمانوں کی مالی حالت اور خود پیغمبر ﷺ کی مالی حالت بھی بہتر ہوگئی تھی اور آپ کے مخصوص اموال (اموال خالصہ) اور دوسری آمدنی کے ذرائع بھی آپ کے پاس موجود تھے اور آپ کی ظاہری قدرت و طاقت اور روحانی نفوذ میں بے حد اضافہ ہوچکا تھا لیکن آپ کی ذاتی زندگی میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی تھی اور آپ مسجد کے برابر میں اپنے حجرے میں اسی طرح سادگی کے ساتھ رہتے تھے نہ آپ نے کوئی مال جمع کیا تھا، نہ لوگوں کی طرح آپ کے پاس کوئی بڑا گھر تھا آپ کا وہ بستر جس پر آپ آرام فرماتے تھے وہ بھی ایک چمڑے کا بستر تھا جس کے اندر کھجور کی پتیاں بھری ہوئی تھیں،[۲] چٹائی کے اوپر نماز پڑھتے تھے اور اکثر اوقات اسی چٹائی اور بوریئے کے اوپر آرام کرتے تھے جس کے نشان آپ کے چہرے یا بدن پر نمایاں ہو جاتے تھے۔[۳] آپ نے اپنی عمر کے آخری ایام میں یہ حکم فرمایا کہ بیت المال کے وہ چند دینار جو آپ کی ایک زوجہ کے پاس بچے ہوئے تھے ان کو غرباء میں تقسیم کردیا جائے۔[٤] آپ نے اسی طرح سادگی سے زندگی گزاری اور بالآخر اپنے سادے حجرے میں دنیا سے تشریف لے گئے لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک عظیم دین ایک آسمانی کتاب اور ایک موحد اور خدا پرست امت کو اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا اور دنیا کی تاریخ میں ایک نئے تمدن اور ثقافت کی بنیاد رکھی۔

---

(۱) ابن واضح، تاریخ یعقوبی، (نجف: المکتبۃ الحیدریہ، ۱۳۸٤ھ-ق)، ج۲، ص۱۷۸۔

(۲) حلبی، السیرۃ الحلبیہ، ج۳، ص٤٥٤۔

(۳) گزشتہ حوالہ۔

(٤) ابن سعد، طبقات الکبری، ج۲، ص۲۳۹۔ ۲۳۷۔

رحلت پیغمبر ﷺ کے وقت اسلامی سماج، ایک نظر میں

پیغمبر اسلا ﷺ م نے مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ میں قیام کر کے وہاں کے آزاد اور معاون ماحول سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی معاشرے کی سنگ بنیاد رکھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے راستوں سے رکاوٹوں کو ہٹاتے چلے گئے اسلامی امت کو ایک دینی اور سیاسی شناخت عطا کی اور الٰہی پیغام کو مکمل طور سے لوگوں تک پہنچا دیا اور جس وقت آپ نے رحلت فرمائی آپ اپنی رسالت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے تھے اور درخشندہ اور روشن کامیابیاں آپ کے قدم چوم رہی تھیں لیکن اس کے باوجود اس وقت کے معاشرے میں کچھ مخصوص حالات اور افکار پھیلے ہوئے تھے جن میں سے اہم چیزوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ جیساکہ اشارہ کیا جاچکا ہے کہ پیغمبر اسلا ﷺ م نے اسلامی تعلیم کے سایہ میں عرب کے مختلف اور پراگندہ قبیلوں کو (جن کا کام ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا تھا) ایمان اور عقیدے کے مشترک رشتے کی بنا پر ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور ان کے درمیان میں دینی بھائی چارا (عقد مواخات) قائم کردیا۔ ماضی کی پراکندہ قوم اور افراد کو امت واحدہ میں تبدیل کردیا اور آپ نے انھیں لوگوں کی مدد سے الٰہی حکومت تشکیل دی جس کی رہبری کے فرائض آپ خود انجام دے رہے تھے۔ آپ کا دار الحکومت اور مرکز شہر مدینہ تھا، اس حکومت میں وہ مسائل اور سماجی باتیں جن کے بارے میں خدا کی طرف سے نص موجود نہیں تھی مسلمانوں کی رائے اور مشوروں سے حل ہوتے تھے، ان کے پاس مکمل طور سے آزادیٔ رائے پائی جاتی تھی عربوں نے اسلام کے سایہ میں پہلی بار اس قسم کی وحدت، قدرت اور معنویت کو قریب سے دیکھا تھا لیکن اس کامیابی کو اسی طرح باقی رکھنے کے لئے ایسے ہی مقتدر، شائستہ اور لائق رہبر اور قائد کی ضرورت تھی جو پیغمبر اسلا ﷺ م کے بعد نظام امت و امامت پر بھروسہ کرتے ہوئے خود پیغمبر ﷺ کی طرح اسلامی معاشرے کو معنوی اور سیاسی دونوں لحاظ سے آگے بڑھا سکے۔

۲۔ پیغمبر ﷺ کی رحلت کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب سے تقریباً بت پرستی کا خاتمہ ہوچکا تھا اگرچہ جزیرۃ العرب کے باہر کوئی فتح نہیں ہوئی تھی لیکن پیغمبر ﷺ کی عالمی دعوت اور تبلیغ کی بنا پر اسلام کا پیغام دنیا کے شہنشاہان مملکت کے کانوں تک پہونچ چکا تھا لیکن خود جزیرہ نمائے عرب میں وہ بہت سے لوگ جو پیغمبر ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں مسلمان ہوئے تھے (خاص طور سے فتح مکہ اور جنگ تبوک کے بعد) وہ صرف اور صرف ظاہری طور اسلام لائے تھے کیونکہ انھوں نے اسلامی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے اسلام قبول کیا تھا ان میں سے اکثر لوگوں کے دلوں تک اسلام اور ایمان نہیں اترا تھا اور پیغمبر اسلا ﷺ م کو اتنی فرصت نہیں مل پائی کہ آپ دینی مبلغین کو بھیج کر ان کی ثقافتی اور مذہبی بنیادوں کو درست کرسکیں اس میں سے بہت سے لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ان کے سردار اور نمائندے ہی پیغمبر ﷺ سے ملاقات کرتے تھے اسی لئے دوبارہ اسلام کی قدرت کے ضعیف ہونے اور کفر و بت پرستی اور ارتداد کی واپسی کا بہت احتمال تھا اس وجہ سے بھی اسلامی رہبری کا جاری رہنا ضروری تھا تاکہ پیغمبر ﷺ کا یہ ثقافتی مشن جاری رہے اور اسلام کی تعلیمات کی وضاحت اور تبیین اور تبلیغی اور ثقافتی نیز روحانی رشد و ہدایت کا سلسلہ منزل تکمیل تک پہونچ جائے۔

۳۔ ۹ھ میں منافقین کے سرکردہ لیڈر عبد اللہ بن ابی کی موت کے بعد اگرچہ اس خائن گروپ کی قدیم شکل و صورت ختم ہوگئی تھی اور وہ استحکام باقی نہیں رہ گیا تھا لیکن پھر بھی اس ٹولہ کے افراد مدینہ اور اس کے اطراف میں موجود تھے یہ لوگ ہر لمحہ ایسی فرصت کی تلاش میں رہتے تھے جس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر کوئی کاری ضرب لگا سکیں۔ منافقین (جو اسلام کے اندرونی دشمن تھے) کے علاوہ دو بیرونی خطرے بھی اسلام کے سامنے تھے ایک شہنشاہ روم دوسرے شہنشائے ایران جیسا کہ اس وقت کے قرائن و شواہد سے ان کی اسلام دشمنی اور اسلام کے بارے میں ان کے منفی نظریات کی تائید ہوتی ہے۔ یہ خطرناک مثلث یقینا پیغمبر ﷺ کو متفکر کرنے کے لئے کافی تھا اور آنحضرت ﷺ کے لئے اس کو ناکارہ بنانے کے واسطے چارہ جوئی کرنا ضروری تھی۔ یہ مسئلہ بھی ایسے حساس لمحات اور حالات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس کے لئے مسلمانوں کی وحدت اور ایک پرچم تلے کسی طاقت ور رہبر اور قائد کی رہبری کی ضرورت ہے۔

٤۔ جیسا کہ گزر چکا ہے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں رہنے والے لوگوں کی زندگی قبیلہ جاتی نظام پر استوار تھی اور قبیلہ جاتی نظام، رشتہ داری اور نسل پرستی کی بنیادوں پر استوار تھا ایسے نظام کے سماجی اسباب، جیسے قبیلہ جاتی تعصب فخر و مباہات ایک دوسرے سے انتقام لینا، قبیلہ جاتی جنگ ، یہ سب ان کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے۔ پیغمبر ﷺ نے بے پناہ زحمت و مشقت برداشت کر کے اسلام کی وحدت بخش تعلیم اور کلمۂ توحید کے سہارے اس نظام کو درہم برہم کردیا اور مشترک ایمان کو مشترک خون اور مشترک نسل کا جائے گزین بنادیا اور قبیلہ جاتی نظام کے جو خطرناک اور برے اثرات تھے ان کو کافی حد تک ختم کردیا یہ سب اسلام، قرآن اور رسالت پیغمبر ﷺ کے بہترین نتائج ہیں۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس نظام جاہلیت کی جڑیں (اس کی پرانی جڑوں کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک باقی تھیں اور جب کبھی کسی حادثہ کی ہوائیں اس دبی ہوئی آگ کے اوپر سے راکھ کو اڑا لیجاتی تھیں تو ان کی قبیلہ پرستی کی فکریں سامنے آجاتی تھیں اور پیغمبر اسلا ﷺ م نہایت زیرکی اور ہوشیاری سے اس کا سدباب کردیتے تھے اور اس کو کسی بحران اور حادثہ میں تبدیل نہیں ہونے دیتے تھے یہ بات اس زمانہ کے حساس حالات کی عکاس ہے کہ مسلمانوں کی وحدت جو بہت قیمتی سرمایہ لگاکر حاصل ہوئی تھی اس کو کس قدر خطرہ تھا انھیں قبیلہ جاتی رسم و رواج اور ذہنیتوں کی بہترین دلیل خود سقیفہ کا واقعہ بھی ہے جو پیغمبر ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد سامنے آیا تھا یہ قلبی دھڑکن اور فکر اس زمانہ کے مسلمانوں کے سرکردہ افراد کے وظیفہ کو اور بھی سنگین کردے رہی تھی۔ اور ان کے سامنے ایک سخت امتحان تھا اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ کون لوگ وحدت اور اتحاد کی حفاظت کے لئے ایثار و قربانی کے لئے حاضر ہیں اور کون لوگ پرانے نظام جاہلیت پر اب بھی مصر ہیں۔

۵۔ پیغمبر اسلا ﷺ م مدینہ ہجرت کرنے کے بعد مسلمانوں کے دینی اور سیاسی قائد و رہبر تھے اور آپ یہ دونوں وظیفے ایک ساتھ انجام دیتے تھے۔ جس طرح مسلمان آپ کی خدمت میں بیٹھ کر آپ کی تقریریں، خطبات اور آپ کے ہونٹوں سے نکلنے والے کلمات وحی کو سنتے رہتے تھے اسی طرح آپ کی امامت میں نماز جماعت پڑھتے تھے اور روحانی اعتبار سے آپ کی ذات اور شخصیت میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ آپ کے وضو کے پانی کے قطروں کو تبرک سمجھتے تھے اور یہی لوگ آپ کے حکم سے میدان جنگ میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے تھے، دشمنوں کو قتل کرتے تھے، اور خود بھی شہید ہو جاتے تھے، آپ کی طرف سے شہروں کی حکمرانی اور گورنری کے لئے منصوب ہوتے تھے، آپ کی نمائندگی اور سفارت کے طور پر مخالفین سے مذاکرات کرتے تھے۔

لہٰذا آپ کی رحلت کے بعد صرف یہ کافی نہیں تھا کہ آپ کا جانشین صرف اسلامی معاشرے کی سیاسی رہبری کرے بلکہ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ آپ کی جگہ پر کوئی ایسا شخص بیٹھے جو سیاسی رہبری کے علاوہ لوگوں کی دینی ضروریات اور ان کے دینی مسائل سے بھی بخوبی عہدہ برآ ہو سکے یعنی دینی اور اسلامی علوم اور معارف کے بارے میں اتنا وسیع علم اور آگہی رکھتا ہو کہ اس جگہ پر بھی وہ پیغمبر ﷺ کی خالی جگہ کو پُر کر سکے۔

فہرست

حرف اول ۳

عرض مترجم ۷

مقدمۂ مولف ۸

پہلا حصہ ۱۱

مقدماتی بحثیں ۱۱

پہلی فصل ۱۲

جزیرۃ العرب کی جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی صورتحال ۱۲

جزیرۃ العرب کی تقسیم ۱۴

جزیرۃ العرب کی تقسیم، اس کے شمالی اور جنوبی (قدرتی) حالات کی بنا پر ۱۵

جنوبی جزیرۃ العرب (یمن) کے حالات ۱۵

جنوبی عرب کی درخشاں تہذیب ۱۷

مأرب کے بند کی تباہی ۱۹

جزیرۃ العرب پر جنوبی تہذیب کے زوال کے اثرات ۲۱

شمالی جزیرۃ العرب{حجاز} کے حالات ۲۲

صحرا نشین ۲۴

قبائلی نظام ۲۶

نسلی رشتہ ۲۷

قبیلہ کی سرداری ۲۷

قبائلی تعصب ۲۹

قبائلی انتقام ۳۰
قبائلی رقابت اور فخر و مباہات ۳۱
نسب کی اہمیت ۳۳
قبائلی جنگیں ۳۷
غارت گری اور آدم کشی ۳۹
حرام مہینے ۴۲
عرب کے سماج میں عورت ۴۲
عورت کی زبوں حالی (ٹریچڈی) ۴۴
دوسری فصل ۵۰
عربوں کے صفات اور نفسیات ۵۰
متضاد صفات ۵۰
عربوں کی اچھی صفتوں کی بنیاد ۵۱
جہالت اور خرافات ۵۲
علم و فن سے عربوں کی آگاہی ۵۴
امی لوگ ۵۵
شعر ۵۵
عرب اور ان کے پڑوسیوں کی تہذیب ۵۶
ایران اور روم کے مقابلہ میںعربوں کی کمزوری اور پستی ۵۹
موہوم افتخار ۶۰
دور جاہلیت ۶۲

تیسری فصل.. ٦٥
جزیرہ نمائے عرب اور اسکے اطراف کے ادیان و مذاہب.. ٦٥
موحدین.. ٦٥
عیسائیت.. ٦٧
یمن میں عیسائیت.. ٦٨
حیرہ میں عیسائیت.. ٦٩
دین یہود.. ٧١
یمن میں یہودی... ٧٢
صابئین... ٧٣
مانی دین.. ٧٥
ستاروں کی عبادت.. ٧٦
جنات اور فرشتوں کی عبادت.. ٧٨
شہر مکہ کی ابتدائ... ٨٠
دین ابراہیم کی باقی ماندہ تعلیمات.. ٨٠
عربوں کے درمیان بت پرستی کا آغاز... ٨٢
کیا بت پرست، خدا کے قائل تھے؟.. ٨٣
پریشان کن مذہبی صورتحال... ٨٨
ظہور اسلام کی روشنی میں بنیادی تبدیلی.. ٩٠
شہر مکہ کی توسیع اور مرکزیت... ٩٢
الف: تجارتی مرکز:... ٩٢

ب: کعبہ کا وجود:...................................... ۹۵
قریش کی تجارت اور کلید برداری...................................... ۹۶
قریش کا اقتدار اور اثر و رسوخ...................................... ۹۹
دوسرا حصہ...................................... ۱۰۲
حضرت محمد ﷺ ولادت سے بعثت تک...................................... ۱۰۲
پہلی فصل...................................... ۱۰۳
اجداد پیغمبر اسلام ﷺ...................................... ۱۰۳
حضرت محمد مصطفی ﷺ کا حسب و نسب...................................... ۱۰۳
حضرت عبد المطلب کی شخصیت...................................... ۱۰۵
خاندان توحید...................................... ۱۰۷
دوسری فصل...................................... ۱۰۹
حضرت محمد ﷺ کا بچپن اور جوانی...................................... ۱۰۹
ولادت...................................... ۱۰۹
کم سنی اور رضاعت کا زمانہ...................................... ۱۱۲
والدہ کا انتقال اور جناب عبد المطلب کی کفالت...................................... ۱۱۵
جناب عبد المطلب کا انتقال اور جناب ابو طالب کی سرپرستی...................................... ۱۱۷
شام کا سفر اور راہب کی پیشین گوئی...................................... ۱۱۸
عیسائیوں کے ذریعہ تاریخ میں تحریف...................................... ۱۲۱
کامل شریعت کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرے؟...................................... ۱۲۲
تیسری فصل...................................... ۱۲۵

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی جوانی ۱۲۵
حلف الفضول ا ۱۲۵
شام کی طرف دوسرا سفر ۱۲۸
جناب خدیجہ کے ساتھ شادی ۱۳۰
حجر اسود کا نصب کرنا ۱۳۲
علی مکتب پیغمبر ﷺ میں ۱۳۳
تیسرا حصہ ۱۳۷
بعثت سے ہجرت تک ۱۳۷
پہلی فصل ۱۳۸
بعثت اور تبلیغ ۱۳۸
رسالت کے استقبال میں ۱۳۸
رسالت کا آغاز ۱۴۱
طلوع وحی کی غلط عکاسی ۱۴۴
تنقید و تحلیل ۱۴۶
مخفی دعوت ۱۵۱
پہلے مسلمان مرد اور عورت ۱۵۲
حضرت علی کی سبقت کی دلیلیں ۱۵۳
اسلام قبول کرنے میں سبقت کرنے والے گروہ ۱۵۷
الف: جوانوں کا طبقہ ۱۵۷
ب: محروموں اور مظلوموں کا طبقہ ۱۶۰

دعوت ذو العشیرہ...... ۱۶۳
دوسری فصل...... ۱۶۶
علی الاعلان تبلیغ اور مخالفتوں کا آغاز...... ۱۶۶
ظاہری تبلیغ کا آغاز...... ۱۶۶
قریش کی کوششیں...... ۱۶۷
ابوطالب کی طرف سے حمایت کا اعلان...... ۱۶۹
قریش کی طرف سے مخالفت کے اسباب...... ۱۶۹
۱۔ سماجی نظام کے بکھرنے کا خوف...... ۱۷۱
اقتصادی خوف...... ۱۷۲
پڑوسی طاقتوں کا خوف و ہراس...... ۱۷۵
قبیلہ جاتی رقابت اور حسد...... ۱۷۶
تیسری فصل...... ۱۷۸
قریش کی مخالفت کے نتائج اور ان کے اقدامات...... ۱۷۸
مسلمانوں پر ظلم و تشدد...... ۱۷۸
حبشہ کی طرف ہجرت...... ۱۷۹
حضرت فاطمہ زہرا * کی ولادت...... ۱۸۳
اسراء اور معراج...... ۱۸۳
روایات معراج کی تحلیل اور ان کا تجزیہ...... ۱۸۴
بنی ہاشم کا سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ...... ۱۸۶
جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ کی وفات...... ۱۹۰

جناب خدیجہ کا کارنامہ.......... ۱۹۱

جناب ابوطالب کا کارنامہ !.......... ۱۹۲

ایمان ابوطالب.......... ۱۹۳

ازواج پیغمبر اسلا ﷺ م.......... ۱۹۷

۱ام حبیبہ:.......... ۱۹۸

۲۔ ام سلمہ:.......... ۱۹۹

۳۔ زینب بنت جحش:.......... ۲۰۱

قرآن کی جاذبیت.......... ۲۰۳

جادوگری کا الزام.......... ۲۰۵

طائف کا تبلیغی سفر.......... ۲۰۷

کیا پیغمبر ﷺ نے کسی سے پناہ مانگی؟.......... ۲۰۹

عرب قبائل کو اسلام کی دعوت.......... ۲۱۱

چوتھا حصہ.......... ۲۱۳

ہجرت سے عالمی تبلیغ تک.......... ۲۱۳

پہلی فصل.......... ۲۱۵

مدینہ کی طرف ہجرت.......... ۲۱۵

مدینہ میں اسلام کے نفوذ کا ماحول.......... ۲۱۵

مدینہ کے مسلمانوں کا پہلا گروہ.......... ۲۱۷

عقبہ کا پہلا معاہدہ.......... ۲۱۸

عقبہ کا دوسرا معاہدہ.......... ۲۲۰

مدینہ کی طرف ہجرت کا آغاز ۲۲۰
پیغمبر ﷺ کے قتل کی سازش ۲۲۱
پیغمبر اسلا ﷺ م کی ہجرت ۲۲۳
عظیم قربانی ۲۲۴
قبا میں پیغمبر ﷺ کا داخلہ ۲۲۶
پیغمبر ﷺ کا مدینہ میں داخلہ ۲۲۷
ہجری تاریخ کا آغاز ۲۲۸
دوسری فصل ۲۳۱
مدینہ میں پیغمبر اسلا ﷺ م کے سیاسی اقدامات ۲۳۱
مسجد کی تعمیر ۲۳۱
اصحاب صُفّہ ۲۳۲
عام معاہدہ ۲۳۳
مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارگی کا معاہدہ ۲۳۵
یہودیوں کے تین قبیلوں کے ساتھ امن معاہدہ ۲۳۹
منافقین ۲۴۰
تیسری فصل ۲۴۲
یہودیوں کی سازشیں ۲۴۲
یہودیوں کی طرف سے معاہدے کی خلاف ورزیاں ۲۴۲
یہودیوں کی مخالفت کے اسباب ۲۴۴
قبلہ کی تبدیلی ۲۴۷

چوتھی فصل.. ۲۵۱
لشکر اسلام کی تشکیل.. ۲۵۱
اسلامی فوج کا قیام.. ۲۵۱
فوجی مشقیں.. ۲۵۳
فوجی مشقوں سے پیغمبر ﷺ کے مقاصد.. ۲۵۴
عبد اللہ بن جحش کا سریہ.. ۲۵۷
جنگ بدر.. ۲۵۸
مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب.. ۲۶۱
اسلامی لشکر کی کامیابی کے نتائج اور آثار.. ۲۶۵
بنی قینقاع کی عہد شکنی.. ۲۶۷
جناب فاطمہ زہرا سے حضرت علی کی شادی.. ۲۶۹
جنگ احد.. ۲۷۰
جنگ کے پہلے مرحلے میں مسلمانوں کی فتح.. ۲۷۳
مشرکوں کی فتح.. ۲۷۵
جنگ احد کے نتائج.. ۲۷۹
بنی نضیر کے ساتھ جنگ(۲).. ۲۸۳
جنگ خندق (احزاب).. ۲۸۵
بنی قریظہ کی خیانت.. ۲۹۰
لشکر احزاب کی شکست کے اسباب.. ۲۹۱
۱۔ بنی قریظہ اور لشکر احزاب کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا.. ۲۹۲

عمرو بن عبدود کا قتل.. ۲۹۲

غیبی امداد... ۲۹۵

جنگ بنی قریظہ.. ۲۹۶

تجزیہ و تحلیل.. ۲۹۸

جنگ بنی مصطلق.. ۳۰۲

عمرہ کا سفر... ۳۰۳

بیعت رضوان... ۳۰۵

پیمان صلح حدیبیہ (فتح آشکار)... ۳۰۵

پیغمبر ﷺ کی پیشین گوئی ۳۰۷

صلح حدیبیہ کے آثار و نتائج... ۳۰۷

پانچواں حصہ.. ۳۱۰

عالمی دعوت سے رحلت پیغمبر اسلام ﷺ تک... ۳۱۰

پہلی فصل.. ۳۱۱

عالمی تبلیغ.. ۳۱۱

پیغمبر اکرم ﷺ کی عالمی رسالت.. ۳۱۱

عالمی تبلیغ کا آغاز... ۳۱۳

جنگ خیبر... ۳۱۴

یہودیوں کا انجام.. ۳۲۰

فدک.. ۳۲۱

دوسری فصل.. ۳۲۲

اسلام کا پھیلاؤ ۳۲۲

جنگ موتہ ۳۲۲

فتح مکہ ۳۲۵

قریش کی عہد شکنی ۳۲۵

پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے عام معافی کا اعلان ۳۲۹

فتح مکہ کے آثار اور نتائج ۳۳۱

جنگ حنین* ۳۳۳

آغاز جنگ میں مسلمانوں کی شکست اور عقب نشینی ۳۳۵

مسلمانوں کی عالیشان فتح ۳۳۵

جنگ تبوک* ۳۳۷

مدینہ میں حضرت علی کی جانشینی ۳۴۰

راستے کی دشواریاں ۳۴۴

اس علاقہ کے سرداروں سے پیغمبر ﷺ کے معاہدے ۳۴۵

غزوۂ تبوک کے آثار اور نتائج ۳۴۶

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا نفوذ اوراس کا پھیلاؤ ۳۴۶

مشرکین سے برائت کا اعلان ۳۴۷

پیغمبر اکرم ﷺ کا مخصوص نمائندہ اور سفیر ۳۴۹

اعلان برائت کا متن اور پیغمبر اکرم ﷺ کا اَلٹی میٹم ۳۴۹

نجران کے عیسائی نمائندوں کی انجمن سے پیغمبر ﷺ کا مباہلہ* ۳۵۱

تیسری فصل ۳۵۶

حجۃ الوداع اور رحلت پیغمبر ﷺ ۳۵۶
حجۃ الوداع ۳۵۶
پیغمبر اسلا ﷺ م کا تاریخی خطبہ ۳۵۸
عظیم فضیلت ۳۵۹
واقعۂ غدیر اور مستقبل کے رہنما کا تعارف ۳۶۲
شواہد اور قرائن ۳۷۲
لشکر اسامہ ۳۷۹
پیغمبر ﷺ کا اعلیٰ مقصد ۳۸۲
وہ وصیت نامہ جو لکھا نہ جاسکا! ۳۸۵
پیغمبر اسلا ﷺ م کی رحلت ۳۸۶
رحلت پیغمبر ﷺ کے وقت اسلامی سماج، ایک نظر میں ۳۸۸